دھنی ادب و ثقافت



انور بیگ اعوان

تحفہ از
جناب ڈاکٹر طاہر تونسوی

دھنی ادب و ثقافت

از

انور بیگ اعوان

قیمت :- قسم اول :- ساڑھے پانچ روپے
قسم دوم :- چار روپے

مطبوعہ

بزمِ ثقافت چکوال (ضلع جہلم) باہتمام
محمد اسلم حضروی پبلشر

دھنی ادب و ثقافت

از

انور بیگ اعوان

شائع کردہ بزم ثقافت چکوال (ضلع جہلم)

پہلی بار ــــــــــــ ۱۹۶۸
تعداد ــــــــــــ ایک ہزار
قیمت ــــــــــــ
طبع :- تعمیر پرنٹنگ پریس سید پور روڈ راولپنڈی

مطبوعہ
بزم ثقافت چکوال باہتمام
محمد اسلم حضروی، پبلشر

دھنی ادب و ثقافت

علاقہ دھنی کی ادبی و ثقافتی تاریخ

از

انور بیگ اعوان

بزم ثقافت چکوال (ضلع جہلم)

انتساب

دھنی کے بیٹوں اور بیٹیوں کے نام

انور بیگ اعوان

فہرست مضامین

باب ۵

دھنی کی لوک کہانیاں

باب ۶

دھنی کے لوک گیت

باب ۷

دھنی کے لوک ناچ

باب ۸

دھنی کے موسیقار

تشکر

بزمِ ثقافت چکوال

جناب شیخ محمد عثمان سی ایس پی، ڈپٹی کمشنر جہلم

کی ممنون ہے۔ جنہوں نے بزم کو ڈسٹرکٹ

کونسل جہلم کے فنڈ سے مناسب مالی امداد

دے کر اس کتاب کی طباعت

کیلئے اہم وسیلہ بہم پہنچایا ہے

پیشکش

بزم ثقافت چکوال کی دوسری پیشکش آپ کے سامنے ہے۔ پہلی کتاب عہد عالمگیری کے صوفی شاعر حضرت شاہ مراد خانپوریؒ کے فارسی، ریختہ، اُردو اور پنجابی کلام پر مشتمل تھی۔ جسے پروفیسر انور بیگ اعوان نے سینوں اور سفینوں سے اکٹھا کر کے تحقیق کی عرق ریزی اور تنقید کی دیدہ وری سے جدید دور کے علمی تقاضوں کے مطابق "کلام شاہ مراد خانپوری" کے نام سے مرتب کر کے ایک عظیم علمی کارنامہ سرانجام دیا۔ اس مجموعہ کلام کی اشاعت نے اُردو ادب میں ایک تازہ باب کا اضافہ اور ادبیات اُردو کے محققین اور نقادوں کے لئے تازہ موضوع مہیا کر دیا۔ یہی وہ معرکتہ الآرا کتاب ہے جس نے حافظ محمود شیرانی مرحوم کی تحقیق کہ "اُردو پنجاب میں پیدا ہوئی پھلی پھولی اور پروان چڑھی" کو ایک نتیجہ خیز مرحلے میں داخل کر دیا۔ اسی نے مشہور ادبی مورخ رام بابو سکسینہ کے اس نظریہ کو کہ ولی دکنی کا کلام شمالی ہند کے تمام نظم نگاروں کے لئے نمونہ بن گیا، غلط ٹھہرا دیا۔ اس طرح تحقیقی کاوشں نے گویا فکر و نظر کی نئی سمتیں متعین کر دی ہیں۔

بزم ثقافت نے قومی ہم آہنگی اور علاقائی یکجہتی میں مزید استحکام پیدا کرنے کے لئے جو بیڑہ اٹھایا تھا۔ اس کی طرف ہمارا یہ پہلا قدم تھا۔ متعدد دانشوروں نے ہماری اس پہلی پیش کش کو سراہا ہے جس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔

ہماری زیر نظر پیشکش کا دائرہ بہت وسیع ہے کیونکہ اس میں علاقہ دھنی کے ادبی، لسانی تاریخی اور تہذیبی ورثے کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر اسے پہلی دفعہ دیدار عام کے لئے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علم و ادب کے جو شہ پارے اب تک کسمپرسی اور منتشر حالت میں تھے انہیں یکجا کر دیا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ ہماری یہ کاوش بھی پہلے کی طرح آپ کی پذیرائی کا شرف حاصل کرے گی۔

اگر ہماری یہ کوشش علمی و ادبی مرکزوں سے دور، نشر و اشاعت کے جدید وسائل سے عاری

لیکن ہمت، حوصلہ، جرأت وولولہ سے بھرپور دُور افتادہ اور پسماندہ علاقے کے باشندوں کی ظاہری و باطنی صلاحیتوں، جذبات و کردار اور منفرد تہذیب و ثقافت کو بہتر طور پر سمجھانے میں ممد ثابت ہو تو ہم سمجھیں گے کہ ہمیں ہماری محنت کا صلہ مل گیا۔ ؎

سرمۂ مفت نذر ہوں میری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احسان میرا

سید افتخار حسین ایم اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ
صدر بزمِ ثقافت

چکوال ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء

کچھ تو کہیئے کہ........

اس کتاب کی شان نزول یہ ہے کہ اولاً برادر مکرم پروفیسر کرم حیدری صاحب نے ایک کتاب لکھی جس کا نام سرزمین پوٹھوہار ہے۔ مجھے یہ کتاب پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ پروفیسر موصوف نے اس مختصر سی کتاب میں علاقہ پوٹھوہار کے ماضی اور حال پر سیر حاصل بحث کی ہے لیکن پوٹھوہار کی وسعت اور اس کے حدودِ اربعہ کے متعلق انہوں نے جو بے سروپا دعوے کئے ہیں وہ تاریخی و جغرافیائی حقائق سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ضرورت محسوس ہوئی کہ تاریخ کو مسخ ہونے سے بچانے کے لئے بروقت اقدام کیا جائے۔ چنانچہ ریکارڈ کو درست رکھنے کی خاطر میں نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "پوٹھوہار کے حدود اربعہ۔ تسمیہ پر تحقیقی نظر" یہ مضمون لاہور کے ایک موقر ہفت روزہ لیل و نہار کی ۹ جون ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا اس مضمون میں عظیم تر پوٹھوہار کے بزعم خود لیکن پرجوش علمبرداروں کے دعاوی کی قلعی اتنی خوبی سے کھولی گئی کہ آج تک ان کی طرف سے اس کا جواب نہیں بن آیا۔

دوم اس مضمون کی تحریر کے دوران جب مختلف قسم کے ادبی و علمی، تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی و ثقافتی مواد کے انبار کی چھان پھٹک کا موقعہ ملا تو محسوس ہوا کہ ایک اور مقالہ بھی لکھا جا سکتا ہے اگرچہ بظاہر اس دوسرے مقالہ کا پہلے مقالہ سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا لیکن میرے تحت الشعور میں جو رو چل رہی تھی اس کے مثبت اور منفی قطب یہ دونوں مقالے ہی تھے چونکہ جناب کرم حیدری صاحب نے اپنے وطن مالوف (مجسمہ دھمانی) میں "پوٹھوہار" کے ہیرے کو [illegible] کی کوشش میں تاریخی و جغرافیائی حقائق کو حسب قول کے مطابق توڑ مروڑ کر پیش کیا تھا اور جواب آں غزل کے طور پر میرا مقالہ بھی اپنے وطن مالوف "دھنی" کے خارج اور ان کی انفرادیت اجاگر کرنے کی خاطر ہی تھا لہٰذا اس دوسرے مقالہ کا باطنی مقصد اگرچہ وطن سے محبت کا [illegible]

شاعری کے مسئلہ حُبِ وطن کی روایت "۔ یہ مقالہ بھی ہفت روزہ لیل و نہار لاہور مؤرخہ ۸ ستمبر ۱۹۶۳ء میں اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ موضوع کسی قدر اچھوتا تھا چنانچہ پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ان دونوں مقالوں کو اپنی سالانہ رپورٹ بابت سال ۶۳-۱۹۶۲ء میں تاریخی و ادبی نوعیت کی تحقیق کا حامل تسلیم کر کے میری حوصلہ افزائی کی۔ اس قدردانی سے ہمت بڑھ گئی اور رہوار طبیعت نے اس راہ پر مزید آگے بڑھنے کے لئے جولانیاں دکھانی شروع کر دیں۔ جتنا مطالعہ کا شوق اور تحقیق کا ذوق بڑھتا گیا اتنا ہی علاقائی ادب و تاریخ کے نئے نئے گوشے بے نقاب ہونے شروع ہو گئے۔

سوم انہی ایام میں چند ادب دوست اور علم نواز احباب کی تحریک و تشویق پر ایک ایسی ادبی مجلس کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے طریقِ کار کا اصول کار یہ طے پایا کہ اس ادبی محفل کی ہر پندرہ روزہ نشست میں جو چیز بھی پیش کی جائے وہ اپنے اندر تازگی کا پہلو ضرور لئے ہوئے ہونی چاہیئے۔ چنانچہ میں نے بھی اس بزم کی مختلف نشستوں میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا اور درج ذیل موضوعات پر مقالے لکھ کر پیش کئے

۱ ۔ فارسی کے منظوم رومان۔

۲ ۔ اقبال کی اجتہادی فروگذاشتیں ؟

۳ ۔ دھنی کا لسانی و ثقافتی جائزہ۔

۴ ۔ دھنی کا منفرد سیلانی شاعر ۔۔ پیلو۔

۵ ۔ اقبال اور اسلامی سوشلزم۔

۶ ۔ دھنی کا بدیہہ گو شاعر ۔۔ قاضی عبدالحلیم ڈھاب والے

۷ ۔ دھنی کی ادبی خدمات۔

۸ ۔ دھنی کا عاشق رسولؐ ۔۔۔ غازی مرید حسین بھلوی۔

۹ ۔ اُردو ادب کے ارتقاء میں دھنی کا حصہ۔

اس آخری مقالہ میں ناقابلِ تردید تاریخی و ادبی شواہد کی بنا پر یہ انکشاف کیا تھا کہ اُردو غزل کے بانی ولی دکنی نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ علاقہ چکوال کے مشہور و معروف صوفی اور شاعر بادشاہ مراد خانپوریؒ ہیں اس انکشاف نے اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا اور اس تحقیق کو ایک نئی سمت عطا کی جس کا اعتراف آہستہ آہستہ محسوس ہونا شروع ہو چکا ہے۔

چہارم - ماہِ اگست ۱۹۶۳ء کی بات ہے کہ گورنمنٹ کالج راولپنڈی کے چند استادوں کے ہمراہ ایک فرانسیسی صحافی موسیو جی بیکے (G. BUSQUET) وارد چکوال ہوا وہ علاقہ دھنی کے متعلق کچھ معلومات جمع کرنے کا خواہشمند تھا۔ مقامی دوستوں نے اس کے ساتھ بات چیت کے لئے ایک غیر رسمی سی تقریب کا اہتمام کر ڈالا۔ پروفیسر خواجہ محمد عثمان کے مکان پر اس بے تکلفانہ نشست میں "علاقہ دھنی کے مورخ" کی حیثیت سے مجھے بھی مدعو کر لیا گیا۔ اس نشست میں اندازِ گفتگو سوال جواب کا تھا۔ فرانسیسی صحافی سوال کرتا اور میں اس کا اپنے علم کے مطابق مناسب سا جواب دیتا۔ یہ نشست خاصی طویل ہو گئی چنانچہ علاقہ دھنی کی تاریخ و ثقافت، سیاست و صحافت کا کوئی ایسا پہلو نہ بچا جو زیر بحث نہ آیا۔ موسیو بیکے ضروری یادداشتیں لکھتا گیا اور ان کی مدد سے بعد ازاں اس نے ایک مضمون مرتب کر لیا جو روزنامہ پاکستان ٹائمز لاہور مورخہ ۱۱ اگست ۱۹۶۳ء میں بعنوان DHANN — A LAND OF SOLDIERS AND GODS اشاعت پذیر ہوا۔ اس غیر ملکی شخص کی دو باتوں نے مجھے بڑا متاثر کیا ایک تو علاقائی تاریخ و ثقافت میں اس کی دلچسپی نے اور دوسرے اس کی صحافتی دیانت نے۔ اپنے اس مضمون میں اس نے جو کچھ لکھا میری سند اور میرے حوالے سے لکھا حالانکہ اگر اپنا رعب گانٹھنے کے لئے وہ میرے علی الاعلان حوالے کے بغیر مضمون شائع کرا دیتا تو میں اس کا کیا بگاڑ لیتا۔ میرے اپنے ہموطن میری کاوشوں کو نام لئے بغیر یا حوالہ دیئے بغیر اگر اپنے نام سے منسوب کر کے دنیا کو دھوکا دے رہے ہیں تو میں نے ان کا کیا بگاڑ لیا ہے۔

بات کرنے کی تو نہیں لیکن بقول بابا بلھے شاہ قصوریؒ ع

منہ آئی گل نہ رہندی اے

لہٰذا اگر اصلاح احوال کی غرض سے اور سرِ بحث کے طور پہ بات کہہ دی جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ بات یہ ہے کہ موسیو بیکے کو میں نے بتایا تھا اور موصوف نے محولہ بالا مضمون میں اس کا ذکر بھی کیا کہ علاقہ دھنی کے ایک تاریخی مقام کلر کہار میں جو سرکاری باغ ہے وہ بابر بادشاہ کا لگایا ہوا ہے تزکِ بابری میں اس کا نام "باغِ صفا" اور برصغیر پاکستان و ہند میں یہ پہلا مغلیہ باغ ہے۔ لاہور کے علمی حلقوں میں اس انکشاف کا بڑا چرچا ہوا۔ بعض دانشوروں نے اس انکشاف پہ ناک بھوں چڑھایا کیونکہ ان کا مبلغ علم ایک مغربی مصنفہ سی ایم ویلئرز کی کتاب "GARDENS OF THE GREAT

MUGHALS (عظیم مغلوں کے باغات) تک محدود تھا۔ کسی نے تزک بابری کا براہ راست مطالعہ کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کر رکھی تھی۔ شدہ شدہ یہ بات ڈاکٹر محمد باقر صاحب پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے حلقہ خاص تک بھی جا پہنچی۔ انہی ایام میں میں نے ایک اور شوشہ بھی چھوڑ رکھا تھا اور وہ میلہ چراغاں لاہور کے ہیرو اور پنجابی ادب کے عظیم فنکار شاہ حسینؒ (مادھو لال حسین) کی زبان اور ان کے اصلی وطن کے بارے میں ایک جدید تحقیق کے متعلق تھا۔ مجلس شاہ حسین لاہور کی دعوت پر گورنمنٹ کالج لاہور کے بخاری آڈیٹوریم میں میں نے اعلان کیا کہ شاہ حسین کی کافیوں کی زبان اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ آپ ضلع جہلم کی تحصیل پنڈدادنخان کے کسی گاؤں غالباً موضع ڈھڈی کے رہنے والے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے ہم وطن استاد کے پاس آئے۔ اور مادھو کی محبت میں ایسے اسیر ہوئے کہ پھر لاہوری کے ہو کر رہ گئے۔ دبی جفادریوں کے لئے یہ انکشاف ایک حادثہ سے کم نہ تھا۔ ان میں اتنی جرأت تو نہ تھی کہ وہ میرے دلائل کا توڑ پیش کر کے میرے موقف کو جھٹلاتے البتہ انہوں نے اپنی خصوصی مجلسوں میں میرا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔

کوئی ایسی ہی مجلس تھی جس میں ڈاکٹر باقر صاحب بھی موجود تھے بقول پروفیسر خواجہ محمد عثمان کسی صاحب نے "باغِ صفا" کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ یہ کہنا کہ "باغِ صفا" پہلا مغل باغ ہے، محض ایک شوشہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے میرے موقف کو سراہا اور معترض کو مشورہ دیا کہ وہ علمی انداز میں اس دعوے کی تردید کرے۔

یاد رہے کہ "باغ صفا" کے متعلق یہ دعویٰ کہ برصغیر ہند و پاکستان میں یہ پہلا مغل باغ ہے — میں نے خود بھی اپنے ایک مضمون میں کیا جو کہ مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۶۳ء کے روزنامہ امروز لاہور میں زیر عنوان "سہا بیا کا مسکن — دمعنی" شائع ہو چکا ہے اور تو کسی کو خدا نے توفیق نہ دی کہ وہ میرے موقف کے خلاف کچھ لکھتا البتہ جناب ایم۔ ولی اللہ خان سابق ناظم محکمہ آثار قدیمہ پاکستان و نگران عجائب گھر لاہور نے پاکستان ٹائمز لاہور کی ۳۰ مارچ ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں ایک مضمون ضرور لکھا جس کا عنوان THE FIRST MUGHAL GARDEN ہے اس مضمون میں خان موصوف نے ثابت کیا کہ واقعی کلر کہار کے مقام پر واقع باغ برصغیر میں سب سے پہلا مغل باغ ہے۔ سی ایم وی سٹوارٹ نے آگرہ کے "آرام باغ" کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ وہ پہلا مغل باغ ہے غلط ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ خان موصوف نے میرا ذکر کئے بغیر سارا کریڈٹ خود لے لیا ہے۔

حالانکہ نقیر تقریباً تین سال پہلے میں یہ انکشاف کر چکا تھا۔

اب ذرا آگے ہاتھوں جناب ڈاکٹر محمد باقر صاحب ناظم پنجابی ادبی اکاڈمی و پرنسپل اورینٹل کالج لاہور کے بارے میں سنتے جائیے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف غائبانہ طور پر میری کاوشوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھنے کے روادار ہیں۔ میرے دل میں ان سے شرف ملاقات حاصل کرنے کی خواہش چٹکیاں لینے لگی۔ کسی نجی کام کے سلسلے میں میرا لاہور جانا ہوا تو ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا موقعہ بھی مل گیا۔ رسمی تعارف کے بعد بڑی خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ آخر پنجابی ادب کے متعلق بات چل پڑی۔ دوران گفتگو پیلو اور مرزا صاحباں کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ پیلو تو میرا ہم وطنی شاعر تھا کیونکہ وہ علاقہ دھنی کے مشہور گاؤں مہرو پیلو کا رہنے والا تھا۔ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب بڑے خوش ہوئے اور پیلو کی تصنیف مرزا صاحباں مطبوعہ پنجابی ادبی اکاڈمی کا ایک نسخہ میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے فرمایا کہ آج تک پیلو کے حالاتِ زندگی دستیاب نہیں ہو سکے اگر آپ بہم پہنچا سکیں تو یہ بڑی ادبی خدمت ہوگی نہ صرف یہ کہ ہم آئندہ ایڈیشن میں اسے آپ کے نام سے شامل کتاب کر لیں گے بلکہ آپ کو معاوضہ بھی دیں گے۔

چنانچہ وہاں سے واپس آ کر اپنے ایک عزیز شاگرد محمد نذیر ساکنہ ... جو اب بی اے ایل ایل بی ہے کو ہمراہ لیا اور موضع مہرو پیلو جا کر مقامی لوگوں سے پوچھ گچھ کر کے نہ صرف حالاتِ زندگی ہی جمع کر لیے بلکہ پیلو کی قبر کا بھی کھوج نکال لیا۔ اس سب مواد کو ایک مبسوط مقالے کی شکل میں ترتیب دے کر معہ پیلو کی قبر کی ایک عدد فوٹو کے ڈاکٹر باقر صاحب کو ارسال کر دیا۔ لیکن صدائے برنخاست بالآخر پانچ چھ ماہ کے انتظار کے بعد میں نے وہی مضمون ایڈیٹر ماہنامہ پنج دریا لاہور کی خدمت میں بغرض اشاعت بھیج دیا جو کہ پرچے کے سالنامہ بابت جنوری ۱۹۶۵ء میں شائع ہو گیا اس سے پہلے تین قسطوں میں "دھنی کا منفرد سیلانی شاعر۔ پیلو" کے زیر عنوان یہی مضمون روزنامہ تعمیر راولپنڈی میں ۷؍ مئی ۱۹۶۴ء لغایت ۱۹؍ مئی ۱۹۶۴ء بزبان اردو بھی شائع ہو چکا ہے

کچھ عرصہ بعد پنجابی ادبی اکاڈمی لاہور نے حافظ برخوردار کی تصنیف مرزا صاحباں باہتمام ڈاکٹر فقیر محمد فقیر شائع کی۔ فقیر صاحب نے اس کتاب کی "جان پہچان" کے زیر عنوان صفحہ ۵ سطر نمبر ۱۱-۱۲ پر لکھا کہ "پیلو دھنی دا رہن والا سی" یعنی پیلو دھنی کا رہنے والا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب انہی فقیر محمد فقیر صاحب نے ۱۹۶۲ء میں پیلو کی جان پہچان لکھی تھی۔ اس وقت تو ان کو ان تین سوالوں کا جواب معلوم نہ تھا کہ (۱) پیلو کون

سی (۲) ۱۱۸۸ کہ ہوا ؟ اور (۳) کتنے ہوا ؟ لیکن ۱۹۶۵ء میں ایک دوسرے پنجابی شاعر حافظ برخوردار کی مرزا صاحباں طبع کرتے وقت انہیں ان سوالات کا جواب کہاں سے مل گیا ؟ ان کی اپنی تحقیق تو یہ ہے نہیں ۔ یا تو انہیں ڈاکٹر باقر صاحب نے بتایا ہوگا اور یا انہوں نے میرا مضمون پنج دریا کے سالنامے بابت جنوری ۱۹۶۵ء میں پڑھا ہوگا ۔ دونوں صورتوں میں کریڈٹ مجھے ہی جانا چاہیئے تھا لیکن بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فقیر صاحب نے میرا حوالہ تک نہیں دیا یہ ہے حال ہمارے دانشوروں کی علمی دیانت کا ۔

پیلو کے بارے میں میرے مضمون کے متعلق ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ ایم ۔ اے ڈی ۔ لٹ کلکتہ کی رائے بحوالہ ماہنامہ پنجدریا لاہور بابت اپریل ۱۹۶۵ء یہ ہے ۔

"پیلو تے وی بڑا پڑ چول والا مضمون اے"

یعنی پیلو پر بھی بڑا تحقیقی قسم کا مضمون ہے اور "جنگ کھیڈ نہیں ہوندی زنانیاں دی" جیسے شہرہ آفاق رزمیہ گیت کے خالق ڈاکٹر انور رشید انور نے اپنی منظوم رائے کا اظہار اسی مضمون سے متعلق یوں کر رکھا ہے ۔

پیلو بارے بیگ ایہہ دسے پیار دا دیوا جگدا اے

یہ خود ستائی کی بات نہیں بلکہ اپنے وطن کے دانشوروں کی علمی دیانت کی غیر ممالک کے دانشوروں کی علمی دیانت سے تقابل کی بات ہے ۔ شاید اسی قسم کے حالات ناطق مکرانی کو بھی پیش آئے ہوں گے جبھی تو اس نے جل بھن کر کہا تھا کہ ؎

گر ظلم در دلِ یاراں منافق چہ عجب

گل بدم از اثر صحبتشاں خار شدم

الغرض مدت سے اراکین بزم ثقافت چکوال کا تقاضا تھا کہ علاقہ دھنی کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں اور خدمات کے بارے میں گزشتہ سالوں کے دوران جو مواد مطبوعہ و غیر مطبوعہ صورت میں فراہم ہو چکا ہے سے ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کیا جائے چنانچہ تعمیل ارشاد کے طور پر "آفتابِ قلم" کے نام سے یہ مجموعہ پیش خدمت ہے ۔ امید ہے کہ اربابِ فکر و دانش کے مذاق پر پورا اترے گا ۔

اس کتاب کی ترتیب کے متعلق بھی چند باتیں عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا سب سے پہلی بات جس کی طرف میں قارئین کرام کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اس کتاب کی تحریر کا مقصد محدود علاقائی تعصبات کو ہوا دینا ہرگز نہیں بلکہ اس کی واحد غرض وطن عزیز پاکستان کے مختلف خطوں اور علاقوں میں ذہنی

یک جہتی اور قومی ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے مختلف علاقوں کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں ربط پیدا کرنا علمی بنیادوں پر صحیح حقائق کو پیش کرنا اور علاقائی ادب کے عظیم ورثوں کی نشاندہی اور ان کا تحفظ کرنا نیز اس تہذیبی ورثے کو منظرِ عام پر لا کر پاکستان کے اصحابِ فکر و نظر کا مشترکہ سرمایہ بنا دینا ہے چنانچہ اسی اعلیٰ و ارفع مقصد کے پیشِ نظر یہ قدم اٹھایا گیا ہے۔

بابِ اول میں علاقہ دھنی کے حدود اربعہ، اس کی وجہ تسمیہ اور دیگر یہ کہ موجودہ زمانے تک عہد بعہد سیاسی تاریخ کا کھوج لگایا گیا ہے۔ یہ چیز اس کتاب کے نفسِ مضمون کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے پس منظر کا کام دے رہی ہے۔

بابِ دوم میں ان اقوام کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے اس علاقہ کی تاریخ کے بنانے بگاڑنے میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ واقعات کے اندراج میں پوری تاریخی غیر جانبداری سے کام لیا گیا ہے حتی الوسع کوشش یہ کی گئی ہے کہ کوئی بات بلا ثبوت درج نہ کی جائے۔ اعوانوں کی تاریخ کے بعض گمنام پہلوؤں پر خصوصی طور سے تحقیق و تنقید کی بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ امید ہے کہ دوابہ سندھ ساگر میں اشاعت اسلام کی تحریک میں اعوانوں کے مورثِ اعلیٰ حضرت عون قطب شاہ قادریؒ اور ان کے فرزندانِ گرامی عبداللہ گولڑا اور محمد کندلان وغیرہ کی مساعی جمیلہ کو اب بہتر طور سے سمجھنا شروع کر دیا جائے گا نیز سلطان المجاہدین ٹیپو سلطان کے آباؤ اجداد کے حسب و نسب کے متعلق غیر مسلم مورخین نے جو اپنی مخصوص مصلحتوں کے تحت غلط فہمیوں کے دھوئیں کے بادل چھوڑ رکھے تھے وہ کافی حد تک اب چھٹ جائیں گے اس باب میں گکھڑوں کے مشہور و معروف اور تاریخ ساز و عہد آفرین قبیلہ کی تاریخ کا اندراج جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے کیونکہ ان کے متعلق کیگوہرنامہ فارسی اور تاریخ گکھڑاں اردو جیسی کتابیں اب ہر ایک کی عام دسترس میں ہیں۔ شائقین حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ان کی طرف رجوع کریں۔

بابِ سوم میں لسانی و ثقافتی جائزہ کے تحت تمام وادئ سندھ کی تہذیبی کروٹوں کے دوران ہر کروٹ کی خاص خاص باتوں کی طرف دھیان دیتے ہوئے علاقہ دھنی کی بولی کا دراوڑی زبان سے لہندی زبان تک ارتقاء پر جو بحث پیش کی گئی ہے امید ہے کہ بڑی معلومات افزا ثابت ہوگی اور اسی وسیع تناظر میں علاقہ زیرِ بحث کی بولی نے پنجابی زبان کے ادب کی ثروت مندی اور توانائی میں جو قابلِ قدر اضافہ کر رکھا ہے اس کو بہتر طور پر سمجھنے میں خاصی مدد ملے گی۔

باب چہارم میں علاقہ دھنی کی ان ادبی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو اس علاقے کے شاعروں اور ادیبوں نے فارسی، اُردو اور پنجابی علم و ادب کے میدان میں انجام دی ہیں اسی باب میں اردو زبان کی پیدائش، اس کی شاعری کی داغ بیل ڈالنے خصوصاً اُردو غزل کی ایجاد کے متعلق بڑا جرأت مندانہ انکشاف یہ کیا گیا ہے کہ اُردو زبان گوجری زبان کے پیٹ سے نکلی اور دکن کے مرکزوں سے الگ اور آزادانہ طور پر اُردو غزل علاقہ چکوال کے عظیم شاعر بادشاہ مراد کے ہاتھوں ریختہ سے ترقی کر کے باقاعدہ جدید اُردو کے روپ میں جلوہ گر ہوئی۔ اور یہ کہنا کہ اُردو غزل کا بانی اور موسس ولی دکنی ہے غلط اور خلافِ حقیقت ہے یہ امتیاز اگر کسی کو حاصل ہو سکتا ہے تو جدید تحقیق کے مطابق، بادشاہ مراد خانپوری کو حاصل ہے ثبوت کے لئے کلام شاہ مراد خانپوری مطبوعہ بزم ثقافت چکوال حاضر ہے۔ اسی طرح پنجابی ہندکو، گوجری اور پشتو زبان کے باہمی اثر و تاثر پر بھی بالوضاحت بات کر کے اس غلطی کا بھی ازالہ کر دیا گیا ہے کہ پنجابی غزل کی ابتدا لاہور کے گاموں خاں نے بلکہ شاہ مراد خانپوری نے ہی کی ہے نیز شاہ حسین لاہوری کی زبان کی داخلی شہادت کی بناء پر ان کے وطن مالوف کے بارے میں سنسنی خیز انکشاف کرتے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ان کا اصل وطن ضلع جہلم کی تحصیل پنڈ دادن خان کا غالباً موضع ڈھڈی یا بگہ نامی گاؤں تھا۔

حافظ برخوردار کے استاد پنجابی کے مشہور رومان مرزا صاحباں کو سب سے پہلے نظم کا جامہ پہنانے والے ملک پیلو کا حسب و نسب، جائے پیدائش و مقامِ وفات اور عہدِ حیات کا تعین کر کے پنجابی زبان و ادب کی تاریخ میں ایک نافیصل شدہ مسئلہ کا جامع و مانع حل پیش کر دیا گیا ہے امید ہے کہ شائقین علم و ادب اس تحقیق انیق کو پسند فرمائیں گے۔

باب پنجم میں دھنی کی دو لوک کہانیاں پہلی دفعہ پیش کی جا رہی ہیں۔ اس باب میں نہ صرف شمس ٹانی اور ڈھول بادشاہ کے رومانی کرداروں ہی کو پیش کیا گیا ہے بلکہ پنجابی زبان کے لوک گیتوں میں ڈھولا کی صنف کی ابتداء کے متعلق بھی ایک دعویٰ یہ کہہ کر پیش کیا گیا ہے کہ یہ صنف اس لوک کہانی کے نتیجہ میں معرض وجود میں آئی اور یوں اس صنف کی ایجاد و ابتداء کا سہرا بھی علاقہ دھنی ہی کے حسن خیز اور رومان پرور خطے کے سر بندھتا ہے۔

چونکہ لوک کہانیوں کے ساتھ لوک گیتوں کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے اس لئے باب ششم

ہیں لوک گیتوں کے چند نمونے بھی درج کر دیئے گئے ہیں۔ جو کہ اس خطہ کے رہنے والوں کے فکری سانچوں، جذباتی ابالوں اور ان کے دلوں کی دھڑکنوں کے ترجمان ہیں اس سلسلے میں اپنے لائق شاگرد جناب صدیق ساجد علوی ایم۔اے۔بی ٹی کی کاوشوں سے شکریہ کے ساتھ خوشہ چینی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ عزیز موصوف کی کتاب "من دی موج" علاقہ دھنی کے لوک گیتوں کا دلچسپ گنجینہ اور قابل قدر خزینہ ہے۔

گانا اور ناچ بھی ایک دوسرے کے اٹوٹ انگ ہیں۔ جب شدتِ جذبات وحسیات سے مغلوب ہو کر انسان پہلے گنگناتا ہے اور بعد ازاں بلند آواز سے گانا شروع کرتا ہے تو اکثر اوقات اس کے جسم کے بعض اعضا غیر ارادی طور پر تھرکنا شروع کر دیتے ہیں۔ کسی مخصوص لے اور ترنگ کے ساتھ اعضا و جوارح کی حرکت کا نام ناچ یا رقص ہے۔ علاقہ دھنی کے عوامی ناچ صرف دو ہی ہیں یعنی بھنگڑہ اور لڈی لہٰذا ان کا ذکر بھی ضروری سمجھتے ہوئے کر دیا گیا ہے۔

دھنی کے محدود خطے میں علم موسیقی کے بحر ناپید اکنار کو محدود و محصور سمجھنا ایک طفلانہ سی حرکت ہے لیکن راقم پروفیسر اقبال حبیب باقی کا ممنون ہے کہ انھوں نے برصغیر پاک و ہند کے مشہور میوزک ڈائریکٹر جناب مدن موہن کی طرف میری توجہ مبذول کرائی اور اس موسیقار کے متعلق ضروری مواد بھی بہم پہنچایا لہٰذا باب ہشتم میں رام لبھایا سکنہ بھون اور مدن موہن سکنہ چکوال کے حالات و کوائف مختصراً درج کر دیئے گئے ہیں۔ ممکن ہے ہندو بھائیوں میں کئی ایک اور بھی ایسے فنکار ہوں جن کا تذکرہ ضروری تھا۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد تارکین وطن سے رابطہ ٹوٹ جانے کے باعث اس ضمن میں مزید کچھ کہنا فی الحال ناممکن دکھائی دیتا ہے۔

کوئی ادبی تاریخ اس وقت تک مکمل تصور نہیں کی جاسکتی جب تک اس میں صحافیوں اور صحافت کا ذکر شامل نہ ہو۔ چنانچہ باب نہم میں علاقہ دھنی کے مشہور صحافیوں کا تذکرہ شامل ہے۔ اس باب میں مقامی طور سے شائع ہونے والے ادبی رسالوں کا ذکر بھی آگیا ہے جو کہ سطح چکوال پر ادبی ستاروں کی شکل میں ابھرے اور نامساعد حالات کا سامنا نہ کر سکنے کے باعث شہاب ثاقب کی طرح ٹوٹ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نظروں سے غائب ہو گئے۔

خط و خطاطی کا بھی علم و ادب کے ساتھ لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر بھی اظہار خیال

ضروری سمجھا گیا ہے۔ بابِ دہم میں اس فنِ شریف کا سراغ علاقہ زیرِ بحث میں بدھ عہد تک لگایا گیا ہے اور موضع میرا اہتر چک کے خروشتری کتبوں سے لے کر منشی عبد المجید پروین رقم مرحوم کے مایۂ ناز شاگرد حافظ محمد یوسف ہیڈ کاتب روزنامہ امروز لاہور تک کا حال درج کر دیا گیا ہے۔ حافظ محمد یوسف صاحب موضع بھون کے رہنے والے اور آج کل اس فن کے امام تصور ہوتے ہیں۔

کہاوتیں اور ضرب الامثال نہ صرف علم و ادب کا مغز ہوتی ہیں بلکہ جس زبان میں کہاوتیں استعمال ہوتی ہیں۔ اس زبان کے بولنے والوں کی اجتماعی ذہانت کا رس بھی انہی سے ٹپکتا ہے۔ پند و موعظت، طنز و مزاح، علم و حکمت، دنیاوی معاملات کی سوجھ بوجھ الغرض زندگی کا کون سا ایسا پہلو ہے جس کے متعلق داناؤں اور عارفوں کے پُر مغز، با محل اور زود اثر مقولے کہاوتوں کی شکل میں موجود نہ ہوں۔ چنانچہ لذتِ زباں کے لئے چند کہاوتیں بھی درج کر دی گئی ہیں۔ اختصار کے پیش نظر انہیں مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دے کر بابِ یازدہم میں جمع کر دیا گیا ہے۔ موقع و محل استعمال قارئین کرام کے حسنِ ذوق پر چھوڑ دیا ہے۔

علاقہ دھنی کے چند قابلِ دید مقامات اور ان کے دلکش مناظر سے پیدا ہونے والے تاثرات کو مختلف اوقات پر مختلف شاعروں نے اپنے مخصوص رنگوں میں جامۂ شعر پہنایا ہے ان کے کلام بلاغت نظام سے متعلقہ اشعار یا بند مقتبس کر کے بابِ دوازدہم میں بصد شکریہ درج کئے گئے ہیں ان کے اندراج کا واحد مقصد قومی ادب میں دھنی کا مقام متعین کرنا ہے اور بس۔

آخر میں دو ضمیمے بھی شامل ہیں جن میں وہ دو معرکہ آرا مضمون دیئے گئے ہیں۔ جو علاقہ زیرِ بحث کی تاریخی و ادبی اہمیت کو اجاگر کرنے اور عظیم تر پوٹھوہار کے بر خود غلط علمبرداروں کے بے بنیاد دعاوی کی قلعی کھولنے کی غرض سے مختلف ادبی و علمی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں ان کا مطالعہ یقیناً قارئین کرام کے علم میں مسرت خیز اضافے کا باعث ہوگا۔

اس کتاب کی تحریر و ترتیب میں جن ذرائع اور منابع سے کام لیا گیا ہے ان کی نشاندہی شکریہ کے ساتھ موقع و محل کے مطابق کتاب کے متن میں بھی کر دی گئی ہے تاہم قارئین کرام کی سہولت کے لئے ان کی ایک فہرست اس کتاب کے آخر میں بھی دے دی گئی ہے یاد رہے کہ اس کتاب میں بیسیوں بیانات بھی آئیں گے جن کے لئے کوئی تحریری شہادت موجود نہیں۔ بلکہ وہ تمام کے تمام راقم کے ذاتی جذبۂ تجسس و

تحقیق کا ثمرہ تھا۔ ان کے لئے مجھے در بدر، اور قریہ بہ قریہ پھرنا اور گھومنا پڑا۔ تب کہیں جا کر وہ باتیں حاصل ہو سکیں جو آج ان صفحات کی زینت کا سبب بن رہی ہیں۔ اور غالباً پہلی دفعہ منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔ تحقیق بڑا جان جوکھوں کا کام ہے یہ ایک ایسا نغمہ ہے جو ہر ساز پہ نہیں گایا جا سکتا۔ اس راہ کی مشکلات کا اندازہ صرف وہی شخص لگا سکتا ہے جو اس وادیٔ پُرخار میں چند گام چل چکا ہو۔ دوسرے حضرات بس یوں سمجھ لیں کہ چیونٹیوں کے منہ سے شکر ریزے اکٹھے کر کے خوانِ نعمت سجا لینے کا نام تحقیق ہے

چکوال جیسے علمی و ادبی مرکزوں سے دور شہر میں بیٹھ کر کسی تحقیقی کام کو انجام دے لینا بذاتِ خود بڑا کارنامہ ہے لیکن بایں ہمہ اگر دماغی صلاحیتوں کے صرف، مالی و جانی قربانیوں کی پرواہ نہ کرنے کے باوجود ایک دانشور کے رشحاتِ فکر زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اربابِ علم و نظر تک نہ پہنچ سکیں تو حسرتوں کے اس خونِ بے جا پر جتنا ماتم بھی کیا جائے وہ کم تصور ہوگا لیکن خدا کا شکر ہے کہ جناب شیخ محمد عثمان صاحب سی ایس پی ڈپٹی کمشنر ضلع جہلم اور جناب حسن رضا باشا صاحب سی ایس پی آفیسر حصہ ضلع چکوال جیسے افسران کی بالغ نظری، علم دوستی، معارف پروری، جوہر شناسی اور وسیع القلبی کے طفیل بزمِ ثقافت چکوال کا کوئی علمی و ادبی تہذیبی و ثقافتی کام مالی دشواریوں کے باعث بند پڑ کے نہیں رہ سکا۔ چنانچہ ان نیک طینت افسروں کی مساعیٔ جمیلہ سے اس کتاب کی طباعت کے لئے ایک گراں قدر رقم کا عطیہ بزم ثقافت کو مل گیا ہے۔ اس اخلاقی اور مادی اعانت کے لئے راقم ان کا شکر گزار ہے۔

ناسپاسی ہوگی اگر آخر میں راقم اپنے بزرگ مولانا ممتاز علی ایم اے بی ٹی، سید افتخار حسین ناطق ایم اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ صدر بزمِ ثقافت اور اپنے عزیز شاگردوں کا ذکر نہ کرے جن کے قیمتی مشوروں اور تگ و دو سے اس کتاب کے لئے بعض قیمتی مواد بہم پہنچ سکا۔ مددگار و معاون شاگردوں کی فہرست یوں تو خاصی طویل ہے لیکن ان میں سے چوہدری محمد نذیر، الطاف قمر، سید نثار حسین شاہ، شوکت خواجہ، اکبر تامر، مس نجمہ خواجہ اور مس شمیم خواجہ قابلِ ذکر ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔ آمین۔

انور بیگ اعوان

بھون۔ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۶۷ء

زیبِ عنوانِ تکلّم ہے وہی اسمِ جمیل۔
جس کی خوشبو سے مہکتا ہے دیارِ تخیل۔

(صفدر)

باب

دھنی تاریخ کے آئینہ میں۔

حدود اربعہ:۔ مغربی پاکستان کے ایک مشہور لوک گیت کا ایک بول ہے ۔

پیپلا بنی دیا تینڈے نیلے تیلے ڈال۔
ماہیا دھنی دیا چا گھنوں مقدمے نال۔

اس بول میں جس رومانی محبوب (ماہیا) کے حصول کی خاطر مقدمہ تک دائر کر دینے کا خیال ظاہر کیا گیا ہے اور اس ماہیا کے وطن (مسکن) کی نشاندہی جس نام (دھنی) سے کی گئی ہے وہ ضلع جہلم کی تحصیل چکوال کا ایک ایسا علاقہ ہے جو مغرب میں میرا اکھر چپ سے مشرق میں سرکال ماہر تک اور شمال میں نیلہ دلہہ سے لے کر جنوب میں ڈھوک ٹاہلیاں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس علاقے کا رقبہ 521549 ایکڑ اور آبادی 171193 نفوس پر مشتمل ہے جبکہ کل تحصیل چکوال کا رقبہ 642242 ایکڑ اور آبادی تقریباً 227770 ہے۔ اس علاقہ کا مقامی نام **دھنی** ہے۔

یہ رومانوی علاقہ نہ صرف دھنی نسل کے بیلوں، گلاب کے پھولوں اور زری جوتوں کے باعث ہی شہرت عام کا مالک ہے بلکہ تاریخی روایات اور ثقافتی باقیات کی بدولت بھی بڑی قدامت اور اہمیت کا حامل ہے۔ اس علاقے کی اپنی مخصوص تاریخ اور منفرد ثقافت ہے جس کو پنجابی کے لوک گیتوں میں یوں خراج تحسین ادا کیا گیا ہے۔ ۔

قربان دھنی دا وسنا۔ ہو اک بار کا جوڑا رکھنا۔

توڑے غریبی ہو ڈھولا۔

لیکن بڑے افسوس کا مقام ہے کہ جب سے اس علاقے نے اپنی معدنی دولت پٹرولیم کو اگلنا شروع کیا ہے تب سے اس کی انفرادیت اور امتیازی تشخیص کو مٹا دینے کی کوشش۔ شروع ہو چکی ہے اور عظیم تر پوٹھوہار کے شیدائیوں نے اس رومانوی سرزمین کو ایک منفرد اور ممتاز ثقافت کا حامل تسلیم کرنے سے دیدہ و دانستہ انکار کر رکھا ہے بقول ان کے چھچھ، گھیبی، اعوان کاری و نہار اور دھنی کے مخصوص علاقے جیسے تر پوٹھوہار کے اس طرح کے محدود حصے ہیں جس طرح کسی بڑے شہر کے محلے ہوتے ہیں۔ ان بزعم خود غلط فہم کے جوشیلے نمائندوں کے غیر علمی اور منافی تاریخ و عادی کی قلعی میں نے اپنے ایک مضمون بعنوان **پوٹھوہار کی حدود اور وجہ تسمیہ پر تحقیقی نظر** میں بخوبی کھول دی ہے (اب یہ مضمون بطور ضمیمہ نمبر ۱ شامل کتاب ہذا ہے) اور ناقابلِ تردید تاریخی شواہد اور علمی دلائل کی روشنی میں ثابت کر دیا کہ پوٹھوہار اور دھنی دو علاحدہ و متعین علاقوں کے مقامی نام ہیں۔ یہ دونوں ہرگز ایک نہیں ہیں۔ اور موخر الذکر ہی وہ علاقہ ہے جس کے جنوب مغربی گوشے میں تخت بابری ایک قابل دید مقام اور دلکش سیرگاہ ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے۔ کہ برصغیر ہند و پاکستان میں سب سے پہلا اور دنیا میں دوسرا مغلیہ باغ کے مقام پر ہی ظہیر الدین بابر (۱۵۲۶ — ۳۰ء) شہنشاہ ہند نے لگایا تھا جس کا اصلی نام باغ صفا ہے۔

وجہ تسمیہ ا:- دھنی کی وجہ تسمیہ کے متعلق مقامی طور پر دو روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ جب برصغیر میں مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر فتح بھیرہ (۱۵۱۹ء) کے بعد کلر کہار کے مقام پر آیا اور یہاں سے پوٹھوہار کے علاقہ میں واقع گکھڑوں کے مرکز قلعہ پھروالہ پر حملہ آور ہوا۔

تو اس نے اس علاقہ کی سرسبزی" زرخیزی و فاداری و بہادری سے متاثر ہو کر ۔ چند ایسے کلمات منہ سے نکالے جن کا ترجمہ مقامی بولی میں " دھن ہیں یہ ۔ لوگ کیا گیا ۔ دھن سنسکرت زبان میں منجملہ دیگر معانی کے عمدہ اور اچھا کے معنی بھی دیتا ہے ۔ علاقہ زیر بحث میں آج کل بھی دو " دھن شابا " کا لفظ بطور کلمہ تحسین و شاباش کے استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ اسی وجہ سے اس علاقہ کا نام دھن یا دھنی پڑ گیا ۔

دوسری روایت یہ ہے ۔ کہ بابر بادشاہ کے عہد میں چکوال اور ڈھن کے درمیان ایک بہت بڑی جھیل ہوا کرتی تھی جسے مقامی بولی میں "ڈھن" کہا جاتا ہے ۔ بابر کے حکم سے کوہ جودھ میں بمقام "دو گھوڑی گالا" ایک درہ کاٹا گیا ۔ اور اس جھیل کا پانی دریائے جہلم میں ڈال دیا گیا ۔ خشک ہونے کے بعد اس علاقے کو قابل دید اور قابل آبادی بنایا گیا کثرت استعمال سے ڈھن کی بجائے دھن رہ گیا ۔ (منقول از گلدستہ تاریخ قوم گوڑ سوک قلمی از شیخ نورالدین)

لیکن میری تحقیق کے مطابق یہ دونوں روایتیں من گھڑت ہیں اور علمی و تاریخی لحاظ سے ناقابل تسلیم ہیں ۔ مجھے ان روایات پر درج ذیل اعتراضات ہیں ۔

۱۔ جب اقوام دھنی کی فہرست پر نظر دوڑائی جائے تو ہمیں تین قومیں یعنے ۔ مائر کسر ۔ اور کہوٹ نمایاں حیثیت کی مالک دکھائی دیتی ہیں ۔ جیسا کہ اگلے باب ۔ میں مفصل بیان ہوگا ۔ مائر کہتے ہیں کہ وہ جموں کی پہاڑیوں سے آئے ۔ بابر کی فوج میں شامل ہوئے اور اسی نے انہیں چکوال میں آباد کیا ۔ ۱۵۹۱ء تک کہوٹوں اور کسروں کا موقف بھی عین میں یہی تھا ۔ کہ وہ بھی مائروں کے ساتھ جموں کے علاقہ سے بابری فوج میں شامل ہوئے اور علاقہ چکوال

میں آباد ہو گئے۔ لیکن ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے بعد کھوکھر اور کسروں نے اپنے موقف میں کسی قدر ترمیم کر لی کھوکھر اپنے آپ کو قریشی اور کسرا اپنے آپ کو مغل کہلوانے پر اصرار کرنے لگے۔ بہر حال اتنا بخوبی ثابت ہے کہ ۱۹۸۱ء تک یہ تینوں قومیں اپنا اصلی وطن جموں ہی بتاتی تھیں۔ کھوکھر کسرا اپنے آپ کو ماڑوں کا ساتھی باور کراتی رہی ہیں۔

ماڑوں کے متعلق تو تحقیقی طور پر یہ معلوم ہے کہ وہ جموں کے ڈوگرے ہیں۔ جو کہ راجہ پورن کسرو عرف جمبو والیئے ریاست جموں کی نسل سے سورج بنسی راجپوت ہیں۔ اور ریاست جموں و کشمیر پر بڑی شان و شوکت سے حکومت کرتے رہے ہیں۔ اس خاندان میں جبین یا ڈھں کا تصور اور روایت بڑی کہنہ اور قدامت کی مالک ہے۔

تاریخ کشمیر از منشی محمد الدین فوق جلد اوّل کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وادی کشمیر کلیتاً ایک بڑی پہاڑی جھیل تھی۔ اور اس کا نام ستی سر تھا۔ کشیپ رشی نے بارہ مولا کے مقام پر پہاڑ میں سوراخ کر کے اس جھیل کا پانی نکال کر اسے خشک کیا۔ اور برہمنوں کو لا آباد کیا۔ براہمن ایام گرما یہاں گزار کر سردی کے دنوں میں واپس چلے جاتے۔ اس زمانہ میں یہاں ایک قبیلہ پشاچ اور پاکش کے نام سے آباد تھا۔ یہ قبیلہ برہمنوں کے خلاف ایام سرمایہاں گزارتا اور گرمی میں تبت چلا جایا کرتا۔ نیل ناگ مصنف نیلہ مت پران کے مشورہ سے جو ناگوں کے قبیلوں کا سردار تھا۔ برہمنوں نے پاکشوں کو جو یہاں کے اصلی باشندے تھے۔ اس خیال سے پھر تحائف دینے شروع کیے، کہ وہ ان کو تنگ نہ کیا کریں۔ چنانچہ ابھی تک اس واقعہ کو ہزاروں سال گذر چکے ہیں لیکن پندرھویں پوہ کی اندھیری رات کو کھچڑی اماوس کا تہوار منایا جاتا ہے اس تاریخ کشمیری پنڈتوں کے گھر کھچڑی پکتی اور کوری ہنڈیا میں رکھ کر

یا گنتوں کے نذرانہ کے طور پر کہیں رکھ دی جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس بیان کے درج کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے۔ کہ جہلم کے پانی کی پہاڑی درہ سے نکاسی کی روایت اقوام مائر کسر اور بھوٹے میں غیر شعوری طور پر کوہستان جموں و کشمیر سے تاریخی تعلق کی وجہ سے چلی آ رہی ہے اور اپنی کم علمی کے باعث انہوں نے دمن کی وجہ تسمیہ اور گھوڑی گالا کے سلسلے میں اسے شہرت عام دے رکھی ہے۔ حالانکہ علاقہ دھنی کے لوگوں کے لہجہ میں ڈ کبھی د میں تبدیل نہیں ہوتا۔ کیونکہ تحصیل چکوال ہی میں سرگدھن کا لفظ تا حال موجود ہے۔ اس گاؤں کا نام کبھی بھی سرگدمن نہیں پکارا گیا۔

۲ ۔ گھوڑی گالا کے متعلق ڈسٹرکٹ گزیٹیر جہلم ہی میں یہ روایت بھی درج ہے کہ دلجبہ اور سلسلہ ہائے کوہ نیلی (کوہ جودہ) کے درمیان یہ درہ قدیم زمانے میں موجود تھا لو رشاہ کشمیر کا ایک غریب غازی تھا جس کے پاس اپنا گھوڑا نہیں تھا۔ پس وہ اپنے گھر کی دیوار پر سوار ہو گیا جس نے فوراً چلنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ اس درہ کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ اور اس نے درہ کا منہ بند کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راہ بند ہو گیا۔ اور تمام لنڈی پٹی کا پانی رک گیا۔ اور علاقہ غرق ہو گیا۔ آبادیاں ختم ہو گئیں۔ آخر چو غتہ بادشاہوں کے عہد میں یہ دیوار گرا دی گئی۔ اور پانی درہ سے گزرنے لگا۔ لوگ باگ دوبارہ واپس آ گئے۔

اس روایت سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ درہ بابر بادشاہ سے پہلے کا ہے اور اگر اس علاقے کے زیر آب آنے کی نسبت سے کسی علاقہ کا نام ڈھمن ہو سکتا ہے تو وہ تحصیل چکوال کا مشرقی حصہ بشمول منڈی پٹی کا ہو سکتا ہے۔ جس میں سرگدھن (سورگ ڈھن = بہشتی جھیل) نامی گاؤں آج تک آباد و موجود ہے۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس علاقے کو دھن کیوں نہیں کہا جاتا ہے؟

3:- بابر ایک صاحب قلم بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی زندگی اور عہد حکومت کے مفصل حالات و واقعات اپنی تزک میں درج کر رکھے ہیں۔ تزک بابری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بابر قدرتی مناظر اور جغرافیائی نشانوں کا بڑا زبردست شیدائی تھا۔ وہ 915ھ کے واقعات کے تحت کلر کہار، وہاں کی جھیل، اس کی خوشگوار آب و ہوا، گندم اور جو کے ہرے بھرے کھیتوں کا ذکر کرتے ہوئے یہاں پر باغ صفا۔ لگانے کا ذکر مزے لے لے کر کرتا ہے۔ لیکن تحصیل چکوال کے مشرقی حصے کی جھیل گھوڑی گالا سے، پانی کی نکاسی اور پھر مختلف اقوام کی آبادکاری کا ذکر تک نہیں کرتا یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ بھیرہ پر حملہ کرتے وقت اس معروف جھیل کے کنارے کنارے تو گزر جائے۔ لیکن اپنی تزک میں اس کا اشارہ تک نہ کرے حالانکہ وہ اس میں موضع تھیں جیسے ناقابل التفات گاؤں کا حوالہ دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

4:- تاریخی طور پر یہ بات ثبوت تک پہنچ چکی ہے۔ کہ اورنگ زیب عالمگیر (1658ء - 1707ء) کی وفات کے بعد جب اس کے بیٹوں شہزادہ محمد معظم اور شہزادہ محمد اعظم کے مابین جنگ تخت نشینی ہوئی۔ اور گکھڑ قوم کے سردار سیدو خان نے محمد معظم کے خلاف محمد اعظم کو مدد دی۔ محمد اعظم اس جنگ میں مارا گیا۔ تو محمد معظم نے بادشاہ بن کر اپنا نام بہادر شاہ (1707ء - 1712ء) رکھ کر سیدو خان کو یہ سزا دی کہ اس کے مقبوضات اس سے چھین کر تھے اور ماہر دلہا اور کسروال کو دے دیئے جنہوں نے بعد میں کل حقوق اپنے تصرف میں کر لیئے۔

5:- جلال الدین اکبر (1556ء - 1605ء) بادشاہ کے عہد میں دلہان جبار قلی خان ولد سلی نمو خان گکھڑ علاقہ دھن ملوکی کا حکمران تھا جس نے چکوال کے مشرق میں موضع جبیر پور اپنے نام پر بسایا بحوالہ کیگو سرنامہ خدیجی

نمبر ۱۳۱ و تاریخ گکھڑاں بنٹر) آئین اکبری کی رو سے بھی علاقہ دھنی کے قابض گکھڑ
ہی پائے جاتے ہیں علاقہ زیر بحث میں عہد اکبری میں مائروں اور کھوٹوں کے
وجود کا ذکر تک نہیں۔

اندریں حالات اس علاقے کی صحیح وجہ تسمیہ معلوم کرنے کے لئے ہمیں اس تاریخی
عہد کی طرف رجوع کرنا پڑیگا جس کی ابتدا رگوید اور آریوں کی آمد سے ہوتی
ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کا کہنا ہے۔ کہ ازمنہ قدیم سے یہ دستور چلا آتا ہے
کہ علاقوں یا شہروں کے نام اسم اللہ کے اشتقاق کی رعایت یا کسی مشہور
شخصیت یا کسی جغرافیائی نشان یا غالب اکثریت کے عامل قبیلہ کی بدولت
ہی رکھے جاتے ہیں مثلاً بابل کا نام باب ایل (خدا کا گھر) اربیل کا نام
اربعہ ایلو (چار دیوتاؤں کی پرستش کا شہر) تربیلہ (ضلع ہزارہ)۔
اصل میں تریبا ایلو (تین دیوتاؤں کی پرستش کا شہر) اسی طرح ایران کا نام
آریوں کے وطن کی رعایت سے آریانا اور پھر ایران پڑگیا۔ لہذا دھنی کی وجہ
تسمیہ معلوم کرنے کے لئے ہمیں 1200 سال قبل مسیح کی طرف لوٹنا
پڑیگا۔ جبکہ آریوں کی مذہبی کتاب رگوید کی تصنیف شروع ہوئی۔

رگوید سے پتہ چلتا ہے کہ برصغیر کے اصلی باشندے آریوں کے بالمقابل داس
کہے جاتے ہیں اور جب آریوں نے ان داسوں سے خونریز جنگیں کرکے انہیں
خوب قتل و غارت کا نشانہ بنایا۔ جو باقی بچے ان میں سے کچھ تو جنوب کی طرف
بھاگتے بھاگتے دکن اور مدراس تک جا پہنچے اور دراوڑ کہلائے اور
کچھ اطاعت کا جوا گردنوں میں ڈال کر یہیں رچ بس گئے۔ ان داسوں
میں سے چند ایک کا نام رگوید کے اشلوکوں میں محفوظ رہ گئے ہیں مثلاً۔
ہیپسو (پھیرا)، چھمی (چیمہ)، ورچین (ورک یا ڈرائچ)، وغیرہ انہی
داسوں میں سے ایک دھنی داس بھی تھا (بحوالہ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا)

چونکہ رگوید کے منتروں اور اشلوکوں کا معتدبہ حصہ کوہستان نمک کے مختلف سلسلوں کے دامن میں تصنیف ہوتا رہا ہے ۔ اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ کوہستان نمک کی جنوبی شاخ، اور دریائے جہلم کے کنارے تحصیل پنڈ دادنخان کی حدود میں جلالپور شریف کے ارد گرد جو علاقہ آج تک پبھیرہ جالپ کہلاتا ہے ۔ وہ پبھیرو داسس اور اس کی اولاد کے واخلاف کی رعایت ہی سے پبھیرہ کہلاتا ہے ۔ وڑائچ اور چیمے گجرات اور گوجرانوالہ کے اضلاع میں عام پائے جاتے ہیں ۔ اسی طرح بابر کے عہد میں جو جاٹ قبیلے تحصیل چکوال کی حدود میں بستے تھے وہ ممکن ہے اس دھنی داس کی نسل سے ہوں یہ بھی ممکن ہے ۔ کہ اس قوم کے بعض افراد نووارد حملہ آوروں کی اطاعت سے منہ موڑ کر دور دراز کے دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں پناہ گزین ہو گئے ہوں اور اسی دھنی داسس کی اولاد میں سے بعض نے بقول مسٹر رٹر (Ritter) مظفر آباد (آزاد کشمیر سے ایک منزل کے فاصلہ پر بجانب غرب دھنی نامی گاؤں بھی لبا لیا ہو جو اب تک موجود ہے ۔

کوہ مری کے نچلے پہاڑوں میں اب تک ایک ایسی قوم بھی موجود ہے جو دھنیاں کہلاتی ہے اور مصنف راجپوت گوتیں رقم طراز ہے کہ دھنیال کوہستان نمک کے پہاڑی قبائل سے تعلق رکھتے ہیں اور بڑے طاقتور ڈیل ڈول والے اور عالی ہمت ہیں تحصیل چکوال کا علاقہ دھنی ان کے نام سے مشہور ہے (بحوالہ حاشیہ نمبر ا تاریخ اقوام پونچھ حصہ اوّل مئبہ ۱۳۱ از منشی محمد الدین فوق و شاہان گوجر از چوہدری محمد مالک خان صفحہ ۱۹۲)

قدیم زمانے میں گھند معارا ، دھنی اور دریائے سرسوتی یعنے سرہند شریف (مشرقی پنجاب) تک کا تمام علاقہ برہما ورت (ارض مقدس کہلاتا تھا جب اس طرح اس مخصوص علاقہ دھنی) کی تجدید و تعین ہو گئی تو اب ان علاقہ کے سیاسی نشیب و فراز کی کیفیت تاریخ کے مختلف عہدوں میں ملاحظہ ہو ۔

۱ ۔ دھنی مہابھارت کے عہد میں ۔

جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے مہابھارت کی جنگ کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان

۱۰۰۰ ق م میں کورو کھشتر (پانی پت کا میدان) میں لڑی گئی تھی لیکن اصل جنگ کے وقوعہ سے پہلے اندر پرست (دہلی) کے شہزادوں نے بذریعہ رسم سوئمبر کرشنا درو پدی کے ساتھ بیاہ کیا تھا اور پھر اُسے جوئے میں ہارتے وقت اس کی تذلیل اس کے سامنے ہوتی دیکھ کر پانڈوؤں کے ایک شہزادے بھیم نے کورو شہزادہ دریودھن کا خون پی کر بدلہ اتارنے کی قسم کھائی تھی چنانچہ اسی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے مہابھارت کی جنگ برپا کی گئی۔ جس میں بھارت ورش کے تمام راجے مہاراجے اپنے لاؤ لشکر سمیت یا پانڈوؤں کی طرف سے یا کوروؤں کی طرف سے شامل جنگ ہو کر گاجر مولی کی طرح کٹ مرے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ عظیم کا مرکزی کردار کرشنا درو پدی کا میکہ علاقہ دھنی کا درو پد نگر تھا جوئے میں سب کچھ ہار چکنے کے بعد جب پانڈوؤں کو بارہ برس کا بن باس یا دیس نکالا ملا تو وہ پنجند (پانچ ندیوں کی سرزمین) کے اُسی علاقے میں چلے آئے جہاں ان کا سسرال تھا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ راجہ درو پد کا پایۂ تخت درو پد نگر کہاں تھا۔؟

ایک ہندو روایت یہ بتاتی ہے کہ وہ موجودہ بھون تھا بھون چونکہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کا معنے فرشتوں کے رہنے کی جگہ یادگار دیوی کا استھان ہے کہا جاتا ہے کہ آریہ قبیلے وسط ایشیا سے چل کر سابقہ پنجاب میں پھیلے تو ان کے کچھ گروہ اٹک اور جہلم کی وادی میں آباد ہو گئے۔ ان کے بعض نیک سرشت بزرگوں نے دور جنگلوں اور بنوں میں ایسے مقامات کو اپنا ٹھکانہ بنا لیا جہاں انہیں تنہائی اور سکون کے ساتھ ساتھ اچھی فضا بھی مل سکے ایسا ہی ایک ٹھکانہ موجودہ بھون سے ایک میل دور شمال مغرب کی جانب بنایا گیا جسے اب پرانا پنڈ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جہاں کسی زمانہ میں ایک ندی سوجھی نامی بہتی تھی جس کے معنی گھنے جنگلوں سے گذرنے والی کے ہیں یہی ندی آج کل نالہ سوج کے نام سے مشہور ہے مسٹر تالبٹ نے اس

اس جگہ کا نام پنڈ جہانہ بتا کر لکھا ہے کہ تیز بارشوں کے بعد اکثر اوقات اس جگہ سے قدیم سکے وغیرہ دستیاب ہوتے رہتے ہیں۔

3؛۔ لیکن میری تحقیق یہ ہے کہ مہابھارت کی علاقائی تقسیم کے مطابق علاقہ دھنی کیکیئہ دیس کے مترادف ہے اور ارجن پانڈو کی بجائے سری کرشن کا خسر راجہ کیکیئہ اس علاقہ کا حکمران تھا جس کے پانچ بیٹے پانڈووں کی طرف سے جنگ مہابھارت میں شریک ہوتے راجہ کیکیئہ کے متعلق مفصل بحث اسی کتاب کے تیسرے باب میں آرہی ہے البتہ کوہستان نمک کے علاقے میں پانڈووں کی آمد کا ثبوت وادی کھون میں کٹاس راج کے متبرک مقام پر ایک بھول بھلیاں طرز کی عمارت ۔ست گھرا سے مل رہا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اسے پانڈووں نے تعمیر کیا تھا۔

اے تحصیل تلہ گنگ میں واقع ایک گاؤں کا نام لیکن تحصیل چکوال میں موضع نیلہ دلہہ کے قریب ایک جگہ جہاں دریائے سواں میں نالہ گراہی ۔بھگناؤ۔سوج۔ اور نرٹالہ گرتے ہیں پینچند کا مطلب پانچ پانی" ملاحظہ ہو۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر جہلم مصنفہ مسٹر ٹالبٹ

2؛۔ بھون کا ماضی و حال از قلم صوفی خدا بخش تترالوی مطبوعہ چکوال گزٹ کراچی، مجریہ یکم جولائی 1964ء 12

3؛۔ رپورٹ بندوبست 1903ء

۶۔ دھنی سکندر اعظم کے عہد میں۔

سکندر اعظم اور راجہ پورس جس کا اصلی نام پور پال ولد بچن پال تھا کی جنگ 326 ق م میں دریائے جہلم کے کنارے ہوئی اس زمانے میں راجہ ٹیکسلا کی عملداری دوآبہ سندھ ساگر پر تھی لیکن راجہ پورس نے دریا پار کر کے علاقہ دھنی تک اپنا تسلط جما لیا تھا جسے راجہ ٹیکسلا بجا طور پر اپنا علاقہ سمجھتا تھا ضلع گجرات کی تحصیل۔

کھاریاں کے چیب راجپوتوں کے ہاں ایک کبت مروج ہے جس میں راجہ پورس کی وسعت سلطنت بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ .... دھنی سمندروں پار یعنے راجہ پورس (جس کی حکومت دریائے چناب اور جہلم کے درمیانی دوآبہ پر تھی) کے مقبوضات میں دریائے چناب سے پار دھنی کا علاقہ بھی شامل تھا اور اگر سر اُرل سٹیس کی اس رائے کا لحاظ کیا جائے جس کا اظہار انہوں نے 1931ء میں کیا تھا کہ سکندر اعظم نے راجہ پورس کے ساتھ جنگ کرنے کا جو راستہ اختیار کیا تھا وہ موجودہ شاہراہ اعظم کا نہیں تھا بلکہ وہ ٹیکسلا چکوال اڈہ درہ نندونہ سے گزر کر ہرنپور تک پہنچتا ہے تو پھر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ سکندر اعظم اور اس کے یونانی جرنیلوں کا عمل دخل حتمی طور پر اس علاقے میں رہ چکا ہے۔

— — — — — — —

3:۔ دھنی بودھوں کے عہد میں۔

غالباً راجہ کنشک کے عہد (78ء) میں جس کا پایۂ تخت پشاور یا چارسدہ تھا علاقہ سون سکیسر کی طرح کہون اور دھنی کے مغربی حصوں میں بدھ مت کا طوطی بولنے لگا۔ کلر کہار سے تقریباً دو میل بجانب شرق کلر کہار ڈلوال سڑک کے کنارے ایک ایسی جگہ ہے جسے موٹی کا باغ کہتے ہیں اس باغ کے قریب پہاڑی میں ایک غار ہے جسے آج کل "بابا فرید دی کھوہ" کہا جاتا ہے یہاں ہر سال محرم کے دنوں میں میلہ سا لگا رہتا ہے یہ جگہ غالباً بدھ مت کے بھکشوؤں کی عبادت گاہ تھی جسے اسلامی عہد میں بابا فریدؒ سے وابستہ ایک دوسری روایت سے متعلق کر کے زیارت گاہ عوام بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح کلر کہار میں روضہ سخی ہو بہو کے بارے میں بھی ٹالبٹ وغیرہ کی یہی رائے ہے کہ یہ ایک بدھ چلہ گاہ تھی جو عرصہ دراز سے تقدس کی حامل چلی آ رہی تھی اسی شہرت کے باعث سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ (1039 - 1102ھ) بھی سیر و سیاحت کے دوران یہاں آئے اور انہوں نے بھی یہاں پر چند روز عبادت میں مصروف رہ کر قیام کیا مقامی

عوام پر یہ مشہور ہے کہ اس روضہ میں دو قبریں ہیں وہ حضرت غوث الاعظم بغدادی رح کے پوتوں صاحبزادہ محمد یعقوب عرف فیض عالم اور صاحبزادہ محمد اسحق عرف فیض نور پسران سید عبدالرزاق کی ہیں یہ بات بلا تحقیق ہے کیونکہ بابر بادشاہ نے اپنی تزک میں اس مزار کے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ سید عبدالرزاق کی آمد ہندہی ثابت ہے خیر یہ تو بطور معترضہ تھا علاقہ کہون میں ڈلوال ملوٹ اور کٹاس راج وغیرہ کے مقامات ایسے ہیں جہاں بقول کننگھم قدم قدم پر بودھوں کے آثار بکھرے پڑے ہیں بنا بریں ناممکن ہے کہ علاقہ دھنی میں اس مذہب نے اپنا اثر نہ ڈالا ہو۔ اس اثر کا مثبت ثبوت ہمارے پاس موضع میرا اقر چک میں بدھوں کا ایک کنواں ہے۔ عام کنوؤں کے برخلاف یہ کنواں مربع دہن ہے اور اس کے تین طرف بقول مسٹر ٹالبٹ کے خروشتی (خرد شتری) کتبے کندہ ہیں اس کی تاریخ تعمیر سمت 58 ہے میرا اقر چک کلر کہار سے دس میل کے فاصلے پر بجانب شمال مغرب واقع ہے۔

تاریخ نویسی کے ضمن میں سکے اگرچہ قابل اعتماد ذریعہ نہیں ہوتے کیونکہ یہ دست بدست اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتے رہتے ہیں تاہم ان کے وجود سے کسی علاقہ کے متعلق اتنا ضرور پتہ چل جاتا ہے کہ وہ علاقہ یا جگہ جہاں سے یہ دستیاب ہوں کن کن بادشاہوں کے عہد حکومت میں قابل ذکر تھا چنانچہ علاقہ زیر بحث سے اب تک مختلف اوقات میں جو سکے برآمد ہو چکے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ علاقہ کافی عرصہ تک یونانی باختری اور انڈو سکا تھیئن (سیتھین) بادشاہوں کے ماتحت رہ چکا ہے۔ ان کے بعد سفید ہنوں کی باری آئی جن کا زمانہ ۴۷۵ء کے لگ بھگ تھا ان میں سے تورامنہ شاہی، جاؤلہ اور اس کے لڑکے مہر گل کی حکومت اس علاقہ پر رہ چکی ہے

۷:۔ دھنی ہند یونانی بادشاہوں کے عہد میں

سکندر اعظم کے حملہ (326 ق م) اور محمود غزنوی کے حملوں (۱۰۰۰ء سال بعد) کے درمیان کا زمانہ تاریکی میں ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ وادی کہون میں کٹاس کے

گرد و نواح میں مورتی پہاڑ پر ایک لاٹ اور سٹوپا اشوک اعظم (272 - 232 ق م) نے بنایا تھا جس کی وسعت سلطنت آسام اور دکن کے متوڑے سے علاقے کو چھوڑ کر باقی سارے ہندوستان، نیپال، افغانستان اور بلوچستان پر محیط تھی۔

5 :- دھنی عہد وسطیٰ کے حکمرانوں کے دور میں۔

مشہور بدھ زائر اور چینی سیاح ہیون سانگ کی سیاحت (631ء) کے وقت اس علاقے کے سیاسی حالات پردۂ تاریکی میں ہیں البتہ تاریخ کشمیر کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سفید ہنوں کی تاخت و تاراج کے بعد دوآبہ سندھ ساگر بشمول علاقہ زیر بحث کے قدیم ہندو راجگان کشمیر کے زیر نگین تھا جن کے آثار موضع ہسولہ کے محلہ کوٹ میں تقسیم ملکی (1947ء) تک موجود تھے اور ان کا یہ قبضہ نویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک رہا۔ اور پھر اس علاقے پر کابل کے ہندو شاہی خاندان کا عمل دخل رہا۔ جو محمود غزنوی کے عہد تک قابض رہے مانند پال اور جے پال ہندو شاہی بادشاہ تھے اور کوستان نمک میں نندانہ (ندونہ نندنہ) کا قلعہ انہیں کا تھا۔ نندانہ کی مہم محمود غزنوی کا نانواں حملہ تھا۔ سلسلۂ کوستان نمک میں اسلام سومناتھ کے حملہ (26-1024ء) کے بعد شروع ہوا۔

6 :- دھنی عہد غلاماں میں۔

سابقہ پنجاب پر 1193ء میں محمد غوری (1173 - 1206ء) نے اپنی حکومت قائم کر لی لیکن وہ کھوکھروں کے ہاتھوں دھمیاک کے مقام پر 1206ء میں شہید ہو گیا۔ اس بادشاہ کے عہد میں کوئی خاص قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا۔ البتہ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کے 1215ء میں کوہ جودھ پر حملہ کرنے کے لئے اپنے جرنیل بھیجے۔ سلطان نے اس علاقے کے حکمران رائے کوکہ سکین (سکھ ہین) کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔

اپنے عمدہ نسل کے گھوڑوں کی وجہ سے یہ علاقہ نصیر الدین محمود (65 - 1246ء) کے عہد میں پھر پردۂ گمنامی سے نکل آتا ہے جرنیل الوغ خان جو کہ بعد ازاں بلبن کہلایا بادشاہ کے حکم

سے کوہ جودہ اور جہلم کی تاخت کے لئے آیا۔ کیونکہ یہاں کے راناؤں نے کافر مغلوں کی امداد کی تھی۔ بلبن (۸۶ - 1226ء) نے خود بھی اس غرض کے لئے اپنے عہد میں ایک مہم بھیجی " ملک تباہ و برباد کیا گیا اور سپاہیوں کو کافی تعداد میں گھوڑے ہاتھ لگے یہاں تک کہ فوج میں گھوڑے کی قیمت چالیس ٹنکہ تک آگئی۔ ضلع جہلم کا شمالی علاقہ (دھنی) انگریزی عہد تک اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کے لئے مشہور رہ چکا ہے۔ جلال الدین فیروز شاہ خلجی (۵ - 1290ء) نے بھی کوہ جودہ کے جنجوعوں کا اتنا خون بہایا کہ جودہ کی پہاڑیوں میں کشتی چل سکتی تھی۔ اس عہد نے ایک نامی گرامی امیر کو بھی جنم دیا۔ جس کا نام ملک عین الدین علیشہ کوہ جودی تھا اور یہ بلبن اور کیقباد (1266 - 1290ء) کے عہد میں ایک نامور امیر تھا۔ (بحوالہ پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی صفحہ ۶)

۷:- دھنی مغلیہ عہد میں:-

اس علاقہ کے گرد و نواح میں امیر تیمور (۹ - 1398ء) جب حملہ آور ہوا تو کوہ جودہ کے رائے اور سردار پیش کش لے کر حاضر خدمت ہو گئے۔ اور اس طرح یہ علاقہ تاخت و تاراج سے بچ گیا لیکن تیمور آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح چلا گیا۔ اور اس کے بعد سابقہ پنجاب میں طوائف الملوکی اور گڑبڑ پھیل گئی۔ ایسے حالات میں بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس علاقے میں مختلف قومیں اور قبیلے آباد ہوں وہ ان غیر یقینی حالات میں باہمی خانہ جنگی لوٹ کھسوٹ اور آبادی میں تباہی و بربادی میں کیا کسر اٹھا کر رکھے ہونگے تزک بابری میں کوہ جودہ اور ملحقہ علاقہ (گکھر کہار اور چھنبی) کا ذکر ۵ ۱۲ سال بعد 915ھ / 1519ء کے واقعات کے تحت یوں ملتا ہے:-

"بھیرہ سے سات کوس شمال کی طرف ایک پہاڑ ہے اس کو ظفر نامہ وغیرہ تاریخی کتابوں میں کوہ جودہ لکھا ہے بھیرہ سے چلے اور ظہر کے وقت کلر کہار میں اترے یہاں چاروں طرف آبِ غالباً گکھر قوم کا راجہ سنگھ نہیں ہوگا۔ تحقیق چکوال کے علاقہ دھنی میں سنگھ نہین نام کا ایک گاؤں اب بھی موجود ہے۔"

گیہوں وغیرہ کے کھیت کے کھیت تھے یہ مقام قابل دید ہے بھیرہ سے دس کوس کے فاصلے پر پہاڑ میں ایک ہموار قطعہ ہے اس میدان میں ایک صاف جائے بڑا تالاب ہے چونکہ جگہ عمدہ تھی اس لئے میں نے یہاں باغ تیار کروایا اس کا نام باغ صفا رکھا ۔ مسٹر ٹالبٹ نے اپنی رپورٹ بندوبست ۱۹۰۱ء میں لکھا ہے کہ باغ صفا واقع کلر کہار کی دیکھ بھال ۔ موضع بھون کے گڈھوک خاندان کے مورث اعلےٰ کانک داس کو ہمایوں بادشاہ (وفات 1556ء) نے بذریعہ ایک شاہی سند محررہ 1902 ہجری/ 1545ء دے رکھی تھی۔
اس سند سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کھیون کے انتظام اور ترقی کے صلے میں تیس ہزار ٹکہ کا بطور انعام بھی دیا گیا ۔ دوسری سند عہد اکبری کی ہے اس کی تاریخ تحریر 970ھ ہے اس کے ذریعے کانک داس کو بھیرہ اور نیلاب کی خدمت سپرد کی گئی ۔ دو سال بعد کی ایک تیسری سند یہ بتاتی ہے کہ نارائن داس پسر کانک داس کو شیر شاہ سوری (5 – 1540ء) کی بغاوت جو کہ بیس سال پہلے ختم ہو چکی تھی کے دوران نقصانات کا معاوضہ دینے کے لئے پندرہ ہزار دام عطا کیے گئے ۔ چوتھی سند اورنگ عالم گیر (1707 – 1658ء) کے چالیسویں سال حکومت یعنی 1695ء کی ہے جس پر مرزا دیانت بیگ خانخاناں کی مہر ثبت ہے جس کی رو سے محمد شریف ولد بھگوتی داس رام چندر آسا رام سندر رام قوم گڈھوک کو دھنی کھون کلر کہار اور محال ملوٹ میں مبلغ سات سو روپیہ کی رقم ادا کی گئی ۔
موضع بھون میں بھٹی قوم کے ایک فرد قاضی حسام الدین عہد عالمگیری میں سرکاری قاضی تھے ۔ ان کو اورنگ زیب عالمگیر نے موضع بھلہ کریالہ کے نزدیک ایک گاؤں موہڑہ قاضیاں بطور جاگیر دے رکھا تھا جو اب بحق سرکار پاکستان ضبط ہو چکا ہے ۔ اس طرح موضع نقر چک کے قاضی خاندان میں بھی ایک سند کا پتہ چلتا ہے جو کسی مغل شہنشاہ کی عطا کردہ بیان کی جاتی ہے لیکن سرکاری ریکارڈ سے تو اس کا کوئی پتہ نہیں ملتا ۔
آئینِ اکبری میں اس علاقے کو ملوکی دھن یا بلوکی دھن لکھا گیا ہے اور اس پر گکھڑ قبیلہ کا قبضہ دکھایا گیا ہے جیسا کہ آگے آئے گا اورنگ زیب عالمگیر کے بیٹوں کی خانہ جنگی میں کامیابیہ

ہونے والے شہزادہ معظم الملقب بہ بہادر شاہ (1707 - 1712ء) نے سید خان گکھڑ کو بطور سزا اس علاقے سے بے دخل کر کے اقوام مائرہ اور کسر کے سرداروں کا یہ علاقہ دے دیا۔ قلعہ سولہ پر نادر شاہ (1739ء) کے حملہ کے وقت گجر قابض تھے پھر آخری مغل حکمرانوں کے عہد میں (1798ء)، زمان شاہ درانی لاہور سے براستہ رام نگر (رسول نگر)، قادر آباد اور کلر کہار ہوتا ہوا باغ نیلاب سے پشاور لوٹا تھا۔ فوجوں کے لئے رسد وغیرہ کی فراہمی کے بارے میں چند پروانے راجہ اورنگ زیب مقیم چکیہ کے پاس بھی موجود بیان کئے جاتے ہیں لیکن موصوف کے پاس موجود جن پروانوں کو راقم نے دیکھا ہے وہ سکھ عہد سے تعلق رکھتے ہیں اور اکثر چوہدری جہان خان نامی شخص کے نام ہیں۔

سلطان مکرم خان (مقرب خان) گکھڑ (1143ھ/1730ء - 1175ھ/1761ء) جو کہ مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلا (1719 - 1749ء) اور شاہ عالم ثانی (1747 - 1857ء) کا ہمعصر اور احمد شاہ ابدالی (درانی) کے حملہ یعنی پانی پت کی تیسری لڑائی (1761ء) کے زمانے میں سکھوں کے ہاتھوں گجرات کے مقام پر مارا گیا تھا کے حالات کے ضمن میں بھی دھن ملوکی کا ذکر آتا ہے آئندہ جو واقعات درج ہو رہے ہیں یہ کیگوہر نامہ فارسی اور تاریخ گکھڑاں اردو از راجہ محمد یعقوب طارق سے ماخوذ ہیں بتایا جاتا ہے کہ پرگنہ دھن ملوکی کے ایک زمیندار مہر نامی نے اپنی قوم کے افراد کو اپنے پرگنے اور دوسری جگہوں سے اکٹھا کر کے بادشاہوں کے ساتھ بغاوت کرنے کی تحریک کی تھوڑے مقابلہ کے بعد قتل ہوا۔ اور تمام فوج گرد کی مانند اڑ گئی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ طارق صاحب نے کیگوہر نامہ ص ۱۹۵ کی فارسی عبارت کا اردو ترجمہ کرنے میں غلطی کر دی ہے کیونکہ جن الفاظ کا " بادشاہوں کے ساتھ " ترجمہ کیا گیا ہے ان کے حقیقی معنے " پادشاہاں کے قریب " ہے۔ فارسی کی اصل عبارت یہ ہے :-

" در لبعد از اں مہر نامی زمیندار پرگنہ دھن ملوکی قوم خود از تمام پرگنہ مذکور و دیگر جہات بسیار فراہم کردہ تحریک سلسلہ پرخاش متصل پادشاہانی گردید "

پادشہانی یا پادشاہان تحصیل چکوال کا اب بھی ایک مشہور معروف گاؤں چکوال سے پانچ چھ میل بجانب شمال مشرق موجود ہے۔ اور یہاں پر مائر منہاس قوم کی اکثریت ہے۔ مہر غالباً مہر خان چکوالیہ چوہدری تھا جو کہ بموجب گلدستہ تاریخ گڑھوک (قلمی) اس زمانے میں دھمی کا حاکم تھا اور چوہدری جہان خان سکنہ بنیلہ دلہہ سے رشتہ داری رکھتا تھا۔ اول الذکر قوم مائر سے اور ثانی الذکر قوم کُسر سے تھا۔ لیکن ہسٹری آف دی گکھڑز کا مصنف جی۔ ڈیلیمرک لکھتا ہے کہ سلطان مقرب خان (مکرم خان، گکھڑ) کی جنگ پادشاہانی، (ضلع جہلم) کے چوہدری مہر کِسر کے ساتھ ہوئی کیونکہ وہ دستور و رواج کے خلاف اپنے چند مفرور زبردستی پکڑ کے لے گیا تھا جنہوں نے کہ سلطان موصوف کے علاقے میں پناہ لے رکھی تھی چوہدری مہر خان مارا گیا اور اس کی ساری جائداد لوٹ لی گئی۔

آگے چل کر لکھا ہے کہ اسی سلطان نے کونتریلہ اور اس کے گرد و نواح میں سرکشی کرنے والے فیروزالوں اور بھکرالوں کے دیہات تباہ و برباد کر دیئے۔ ان میں سے کچھ لوگ بھاگ کر دھمن ملوکی کے چوہدریالوں کے پاس پناہ گزین ہو گئے۔ لیکن سلطان مذکور کو یہ بات بڑی ناگوار گزری وہ آگے بڑھا اور موضع خانپور میں ڈیرہ ڈال کر وہاں سے دھمن ملوکی کے چوہدریوں کو دھمکی آمیز خط لکھا کہ یا تو مفسدوں کو گرفتار کر کے حاضر کیا جائے یا اپنی حدود سے باہر نکال دیئے جائیں ورنہ خبردار ہو جائیں۔ چوہدریالوں نے مقابلہ کی طاقت نہ رکھتے ہوئے سرکشوں کو پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ اور وہ مایوس ہو کر گھیب کے علاقے میں چلے گئے۔

یہ بھی لکھا ہے کہ احمد شاہ درانی کے حکم کے مطابق پرگنہ دھمن کا محصول ہر سال سلطان موصوف اپنے ذریعے سے وصول کرایا کرتا تھا۔ اور اس کام پر اپنا منشی بخشی شیخ عجائب اور یوسف خان بھکرال مقرر کیے ہوئے تھے مذکورہ اہلکار موضع بھون میں ڈیرہ جما کر معاملہ کی وصولی کے لئے گدیالوں (چوہدریالوں، چکوال جو بابا گدا بیگ اپنے جد کی نسبت سے گدیال کہے گئے ہیں) کے گرد ہوئے۔ لیکن ایک بڈھا نامی چوہدری

نے سرکشی کر کے بخشی مذکور سے ساتھ جنگ چھیڑ دی اور اسے قتل کر دیا چنانچہ اس شرارت کی سزا دینے کے لئے سلطان مکرم خان معہ سلطان الہ یار خان اکبر آبادی تعلقہ دھن پر حملہ آور ہو گیا، تمام گدیاں جان بچانے کے لئے بھاگ گئے اور گکھڑوں نے بخشی شیخ عجائب کے قصاص کے طور پر تمام قصبہ چکوال، کہون، بھون اور دیگر دیہات کو تاخت و تاراج کیا اور بہت سے افراد کو گرفتار کر لیا پس معاملہ کی ذمہ داری اور وصولی اہلکاروں کے ذمہ چھوڑی اور اپنے منشی مبارک سنگھ و یوسف خان، بھکڑال کو معہ فوج علاقہ کی سرکوبی کے لئے مقرر کیا۔ اس تاریخی واقعہ کی روداد ایک منظوم جنگ نامہ کی صورت میں موجود ہے جسے خانپور کے راسزادہ عزت رائے کی وار کہتے ہیں۔

لالہ ہر کرپندا اس مصنف تاریخ کھوڑ خاندان سدوال روایت کرتا ہے کہ جس وقت زمان شاہ (۱۷۹۸ء) والئے افغانستان ہندوستان سے واپس ہوتا ہوا قصبہ بھون کے نواح (کلر کہار) میں خیمہ زن ہوا تو اس کے عمال دودھ اور چارہ کی فراہمی کے لئے سدوال آنکلے یہاں کے چوہدریوں نے عمال کی حکم عدولی کی اس واسطے شاہی ملازموں نے ان کے بہت سے لوگ تہ تیغ کر دیئے۔

8:- دھنی سکھوں کے عہد میں۔

زمان شاہ درانی (1793ء - 1800ء) کی چند توپیں رسول نگر کے مقام پر دریا عبور کرتے وقت دریائے چناب میں ڈوب گئی تھیں اور انہیں نکلوانے کے صلے میں، رنجیت سنگھ (1799ء - 1839ء) کو لاہور کی صوبیداری مل گئی تھی سکھوں کی بارہ مثلوں میں سے کوئی بھی دریائے جہلم کے ادھر نہیں تھی لہذا یہ علاقہ درانیوں کے ماتحت ہی رہا 1765ء میں سکھوں نے گکھڑوں کو گجرات کے مقام پر شکست دی مونجھ کالا کے گجر چوہدریوں کی دعوت پر سکھوں نے دریائے جہلم کو عبور کیا اور 1808ء میں

جونہی احمد شاہ (وفات ۱۷۷۲ء) نانواں حملہ کر کے امین آباد (پنجاب) سے واپس لوٹا سکھوں نے قلعہ رہتاس پر قبضہ کر کے اٹک تک اپنی حکومت وسیع کر لی قلعہ رہتاس سردار چڑت سنگھ نے نورالدین خان بامیزئی سے چھینا اور یوں دھنی چکوال جلالپور پنڈ دادن خان وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ صاحب خان عامل پنڈ دادنخان نے بھاری رقم دے کر جان بچائی ۱۸۰۱ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ خود دھنی میں آیا اس نے بلا مقابلہ اس علاقہ کو زیر نگین کر لیا نظم و نسق کا کچھ بندوبست کر کے چار سو اعلےٰ نسل کے گھوڑے لے کر لاہور واپس چلا گیا۔ ۱۸۱۰ء میں سلطان فتح محمد جنجوعہ والئے کوسک (کوہستان نمک) کی شکست کے بعد یہ علاقہ مکمل طور پر سکھوں کی عملداری میں آگیا۔ سکھوں کی آمد سے پہلے تمام علاقے کے حالات بڑے مخدوش رہتے تھے ہر طرف جنگ و جدل کا بازار گرم تھا لیکن سکھوں نے کسی قدر امن قائم کر دیا۔ سکھو کی دوسری لڑائی (۱۸۴۹ء) میں تمام علاقہ چھتر سنگھ کے زیر علم تھا جیسے چلیانوالہ اور گجرات میں میجر نکلسن کے ہاتھوں شکست ہوئی اور اس علاقے کے ماتمر لوگوں کو ایک انگریز عورت مسز جارج لارنس کو سکھوں کے حوالے کر دینے کی وجہ سے جاگیروں کی ضبطی وغیرہ کی سزا دی گئی اس حادثہ کے وقت چودھریان دلیہ انگریزوں کے حمایتی رہے لیکن بعد ازاں بااثر قوم کے بااثر افراد نے عذرنامے وغیرہ پیش کیئے اور فریقین کے درمیان صلح صفائی ہو گئی۔

موضع بھون میں سکھوں کے زمانہ کی ایک یادگار قلعہ کی صورت میں موجود تھی جیسے ٹالبٹ نے رپورٹ بندوبست میں گٹھوالہ لکھا ہے۔ اب تقسیم ملکی (۱۹۴۷ء) کے بعد یہ قلعہ ویران و منہدم ہو چکا ہے صرف کچھ حصہ باقی ہے جس میں محمد خان کھائی والے نے آٹا پیسنے کی مشین لگا رکھی ہے۔

۹۔ دھنی انگریزوں کے عہد میں۔

سکھوں کے زوال کے بعد (۱۸۴۹ء) جب انگریزی عملداری آئی تو جنرل نکلسن کے تحت اس علاقے میں سب سے پہلا بندوبست اراضی کیا گیا اور اس عہد میں جو بار بوچ

ہوشیار اور وفادار لوگ تھے انہیں بڑی بڑی زمینداریاں سونپی گئیں اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں معرض وجود میں آگئیں مثلاً راجگان کانس دگجر، سرداران دلیہ د مغل کسر، چودھریان کوٹ د مائر منہاس وغیرہ چودھریان بعلہ دکہوٹ قریشں) میں سے چودھری برخوردار کے متعلق روایت ہے کہ وہ ایک معمولی گڈریا تھا جب جنرل نکلسن اس طرف سے دورہ پر گزرا تو برخوردار نے رات کے وقت کریالہ کے قریب پہاڑوں پر گھاس پھوس اکٹھا کر کے آگ لگا دی اور مشہور کر دیا کہ کہوٹ کے علاقہ کے راجپوتوں نے نکلسن کے حملہ پر حملہ کر دیا ہے اور اس نے بڑی بہادری سے ان کا مقابلہ کر کے ان سے دور رکھا ہے چنانچہ اس خدمت کے صلہ میں اُسے کریالہ کی ایک جاگیر عطا کر دی گئی۔

انگریزی عہد میں جہاں اس علاقے کے لوگوں کے لئے فوجی ملازمت کی بدولت روزگار کے وسیع وسائل حاصل ہو گئے جس کی بدولت ان کی روایتی خوش پوشی کا معیار نہ صرف قائم رہا بلکہ بلند بھی ہوا وہاں ناقابل تلافی نقصان یہ ہوا کہ اس علاقہ کے اعلےٰ نسل کے گھوڑے معدوم ہو گئے۔ ان گھوڑوں کے متعلق ابوالفضل علامی آئین اکبری میں رقم طراز ہے کہ "یہ گھوڑے عراقی گھوڑوں کی مانند ہیں"۔ سکھوں کے رسالے میں تو خصوصاً دھنی نسل کے گھوڑے ہی استعمال ہوتے تھے یہ گھوڑے تیز رفتار مضبوط اور پتھریلے علاقے میں بغیر آہنی نعلوں کے جا سکتے تھے۔ گھوڑوں کی پرورش کے لئے نیلہ دلہہ اور کوٹ رہوال کا علاقہ خاص طور پر مشہور تھا جہاں ۱۹۰۱ء تک قحط سالی کی بدولت اعلےٰ نسل کی گھوڑیاں ختم ہو گئیں وہاں انگریزوں نے نسل کشی کے لئے جو گھوڑے اس علاقہ میں رکھے وہ اس علاقہ کی آب و ہوا کے لئے ناموزوں تھے۔ اس طرح گھوڑے پالنے کی صنعت تنزل کا شکار ہو گئی رہی سہی کسر ریماونٹ ڈپو مونہ نے پوری کر دی انگریزی فوج میں اس علاقے کے عمل دخل کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگ سکتا ہے کہ بروایت میجر جنرل محمد اکبر خان ہندوستانی رسالہ ان کے دادا راجہ جہان خان نے کھڑا کیا تھا۔

۱۰:- دھنی دور آزادی میں ۔

۱۹۴۷ء میں مملکتِ خداداد پاکستان کے معرض وجود میں آجانے سے اس علاقہ کو بھی آزادی کے فوائد و نقصانات کا دیگر حصص ملک کے ساتھ برابر کا حصہ ملا یہاں کے کاروبار اور اقتصادی زندگی پر غیر مسلموں کا پورا پورا قبضہ تھا ان کے آخری متنفس تک کا ترک سکونت کر کے بھارت چلے جانا اس علاقہ کی تجارت و معیشت کے لئے ایک مہلک ضرب تھی لیکن اس علاقے کے جیالے شمشیر زنوں نے جس سرعت اور مستعدی سے اس خلا کو پورا کر لیا وہ قابل داد ہے یہ دوسری بات ہے کہ ان کی تجارت نے روایتی راستے سے ذرا ہٹ کر اپنا اصول بکری کم اور منافع زیادہ" رکھا اور اس طرح راتوں رات لکھ پتی بن جانے کی دوڑ لگانی شروع کر دی لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے دھنی کے مرکز چکوال کی کایا پلٹ دی جہلم روڈ کی چنگی کی چوکی سے لے کر تلہ گنگ روڈ کی چنگی تک اور ریلوے لائن سے پار اور ریلوے اسٹیشن کے اردگرد نہ صرف نئی بستیاں زمین سے ابھر آئیں بلکہ ہر قسم کی تجارتی اشیاء کی وہ ریل پیل ہے کہ اب چکوال پہچانا ہی نہیں جاتا خان شیر بہادر سابق ایس۔ ڈی۔ ایم چکوال کی مساعی جمیلہ سے چھپڑ بازار کی تعمیر اور اس بازار کے مرکز میں باٹا کی دکان کا قیام دلہن کے ماتھے پر جھومر کا سماں پیش کر رہی ہے ۔

تعلیمی میدان میں بھی غیر مسلم چھائے ہوئے تھے لیکن تقسیم ملک کے بعد فوجی سرداروں اور افسروں کی انتھک اور مستحق تشکر کوششوں کے طفیل چکوال میں گورنمنٹ کالج کے قیام نے اس علاقہ کے لوگوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم بھی روز افزوں طریقہ پر جاری ہے ۔

پاکستان کے مشہور سرمایہ دار اور کارخانہ دار سہگل خاندان نے موضع کھوتیاں کے قریب نہ صرف ایک نیا گاؤں سہگل آباد کے نام سے بسایا بلکہ وہاں پر ایک ماڈل سکول کا اجرا کر کے ملک کے صاحب ثروت لوگوں کے لئے قابل تقلید نمونہ بھی پیش کر دیا ہے اس وقت کم از کم سولہ سترہ ہائی سکول تحصیل چکوال میں علم کی روشنی پھیلانے کا کام سرانجام دے

رہے ہیں۔ ایک فرانسیسی صحافی موسیو لیبکے کے قول کے مطابق دیوتاؤں اور سورماؤں کی اس سرزمین (دھنی) کے خوش پوش جیالوں کی مدد قدرت نے بھی کر رکھی ہے وہ یوں کہ مواضعات بلکسر، کرسال اور جبہ بامیر میں پیٹرولیم کے چشمے بھی پھوٹ پڑے ہیں جس کی وجہ سے اس علاقے کے لوگوں کے لئے خواہ محدود پیمانہ پر ہی سہی، روزگار کے وسائل مہیا ہو گئے ہیں۔

صدر ایوب کی انقلابی حکومت کی زرعی اصلاحات سے دیہی معیشت پر کافی خوشگوار اثر پڑا ہے اب علاقہ کے جاگیرداروں کے پنجہ استبداد کی گرفت کافی ڈھیلی پڑ چکی ہے کسانوں اور مزارعین میں عزت نفس کا احساس اجاگر ہو رہا ہے اگرچہ کہ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کے عہد حکومت میں ایکٹ انتقال اراضی میں ترمیم سے زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ کی غیر انسانی و خلاف اسلام تفریق مٹا دینے کی ابتدا کر دی گئی تھی لیکن صدر ایوب خان کی فوجی حکومت نے مختلف نوعیت کی زرعی، معاشی، سیاسی و معاشرتی اصلاحات کر کے پست طبقے کے عوام کے لئے خوددارانہ زندگی بسر کرنے کے وافر مواقع بہم پہنچا دیئے ہیں واپڈا کی کوششوں سے اب دیہات میں بھی بجلی پہنچائی جا رہی ہے جس سے دیہی معیشت میں حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو جانے کی امید پیدا ہو چکی ہے تاہم بہ علاقے کی روز افزوں آبادی کی بہبودی اور خوشحالی میں مزید اضافہ کرنے کے لئے درج ذیل قسم کے چند اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔

۱:- چونکہ اس علاقہ کی زرعی معیشت کا انحصار تمام تر بارش پر ہے جو کہ غیر یقینی اور انسانی اختیار سے باہر ہے اس علاقے میں مصنوعی آبپاشی کے وسائل اپنانے اور انہیں ترقی دینے کی سخت ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لئے نالہ سواں کے منبع کے قریب پہاڑیوں میں ایک بند باندھنے کا منصوبہ مسٹر ایف۔ ایل۔ برینی بانی تحریک دیہات سدھار (۱۹۳۶ء) کے زمانہ سے حوالۂ طاق نسیاں چلا آ رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ جلد از جلد اس منصوبے پہ عمل درآمد کر کے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

2: اس علاقے میں پٹرولیم کے چشمے پہلے ہی سے موجود ہیں اور ان چشموں سے قدرتی گیس بھی کافی مقدار میں مہیا ہو سکتی ہے آج کل اس گیس کو رات دن جلا کر ضائع کیا جا رہا ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ اس گیس کو پٹرو کیمیکل انڈسٹری کے قیام میں استعمال کر کے علاقہ کے لوگوں کے لئے روزگار کے مواقع میں وسعت پیدا کی جائے. مونگ پھلی کے تیل سے بناسپتی گھی کے کارخانوں کے لئے بھی یہ علاقہ بڑا موزوں ہے ۔

3: عرصہ دراز سے علاقہ سون اور ونہار کے فوجی اور تجارت پیشہ لوگ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ منڈرہ بھون ریلوے برانچ لائن کو خوشاب تک بڑھا کر اسے ملکوال کندیاں لائن سے ملا دیا جائے تاکہ ان پسماندہ علاقوں میں ذرائع آمد و رفت کے وسائل بڑھیں اور تجارت ترقی کرے اس لائن کی توسیع سے علاقہ ڈھمن میں کپڑے کا کارخانہ کامیابی سے چلانے کے امکان روشن ہو جائینگے علاقہ تھل کے لہلہاتے کشت زاروں کی روئی اس کارخانہ میں استعمال ہو سکتی ہے نیز دفاعی نقطہ نگاہ سے بھی یہ متبادل ریلوے لائن بڑی مفید ثابت ہوگی ۔

4: تعلیمی میدان میں بھی چند ٹھوس اقدامات کرنے کی ضرورت ہے لڑکیوں کے لئے چکوال میں مزید ایک ہائی سکول کی معہ اقامتی سہولتوں کی سخت ضرورت ہے اسی طرح بھون کے لڑکیوں کے مڈل سکول کو ہائی کے درجہ تک ترقی دینے کی اہمیت بھی نظروں سے اوجھل نہیں رہنی چاہیے تاکہ لڑکیوں کے لئے علیحدہ مجوزہ کالج کے لئے نفری کا مسئلہ بخیر و بخوبی حل ہو سکے ۔

5: علم کے ساتھ ہنر کی طرف توجہ مبذول کرنا بھی متوازن ترقی کے لئے نہایت ضروری ہے اس واسطے چکوال جیسے مرکزی مقام پر ایک صنعتی یا پولی ٹیکنکل انسٹیٹیوٹ کی طرز کے ادارہ کا قیام بھی وقت کی پکار ہے

6: اس علاقے کے نوجوانوں کی اکثریت فوجی ملازمت کو دیگر تمام پیشوں پر ترجیح دیتی ہے ۔ لہذا گورنمنٹ کالج چکوال میں ملٹری سائنس کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے

تاکہ ملک کی دفاعی سرحدوں میں اس مردم خیز علاقے کے نوجوان اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کو بہتر طور پر بروئے کار لا کر ملک و ملت کا وقار بڑھانے میں زیادہ نمایاں کردار ادا سکیں۔

……

باب ۷

دھنی کی مشہور و معروف قومیں۔

قبیلے اور قومیں صرف اس لئے ہیں تاکہ باہم ایک دوسرے کی شناخت ہو سکے ان میں سے نسبی و حسبی اعتبار سے کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں۔ قرآن شریف میں آیا ہے یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ وجعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا (49 : 13) اللہ کے نزدیک بزرگی و فضیلت اُسے ہی حاصل ہے جو سب سے زیادہ نیک عمل اور پرہیزگار ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (49 : 13) اس موضوع پر احادیث شریف بھی بکثرت موجود ہیں مثلاً صحیح مسلم میں ہے کہ جس شخص کا عمل نہیں اس کو اس کا نسب کوئی فائدہ نہیں پہنچائیگا اس طرح حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ باز رہیں قومیں فخر کرنے سے باپ دادا پر جو مر گئے ان ابتدائی باتوں کے بعد گزارش ہے کہ اس باب میں جن اقوام کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کی غرض و غایت نہ کسی کی تعریف اور نہ کسی کی تنقیص ہی ہے اس کا واحد مقصد محض تاریخی دلچسپی ہے اور بس علاقہ دھنی میں مائر منہاس، مغل کسر کہوٹ قریشی، اعوان، گجر، جنجوعے اور گڈھوک شیخ قابل ذکر ہیں طوالت سے بچنے کے لئے گکھڑوں کا ذکر دیدہ دانستہ نہیں کیا جا رہا کیونکہ ان کے متعلق حال ہی میں دو کتابیں کیگوہر نامہ فارسی میں اور تاریخ گکھڑاں اردو میں شائع ہو چکی ہیں اور عام مل سکتی ہیں شائقین انہیں پڑھ سکتے ہیں لہذا اس باب میں صرف اول الذکر سات قوموں ہی کا بیان درج کیا جائیگا کیونکہ اس علاقے کی تاریخ کے سنوارنے اور بگاڑنے میں انہی قوموں کا زیادہ ہاتھ رہا ہے۔ اہمیت کے لحاظ سے مائر منہاس پہلے نمبر پر ہیں

۱:- مائر منہاس۔

یہ چکوال کے مرکز میں ہیں چکوال تحصیل کا زیادہ حصہ مائروں، میٹروں، کسروں اور

اور کھوکھوں کے پاس ہے مائروں کا کہنا ہے کہ وہ جموں کی پہاڑیوں سے آتے بابر کی فوج میں شامل ہوتے اور اس نے انہیں چکوال میں آباد کیا۔ مائروں کے جد امجد کا نام مٹھایہ منہاس راجپوت ہیں (منہاس کا مطلب زراعت پیشہ راجپوت) مہاراجہ جموں کی نسل کے ڈوگرہ ہیں۔ اس بات کے ثبوت میں وہ بیان کرتے ہیں کہ جب 1848ء میں ایک انگریز عورت مسز جارج لارنس کو انہوں نے پکڑ کر سکھوں کے حوالے کر دیا تو ان کی جاگیریں انگریزوں نے ضبط کر لیں تب انہوں نے مہاراجہ گلاب سنگھ والیئے ریاست جموں و کشمیر کے پاس ایک وفد بھیجا تھا۔ اور مہاراجہ نے وفد کی معروضات سن کر انہیں اپنا ہم قبیلہ متصور کر کے جموں میں انہیں چند دیہات دینے کی پیشکش کی۔ ان کے آباؤ اجداد جموں کے قریب آٹھ میل کے فاصلے پر پریاگ یا پرگووال نامی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ (پرگووال تحصیل اکھنور میں جموں کے مغرب میں 28 میل کے فاصلے پر منہاسوں کا بڑا مرکز ہے) جموں کے اردگرد کے راجپوت بقول مسٹر ایبٹ کے تائید کرتے ہیں کہ سورج بنسی راجپوتوں کا ایک قبیلہ منہاس کہلاتا ہے جنہوں نے زراعت کا پیشہ اختیار کر کے اپنی حیثیت کی تبدیلی کی اس واسطے انہیں راجپوتوں کی ذات برادری سے خارج کر دیا گیا۔ یہ قبیلہ راجہ پرگو کی اولاد ہے جس کی وجہ سے وہ جگہ پرگوال کہلاتی ہے۔

انہی کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس زمانے میں دھن کا علاقہ ڈوگروں کی سلطنت کا حصہ تھا اور ان کے بزرگ بھگیار دیو کو جاگیر کے طور پر دیا گیا تھا۔ بابر بادشاہ (1526 - 1530ء) کی آمد (1509ء) سے پہلے وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یہاں چلا آیا اور نئی آبادیوں کی بنیاد رکھی اس وقت علاقہ دھنی پر آوارہ خرام گوجر چرواہوں کا قبضہ تھا جن کو مائروں نے بے دخل کر دیا لیکن بے دخلی کی بات اس کے کہیں بعد جا کر ہی نما ہوتی جبکہ بھگیار دیو ایک گوجر عورت کی وجہ سے مسلمان ہو گیا۔ (مائروں کا شجرۂ نسب اس امر کی تصدیق و تائید نہیں کرتا) انہیں کے ساتھ جموں سے ان کے پروہت "سوئے براہمن" بھی آئے جو کہ چکوال میں رہا کرتے تھے

بیاہ شادیوں کے موقع پر چکوال کے چودھریوں سے وہ معمولی سی فیس لیا کرتے تھے۔
کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے ماٹر چکوال کے قریب چک بانہ ید جو کہ مزعومہ بڑی جھیل کے کنارے ایک موضع کا نام ہے میں سکونت پذیر ہوئے یہ جھیل بقول ان کے چکوال کے تمام مشرقی حصے میں اس خط تک پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں سے بھون ڈھڈیال لائن گزرتی ہے جب بابر آیا تو اس نے گھوڑی گالا کے مقام پر پہاڑ کاٹ کر جھیل کا پانی دریائے جہلم میں ڈال دیا۔ اور یوں خشک زمین نکل آئی (مفروضہ جھیل کی تمام کیفیت گزشتہ باب میں مفصل بیان کی جا چکی ہے)
ماٹر انکاری ہیں کہ چکوال تحصیل کا علاقہ کبھی جنجوعوں کے ماتحت بھی رہا سوائے اس علاقے کے جسے محال کہتے ہیں یعنے بقریب کوٹ غیلان وغیرہ جسے چودھری جہاں خان نے صاحب خان جنجوعہ سے چھین لیا تھا یہ جہاں خان چکوال اور کوٹ غیلان (جو کہ اب کوٹ چودھریاں کہلاتا ہے) کے ماٹروں کا مورث ہے ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جنجوعوں کی ماتحتی کا تو کیا ذکر انہوں نے تو ایک دفعہ پنڈ دادنخان کے میدانوں تک کا علاقہ جنجوعوں سے چھین لیا تھا۔
تاریخ اقوام کشمیر از منشی محمد دین فوق کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ راجہ جو گرواج والیئے ملک جموں کے دو بیٹے تھے۔ بڑا ملن ہنس یا من پرکاش اور چھوٹا سورج ہنس ملن ہنس کے متعلق ایک روایت ہے کہ اس کی اولاد نے راج پاٹ کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی بجائے ہل پکڑ لیا دوسری روایت یہ ہے کہ خاندان جموال میں ہل چلانا منع ہے اس لئے ملن ہنس اور اس کی اولاد سے جس جس نے ہل چلایا وہ منہاس مشہور ہو گئے راجہ ہری سنگھ والیئے جموں کشمیر جو گرواج سے ۷۳ ویں پشت میں تھا
علاقہ دھنی میں ماٹر عموماً چودھری کہلاتے ہیں لیکن ریاست جموں میں ڈوگرہ راجپوت میاں کے لقب سے پکارے جاتے ہیں آج کل ٹھاکر کہلاتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں پہلے جکاریہ جو آپس میں بیٹی تو بیاہ دیتے ہیں زراعت کرنے کو کسر شان خیال کرتے ہیں دوسرے سلامیہ

جبکاریہ ان سے ملتے وقت جے دیو کے جواب میں رام رام بولتے ہیں یہ راجپوت ہل چلاتے رہیں اور اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔ یہ آپس میں ملتے وقت جے دیو نہیں کہتے بلکہ سلام کہتے ہیں یہ دونوں ایک ہی نسل سے ہیں لیکن جبکاریہ اپنے آپ کو اعلےٰ خیال کرتے ہیں سلامیہ کی لڑکیاں لے لیتے ہیں مگر انہیں دیتے نہیں۔ وہ انہیں اکہرہ یعنی یک طرفہ راجپوت بھی کہتے ہیں۔

تاریخ راجپوتان از ٹھاکر کاہن سنگھ میں جموال کا اصلی نام جامبو لوچن ابن اگنی یا اگنی برن والیئے اجودیہ آیا ہے اور لکھا ہے کہ جموال راجپوتوں کے تین درجے ہیں جبکاریہ راجپوت درجہ اول میہناس اور چب درجہ دوم کے راجپوت ہیں

کوٹ خیسلاں جسے کہ اب کوٹ چوہدریاں کے نام سے پکارا جاتا ہے کے چوہدری اپنی لڑکیوں کی شادی اپنے گاؤں کے بعض جو جاٹوں کی برائے نام اجازت کے بغیر نہیں کرتے اور انہیں وہ شادی بیاہ کا نذرانہ بھی ادا کرتے ہیں کہا جاتا ہے کہ چوہدریان کوٹ کے اجداد میں سے کسی نے ان جاٹوں کو ان کے کسی حریف سردار کو قتل کر دینے کے صلے میں یہ حق مدت مدید سے عطا کر رکھا ہے۔ یہ لوگ اپنا شجرہ نسب بھگیا دیو کے لڑکے رتن دیو سے آگے یوں چلاتے ہیں۔

بھگیا دیو ← رتن دیو ← لکھمن ← للوا

سگھر خان (دبون، پک بھن)
↓
مرید ، گگل، چنگ، دیال، ملوک ، جیکو خان ، ویر خان
جمال، پنوال، میانمیر، سروان

میگھا
بھولا
ما
چوہدری سوہر
↓
کرمن

بھٹ

چکوخان — پیرخان — کرہن

جہان دیو (ڈھوک ماملیاں) — گھیروخان

راجوگی خان — میاں قطب (اودھروال)

(چکومل کوٹ خیلان
نگھہ رجبر لودھ چک نمبر
تھوہا مہایوں تترال
چک لونگ چک گھگھڑ
دھنال ڈھاب)

لتوخان — شیروخان (دادیوال رہال)

واسن خان (سرکال چکوال پنجابن) — عباس خان (بھین پادشاہان)

(منقول از ڈسٹرکٹ گزیٹر جہلم)

یہاں سے بیگیاردیو تک ۲۵ نسلیں بنتی ہیں بروایت چوہدری فتح خان چکوالیہ مائر پہلا شخص تھا جو دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔ اور مائر سے وہ اپنا شجرہ نسب یوں ملاتے ہیں۔

مائر ← سدھر ← چکو ← گھنو ← راجوگی ← ابن سپکشم ← بھٹ ← تاجا (تاج الملوک)

شاہ بیگ — گکھڑ — گدا بیگ

اللہ داد خان — فتح محمد — اجبری خان — فاضل خان — علیشاہ

ان دونوں شجرہائے نسب سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہڑہ ہی شخص ہے جو ڈسٹرکٹ گزیٹیر جہلم میں درج شجرہ نسب کی رو سے بھوا ہے بھوا یا ماہڑ کے درمیان چھ پشتیں حائل ہیں

تقسیم ملکی (۱۹۴۷ء) سے قبل منہاسوں کی آبادیاں سرحد ریاست جموں کے ساتھ ساتھ بکثرت تھیں ان کی کافی تعداد راولپنڈی گجرات سیالکوٹ اور گورداسپور کے اضلاع میں آباد تھی تحصیل چکوال کے مسلمان منہاسوں کے علاوہ ضلع ہوشیار پور کے گاؤں ماتی پور کے منہاس بھی مسلمان ہو گئے اور انہوں نے کپڑا بننا شروع کر کے شیخ کہلانا شروع کر دیا۔ راجپوت ان سے ملتے جلتے ہیں اور انہیں بھائی کہتے ہیں لیکن ان کے ساتھ بیاہ شادی نہیں کرتے ضلع ہوشیارپور کی تحصیل اونہ میں بھی منہاسوں کے چند گاؤں ہیں شاہ پور اور ساہیوال (منٹگمری) میں منہاس راجپوت ہندو تھے۔ ماہڑ کوہستان سندھ میں بھی آباد ہیں۔ ان کی بستیاں دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر ہیں جن کے نام بینکر، داتر۔ پٹن۔ رسیو اور کندیاس ہیں۔ پٹھان انہیں ماہڑ کہتے ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو مائین کہتے ہیں۔ کوہستانی قبائل میں یہ لوگ سب سے زیادہ غریب ہیں ان کی اپنی ایک خاص بولی ہے اور سوائے اپنے لوگوں کے دوسروں کے ساتھ بیاہ شادی سے انکار کر دیتے ہیں۔ (بڈلپ، ہندوکش کے قبائل انگریزی صفحہ ۱۲)

ریاست نابھہ میں سناروں کی ایک گوت بھی ماہڑ ہے جو اپنے آپ کو راجپوت بتاتے ہیں۔ یہ لوگ مہر اور ماتی پوترہ بھی کہلاتے ہیں ان راجپوتوں نے سنار کا پیشہ اختیار کر لیا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ماہڑ اور ٹانک کشتیریہ راجپوت مہا بیگ سبھا موجود تھی۔ ان کے قبیلے دھلہ (جھنڈا اٹھانے والے) جوڑا، بابر، سور وغیرہ کہلاتے ہیں (بحوالہ فرہنگ قبائل واقوام پنجاب و سرحد انگریزی، جلد سوم صفحہ ۷۰-۴۵۹)

بروئے ایکٹ انتقال اراضی پنجاب مجریہ سنہ ۱۹۰۱ء ماہڑ اور منہاس دو الگ الگ قومیں ہیں یہ واضح تفریق موضع بادشاہان میں دو مختلف پٹیوں کی صورت میں اب تک موجود ہے سنہ ۱۹۵۵ء سے پہلے یہ تمام لوگ ماہڑ یا جٹ ماہڑ تھے اس کے بعد ہائیکورٹ کے بعض فیصلوں میں ماہڑ منہاس یا ماہڑ بینا درج ہیں لیکن سنہ ۱۹۴۰ء کے بعد یہ سب ماہڑ منہاس

راجپوت درج ہورہے ہیں چوہدریان چکوال اور کوٹ اپنے آپ کو ترڑ، اور دوسرے ہم قوموں کو زمیندار کہتے ہیں۔

مائرکی قبر موضع میانمیر میں ہے۔ اور یہ پہلے حمیداں کے مقام پر مسلمان ہوا تھا۔ بروایت میجر جنرل محمد اکبر خان ہندوستانی رسالہ ان کے دادا جہان خان نے کھڑا کیا تھا۔

علاقہ دھنی میں اپنی آمد کے متعلق جتنی زبانی روائیتیں یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کی تائید تاریخ سے نہیں ہوتی۔ مثلاً تزک بابری میں جس منہاس کا ذکر ہے اس کا نام برم دیو ہے۔ لیکن ان کے پاس جو شجرہ نسب ہے اس میں برم دیو کا ذکر تک نہیں تزک مذکور میں واقعات ۹۳۲ھ کے تحت درج ہے۔

غازی خان والیئے بلوٹ کے سراغ کے لئے تردی بیگ کو برم دیو منہاس کے ساتھ مقرر کیا۔

آئین اکبری کے موجب ملوکی دھن پر قبضہ گکھڑوں کا ظاہر ہوتا ہے تاریخ بندوبست ضلع جہلم سے واضح ہورہا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد جب شہزادہ محمد معظم اور شہزادہ محمد اعظم میں لڑائی ہوتی اور گکھڑ قوم کے سردار سید خان نے محمد معظم کے خلاف محمد اعظم کو مدد دی اور محمد اعظم اس جنگ میں مارا گیا۔ تو محمد معظم نے بادشاہ ہو کر اپنا نام بہادر شاہ رکھ کر سید خان گکھڑ کو یہ سزا دی کہ اس کے مقبوضات اس سے چھین کر مائر اور کسر قوم کے سرداروں کو دے دیئے جہاں ان اقوام نے رفتہ رفتہ اپنے مقبوضات کے کل حقوق وارثت اپنے تصرف میں کر لیئے (بحوالہ تاریخ اقوام پونچھ وکشمیر از منشی محمد الدین فوق جلد اول صفحہ نمبر ۱۴۰) گویا جلال الدین اکبر (1556-1605ء) کے عہد سے لے کر بہادر شاہ (1707-1712ء) کے عہد تک علاقہ دھنی کے مالک گکھڑ تھے۔ سکھوں کا ساتھ دینے کی وجہ سے ان کی جاگیریں بطور سزا کے چھین لی گئی۔ پھر غدر 1857ء میں انگریزوں کا ساتھ دے کر خدمات شائستہ بجالانے کے بدلے میں ان کے کچھ حقوق علاقہ دھنی میں بحال کئے گئے۔

اس خاندان کو دنیاوی وجاہت کے ساتھ ساتھ روحانی دنیا سے بھی حصہ ملا ہے۔ باوا گدا بیگؒ بذاتِ خود بھی ایک صاحبِ دل بزرگ تھے۔ انہوں نے قاضی حافظ فتح نورؒ کے ساتھ مل کر سدھ چکوال میں غالباً سب سے پہلی مسجد بعہد عالمگیر بادشاہ (1659ء - 1606ء) بنائی جو کہ آج تک "بگی مسجد" کے نام سے قائم چلی آرہی ہے۔ آپ کے علاوہ باوا عبدالشکورؒ موضع اوڈھروال بھی ایک خدا رسیدہ بزرگ اور عالم اسی خاندان سے ہو گزرے ہیں۔ ان کے بارے میں لالہ ہرکرن داس نے تاریخ خاندان کہور سدوال میں ایک دلچسپ واقعہ درج کر رکھا ہے جس کا ملخص یہ ہے :-

سکھوں کے عہد میں موضع سدوال کے سرداروں میں سے چوہدری فتح محمد خان (کہوٹ ؟) ایک سربرآوردہ شخص ہو گزرا ہے۔ اس کی شہرت سے جل کر موضع دلہہ کے کہر سردار اس کے جانی دشمن ہو گئے انہوں نے کسی تقریب پر اسے موضع دلہہ میں مدعو کیا چوہدری مذکور جب وہاں پہنچا تو آدھی رات کے قریب ان کو فریب سے قتل کر دیا گیا۔ ان کے قتل کا واقعہ یوں ہے کہ چوہدری فتح محمد خان علاقہ دھنی اور دیگر بہت سے علاقے کی مالگزاری وصول کر کے مہاراجہ رنجیت سنگھ (1799ء - 1839ء) کے حضور داخل کیا کرتا تھا۔ موضع دلہہ کو جاتے ہوئے راستہ میں موضع اوڈھروال کے باشندوں کو حکم بھیجا کہ ہماری دلہہ سے واپسی پر اگر سرکاری خراج تیار نہ رکھا تو ہر چھوٹے بڑے کو باندھ کر کانٹے دار جھاڑیوں پر پھینک دیا جائیگا حکم حاکم مرگ مفاجات موضع مذکور کے لوگ اس خوفناک حکم سے سخت ڈرے اور حضرت میاں عبدالشکورؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر فریادی ہوئے مولانا ممدوح نے سر بسجود ہو کر چند سکوت کے بعد فرمایا چوں شب درمیان است عترس از بلا جو واپس آئیگا تو تم کو سزا دے گا۔

جب چوہدری فتح محمد خان دلہہ میں بوقت شب قتل ہو گیا۔ تو ان کے ایک وفادار اور دلیر ملازم مشیر ڈھیرا اہل سکنہ سدوال نے ان کی لاش کو ایک کمبل میں باندھ لیا اور

اور گٹھڑی نیا کر سر پر اٹھا کر سدوال کی طرف روانہ ہو پڑا دوسرے روز جب لاش اڈھوال کے پاس سے گزری تو میاں صاحب نے دیکھ کر اپنے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے فرمایا کہ وہ چوہدری فتح محمد خان جا رہا ہے۔ لوگ اس کرامت سے بڑے متاثر ہوئے اور مولانا ممدوح کے معتقد ہو کر ان کے خاص مرید ہوئے خاص کر چوہدریاں موضع سدوال۔

تذکرہ روسائے پنجاب میں اس قوم کے کسی فرد کا کوئی ذکر نہیں پاکستانی فوج کا سب سے پہلا میجر جنرل محمد اکبر خان اسی خاندان کا چشم و چراغ ہے علاوہ ازیں میجر جنرل محمد افتخار خان مرحوم میجر جنرل محمد اللہ خان میجر اللہ داد خان سابق کمشنر لاہور۔ سردار اورنگ زیب خان سابق ڈپٹی کمشنر۔ صوبیدار خدا داد خان وکٹوریہ کراس، سردار غضنفر حیات خان۔ ایم این اے وغیرہ اس قبیلے کے ممتاز افراد ہیں الحاج راجہ محمد سرفراز خان فی الحقیقت سربراہ قبیلہ ہے۔

علاقہ دھنی میں اس قبیلے کی بستیاں یہ ہیں :-

بھکاری کلاں۔ پنن سکھ، موہڑے، ستال۔ بوبے زیرا بھون، دھیدوال۔ کیسوال، مٹھیال رباں، سرکال ساہڑ۔ گھکل۔ بوڑیال۔ پنجائن کمدیتی تمیال، چک ملوک۔ ادھوال۔ چکرال کریہن۔ ڈب، جبیر پور۔ لوردال۔ بینوال۔ چک بازید۔ چک نور نگ۔ سنیال میرہ پر چہار ڈھلب، بھکڑی، بیکوال، ستوال، کھوہا ہمایوں، تترال۔ جبوال۔ ڈھکوہ، بوے بالا چک بھون۔ جوماترہ۔ چک عمرا۔ دومال۔ بادشاہانی وغیرہ۔

۷:- مغل کسر

یہ قبیلہ تحصیل چکوال کے شمال مغربی گوشے میں آباد ہے۔ ۱۸۵۱ء تک تو کسر اپنے آپ کو راجپوت کہتے تھے۔ اور اپنا اصلی وطن جموں بتاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ بابر کی فوج میں سکونت کے باعث انہیں یہ علاقہ ملا لیکن ۱۸۸۱ء کی مردم شماری میں ان میں سے اکثر نے اپنے آپ کو مغل درج کرایا اب شجرہ ہائے نسب میں مغلوں اور کسروں کا نسب ایک ہی دکھایا جاتا ہے۔ ان کی روایت ہے کہ دراصل وہ الیشاہ کو چک میں کنعان

کے رہنے والے تھے ۔ وہاں سے ترک سکونت کر کے غزنی آ گئے اور وہاں برصغیر میں مغلیہ سلطنت کے بانی کے آباؤ اجداد کے ساتھ مدتوں اکٹھے رہتے رہے تاآنکہ ۱۵۲۶ء میں جب ظہیر الدین بابر ہندوستان پر حملہ آور ہوا ۔ تو اس وقت یہ لوگ بھی اس کے ہمراہ تھے ۔ اس وقت ان کے اجداد میں عزفا اور رعبین (یا ببول) موجود تھے یا بقول بعض جھجھ لاتی اور کاول شخص

تمام متفق ہیں کہ عزفا موضع حطار نزد ڈھوک پہلی داخلی بلکسر ایک ٹیلے پر مدفون ہے ۔ اور دراصل اس علاقے میں ان کی پہلی آبادی اسی مقام پر قائم ہوئی ۔ دھنی اس وقت آوارہ خرام گوجروں کے پاس تھی اور جنوب کی پہاڑیاں ، چنگس خان جنجوعہ کے قبضے میں تھیں ۔ جو کہ قلعہ سمرقند نزد موضع میرا میں رہتا تھا ۔ دھنی کا مغربی حصہ بابر نے انہیں اس شرط پر عطا کیا کہ وہ اس کے مشرقی حصے کو خشک کر دینگے جو کہ اس وقت زیر آب تھا ۔ یہ کام انہوں نے پورا کیا ۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ چنگس خان جنجوعہ کی ایک پیاری گھوڑی گم ہو گئی تھی جسے کسروں نے تلاشش کر کے ان کے حوالے کر دیا چنانچہ عزفا کو بطور انعام جنوب مغرب کا مزید علاقہ بھی دے دیا گیا ۔ ان کا دعویٰ ہے کہ آئین اکبری میں جو دھن کے علاقے کو ملوکی دھن لکھا گیا ہے ۔ وہ اصل میں ملوکی دھن ہے کتابت کے وقت بے احتیاطی کے باعث ب کا نقطہ گر جانے کی وجہ سے ببو کی بجائے ملو بن گیا ہے بلکہ ان کا مورث اعلیٰ تھا جس نے ایک اور موضع کی بنا ڈالی جس کا نام بلکسر ہے ۔ لیکن جنجوعہ لوگ ان کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دراصل یہ مالا کی دھن ہے ۔ بلوٹ کے راجہ مل کی رعایت سے ۔

تاریخ گکھڑاں صفحہ ۷۵ پر ملوکی دھن کی وجہ تسمیہ ایک اور طرح سے یوں بیان کی گئی ہے ۔ لکھا ہے کہ ملک دھن اب جس جگہ موجود ہے ایک وقت وہاں کشمیر کی طرح زیر آب تھا ۔ اور یہاں کوئی جگہ آباد نہیں تھی ۔ بابر بادشاہ نے اس قطعہ زمین کو پسند کیا اور

ملوک چند نامی کو جو اس کا قانون گو تھا حکم ہوا کہ وہ اس تمام پانی کو دور کرے اور اس سرزمین کو آباد کرے ملتفت الیہ نے حسب الحکم گھوڑی گالا کے مقام سے بند کاٹتے ہوتے پانی کو بہا کر علاقہ کو خشک کیا اور قلیل عرصہ میں اس علاقہ میں مختلف دیہات آباد کئے شاہ موصوف اس علک کو آباد دیکھ کر نہایت خوشش ہوا اور زبان مبارک سے ملوک چند کی توصیف میں یہ فقرہ کہا کہ "دمن ملوک چند" چونکہ سخن شناہ لی بادشاہ سخن ہوتے ہیں اس وجہ سے اس وقت سے لے کر اب تک اس ملک کا نام دمن ملوکی مشہور ہو گیا۔ نیز بادشاہ نے حکم دیا کہ یہ عسلاقہ ہمیشہ براہ راست صوبہ دہلی سے منسلک رہیگا۔

یہ ایک نئی شہادت ہے جو نہ جنجوعوں کی نائید کرتی ہے اور نہ کسروں کی بلکہ شیخ گدھوکوں کی تائید کرتی ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ملوک چند کون تھا۔؟ گدھوکوں کا شجرہ نسب تو کالک داس یا کالی داس بن چند وغیرہ بتاتا ہے میری تحقیق کے مطابق دمن یا ڈمن دہیلا کا قصہ ہی من گھڑت ہے صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس علاقہ اور گردونواح میں چونکہ جنجوعہ کی قوم بہت قدیم ہے اس واسطے ان کی روایت قابل ترجیح ہے۔

کسر یہ بھی کہتے ہیں چونکہ وہ مغلوں کے حکمران خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس واسطے وہ خود حملہ آوروں کو اس علاقے سے دور رکھتے تھے لیکن سکھوں کے عہد میں اثر ورسوخ کم ہو گیا اور ملوکوں کا بڑھ گیا کیونکہ ماثر راجہ جمول کے ہم قوم تھے البتہ انہیں اعتراف ہے کہ کھوٹ بابر کی فوج کے ہمراہ آئے۔ اور اسی دوران میں ان کے ہمراہ اسی علاقے میں آباد ہو گئے۔ حالانکہ سکھوں کے عہد تک یہ ناقابل ذکر تھے کسر اپنا پیشہ حکومت بتاتے ہیں یہ بھی ماثروں اور کھوٹوں کی طرح اپنے آپ کو چوہدری (چودھری) ہی کہلاتے ہیں حالانکہ مغلوں کے دوسرے قبیلے چغتائی اور برلاس اپنے آپ کو مرزا کہلواتے ہیں۔

ان کی ایک عجیب رسم یہ بھی ہے کہ ان کی عورتوں کی قبروں کے سرہانے اور پائینتی کے پتھر قبر کی چوڑائی کے متوازی اور مردوں کی قبروں کے پتھر لمبائی کے متوازی گاڑے جاتے ہیں۔ دولبہ ان کا مرکز ہے یہ سابق پنجاب کے کسی اور حصے میں نہیں پائے جاتے ہیں۔

ابٹسن رپورٹ مردم شماری صفحہ ۵۰۶ پر بیان کرتا ہے کہ ۱۸۸۱ء تک یہ سلسلہ کوہستان نمک کی ان عجیب و غریب اقوام میں سے ایک تھے جو اپنے آپ کو راجپوتوں، اعوانوں اور مغلوں میں سے کسی ایک میں بھی شمار نہ کرتے تھے لیکن بورنگ کے قول کے مطابق انہوں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ وہ راجپوت ہیں۔ اور ان کا اصلی وطن جموں ہے۔

(بحوالہ فرہنگ اقوام و قبائل پنجاب و سرحد، جلد دوم زیر کلمہ K) ان کی قانونی پوزیشن بھی یہ ہے کہ ۱۹۴۰ء تک یہ لوگ بھی صرف کسر یا جٹ کسر تھے لیکن ۱۹۴۰ء سے مغل کسر درج ہونے لگے اس ضمن میں ایک بڑی دلچسپ روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ چوہدری زمرد خان تحصیلدار (مرحوم) ساکنہ بستی بہال (مطفیال) نے راولپنڈی میں کچھ اراضی خریدی وہاں پر اعتراض ہوا کہ چونکہ ضلع راولپنڈی میں کسر زراعت پیشہ نہیں ہیں۔ اس واسطے انتقال، اراضی اس کے حق میں نہیں ہو سکتا وہ ان دنوں مسٹر تھا پر مہتمم بندوبست جہلم کی پیشی میں تھا اور کہا جاتا ہے کہ دھوکہ سے اس نے مہتمم بندوبست سے ایک سرٹیفکیٹ پر دستخط کروا لیے کہ یہ شخص مغل کسر زراعت پیشہ قوم سے ہے چنانچہ یوں ۱۹۴۰ء کے بندوبست اراضی کے بعد یہ صرف کسر سے مغل کسر بن گئے۔

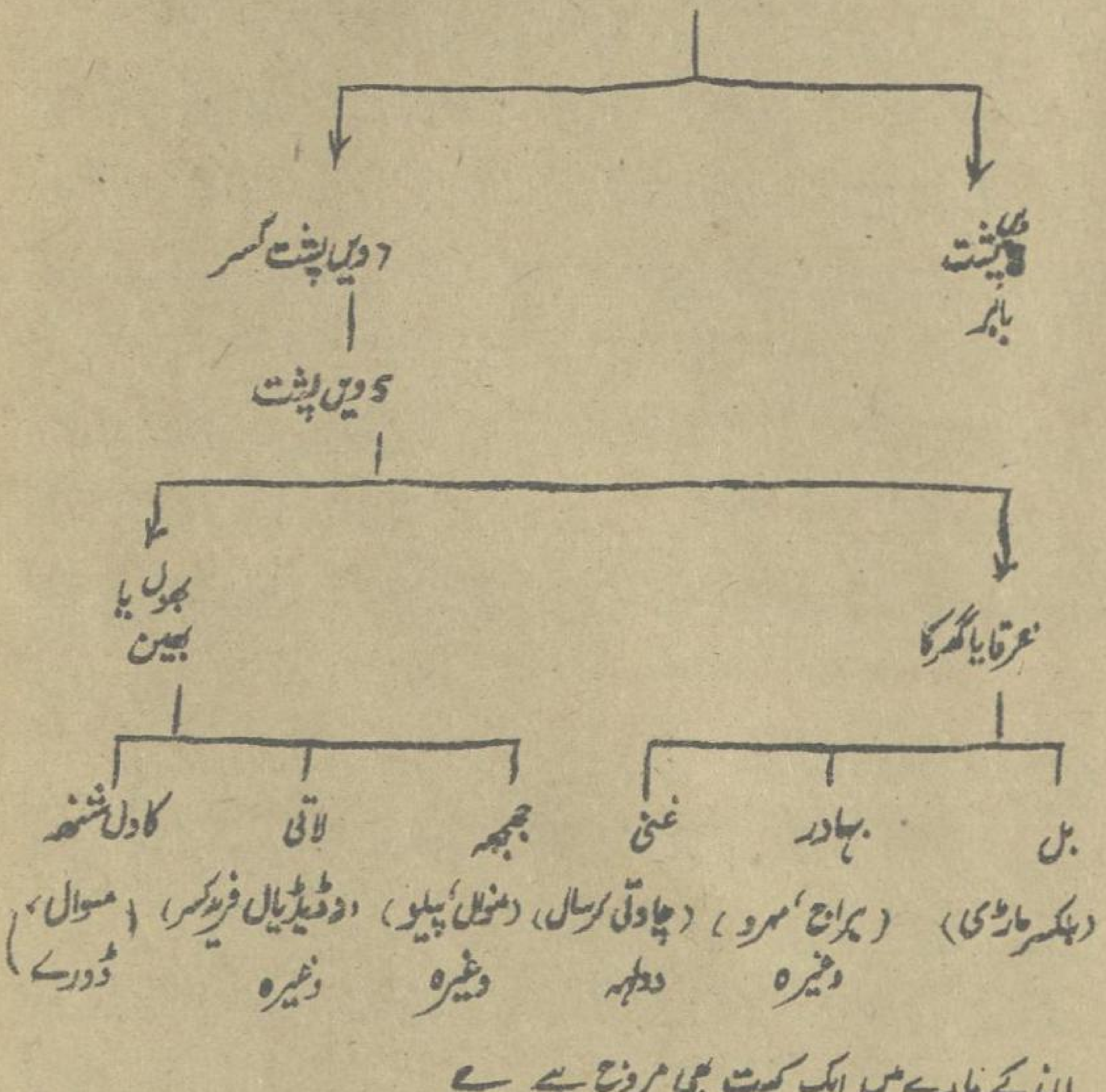
لفٹیننٹ کرنل وائی کلی اپنے کتابچہ "پنجابی مسلمان" (انگریزی) کے صفحہ ۶۷ پر ابٹسن کی طرح لکھتا ہے کہ ایک وقت تھا کہ کسر اس بات کے لئے مشہور تھے کہ یہ ایک ایسا قبیلہ ہے جو اپنے آپ کو راجپوت اعوان یا مغل نہیں کہلاتا تھا لیکن مولوی محمد مالک خان رئیس کھوڑی ضلع گجرات اپنی محققانہ کتاب "دو غاتان گوجر" کے صرف صفحہ ۱۹۶ پر لکھتا ہے کہ کسر راجپوتوں کی ایک گوت ہے۔

تزک بابری میں ۹۳۵ھ کے واقعات کے تحت درج ہے :-

وہ اگلے سال محرم کی آخری مہینے میں اتوار کے دن دسویں تاریخ بلگکسر دیسی ماغری اور بیان شیخ (ہمایوں کا نوکر) دونوں حاضر ہوتے۔ بلگکسر ہمایوں کے بیٹے کی خوشخبری لایا کسروں کی روایت شاگردوں کے برہم دیو منہاس کی طرح، ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کے

آبا و اجداد میں سے غرقا ، بھین یا جھجھ ۔ لاتی اور کادل شنہ وغیرہ بابر کے بھیجے تھے اور نہ ہی ان کے شجرہ نسب میں کسی ہلکسر کا ذکر ملتا ہے ۔ ان کا شجرہ نسب ڈسٹرکٹ گیزیٹیر ضلع جہلم کے مطابق یہ ہے

۱۱- بجل نومیں یا نوتیاں ا



ان کے بارے میں ایک کہاوت بھی مروج ہے ۔

جھجھ میا بابر بادشاہ کہار تمبو تانے ۔ بھین تے غرقا کسر دونویں نال آگئے ۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے تاریخ میں ان کا نام پہلی بار ماڑوں کے ساتھ ، بہادر شاہ ابن ابی شجرۃ الاتراک میں ، کالا نوھیان ، چنگیز خان کے جرنیلوں میں سے ایک تھا ۔ ۱۲ ان سے کسروں کے شجرہ نسب میں متعدد منگولی نام بھی ملتے ہیں مثلاً تموچہر ، نند پرس وغیرہ منگولی ناموں میں جہاں دیو کا نام بھی آتا ہے ۱۲۰

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں یہی آیا ہے پھر سکھوں کی دوسری لڑائی (1848ء) کے وقت
یہ انگریزوں کے طرفدار رہے اس واسطے ان کی جاگیریں برقرار ہیں چوہدری سلطان سکندر
مرحوم، سکنہ دلہہ انگریزی عہد میں بڑا بلند اقبال شخص ہو گزرا ہے برادران دلہہ و بلکسر
بھی اپنے آپ کو ترڈ اور دیگر کسروں کو جٹ زمیندار کہتے ہیں۔

علاقہ دھنی میں دلہہ کے علاوہ ان کی دوسری بستیاں یہ ہیں :-
بھکاری خورد، ہراج نارنگ، نروال، لطفیاں، سکریالہ، منگوال، رکھوال، ڈنگی،
مہرو، بھگوال، کرسال، چاولی، بلکسر، بھکیاری کلاں، مارڑی، کوتہ ڈواں، منواں، ڈیرہ
مکھوال، راول، بلوکسر، سرٹہال، ستوال، مذوال، اچھرال، مولی، واسو، سرال، مانگ، پڑھال
، ڈھڈیال، فرید کسر، موہنہ ویروال، مسوال، ڈوڑے وغیرہ۔

خاندان دلہہ میں سردار محمد اشرف خان ایم پی اے اور خاندان بلکسر میں کرنل محمد خان
ایم اے مشہور ہستیاں ہیں لیکن ان سے پہلے کی نسل کے کسی فرد کا "تذکرہ روسائے پنجاب"
میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔

3: کہوٹ قریش

تحصیل چکوال میں کہوٹ زیادہ تر علاقہ کہوٹانی جنوبی چکوال میں پائے جاتے ہیں۔ مسٹر ابٹسن رپورٹ
مردم شماری میں لکھتا ہے کہ کہوٹ مائروں کی طرح اپنی آمد جموں کی پہاڑیوں ہی سے بتاتے ہیں
اور کہتے ہیں کہ بابر بادشاہ نے انہیں چکوال میں آباد کیا وہ انہیں راجپوتوں میں شامل کرتا
ہے حالانکہ بقول خود ان کے یہ عرب کے قریش ہیں۔ اور کہوٹ ان کا جد بختار سنہ 1359ء
میں ان کا ایک بزرگ سید نواب علی فیروز تغلق کے عہد (1351ء - 88) میں
دہلی آیا راستے میں انہوں نے ایک کافر بادشاہ سائیں پال والیٔ سیالکوٹ کو شکست دی،
جو غالباً ڈوگرہ تھا دہلی پہنچنے پر بادشاہ کا سلام کیا اس نے انہیں کوہستان نمک
اور دھنی کی حکومت سپرد کی کہوٹ ابن نواب علی کی زیر قیادت یہ اس علاقے میں واپس
آتے اور پہلے پہل کوہستان نمک کے دامن میں موضع وریامال کے قریب گگنیل کور جس کے

آثار کھنڈرات کی شکل میں اب تک موجود ہیں آباد ہوئے یہاں پر کچھ مدت تک مقیم رہے پہاڑ کے جنجوعوں اور دھنی کے گجر چرواہوں سے مالیہ اکٹھا کر کے دہلی کے بادشاہوں کو بھیجتے رہے اس وقت تک مائر اور کسر اس علاقے میں نہیں آئے تھے بلکہ بقول ان کے چھ سات پشتیں بعد آئے۔

ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ مشرقی دھنی اس وقت جھیل کی صورت میں تھی جو کہ بابر بادشاہ کے زمانے میں خشک کی گئی کہوٹوں نے اس کام کو سرانجام دیا اور اس علاقہ کو آباد کیا بابر کے وقت کہوٹ کی ۵ ویں پشت میں چوہدری سہنسر یا سینسار ان کا مورث تھا۔

مراسی بابر بادشاہ کے کلر کہار سے گزرنے کے متعلق کبت سناتے ہیں جس کے دو مصرعے تو کسروں کے لیتے ہیں اور تیسرا مصرع ان کے لیتے لیکن اسکی چول ٹھیک نہیں بیٹھتی (وہ کبت ہی کیا ہوا جس کی چول ٹھیک بیٹھ جاتے) کسروں کا کبت تو ان کی فصل میں درج کیا جا چکا ہے ان کے بارے میں یہ ہے ؎-

کہوٹ پوترے ابوطالب دے اوّل آتے -

ان کی شان میں ایک کبت اور بھی ہے۔ ؎

کہوٹ چڑھیا دلیپوں ست سار نقارے

چار ہزار بھرا تے کیمن سارے -

کہوٹ دھونا سرخرو ہویا

سینا چندل سارے -

دھونا ایک کہوٹ سردار کا نام بتایا جاتا ہے۔

فرہنگ اقوام و قبائل پنجاب و سرحد، انگریزی" زیر کلمہ ک (K) ، ان کے متعلق یہ لکھا ہے:-

کہوٹ ایک جاٹ قبیلہ ہے زراعت پیشہ ہے یہ شاہ پور گجرات راولپنڈی، ہزارہ اور جہلم میں پائے جاتے ہیں ضلع راولپنڈی کی کہوٹہ پہاڑیوں کا نام انہی کا دیا ہوا ہے (اب ان

پہاڑیوں پر کٹوال اور دھنیال کا قبضہ ہے)، اسی طرح قصبہ کہوٹہ کا نام بھی انہی کا دیا ہوا ہے جو کہ اب جنجوعوں کے زیر تصرف ہے ان دنوں یہ سلسلہ کوہستان نمک میں پائے جاتے ہیں اور تحصیل چکوال کے علاقہ کہوٹانی کا نام انہی کی نسبت سے ہے سب سے پہلے یہ گنگیل پور نزد دریا مال میں آباد ہوئے۔

صاحب تاریخ خاندان کیعدانِ سدوال صفحہ ۴۲ - ۹۵ پر ان کی آمد کے متعلق ایک مزیدار کہانی درج کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ خاندان عباسیہ (749 - 1158ع) کے عہد میں جب دارالسلطنت بدل کر (عرب) سے بغداد آگئے۔ تو امیر تیمور گورگان صاحب قران (۷۶۱ - ۸۰۷ھ / 1366 - 1405ع) نے بغداد پر حملہ کر کے حکومت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ خلیفہ خود مصر میں شاہان مملوک کی پناہ میں آگیا۔ باقی قومیں ایران، سندھ، ہندوستان وغیرہ میں آباد ہو گئیں اس اثنا میں کہوٹ، اعوان (اعوان) اور کسر جنوعہ اول الذکر دو تو عرب ہیں اور موخرالذکر ایرانی ہے اٹھارہویں صدی کے آخر میں درہ گومل سے گزر کر دریائے سندھ کو عبور کرنے کے بعد یہیں سہی وپیش میں آباد ہو گئیں اور لوٹ مار پر گزارہ رکھا جہاں تک معلوم ہوتا ہے۔ یہ قومیں کسی درانی بادشاہ کے ساتھ ادھر کو آئیں قوم کہوٹ پہلے پہل نکہ کہوٹاں (تحصیل تلہ گنگ ضلع کیمبلپور) میں آباد ہوئی قوم کی زیادتی کی وجہ سے جب وہاں گنجائش نہ رہی تو نئے علاقہ کی تلاش ہوئی علاقہ دھنی جو پہلے ایک جنگل تھی اور شاہزادہ ہمایوں نے اس کا پانی گھوڑی گالا متصل جہلم سے نکلوا کر علاقے کی زمین کو لائق آبادی کرا دیا۔ اس پانی کا اخراج بحکم شاہزادہ ہمایوں موضع ڈلوال کے ایک لائق دیوان کی معرفت سر انجام ہوا۔ شہزادہ ہمایوں کا اس علاقہ میں آنا ایک اور بات سے بھی ثابت ہو رہا ہے کہ قلعہ ہمایوں جو کہ اب ایک گاؤں ہے اس کا نام اسی وقت سے ہوا یہاں غالباً اس نے ڈیرہ ڈالا تھا اس وقت گوجر قوم اس قطعہ ارضی پر قابض تھی۔ جب کہوٹوں نے اس خوشگوار علاقے کو دیکھا، تو اس کی فتح کے منصوبے گانٹھے چنانچہ کئی ایک لڑائیوں کے بعد طرفین میں یہ قرار پایا کہ بجائے لڑائی جھگڑے کا جھنیا زبردست ہو علاقہ اس کو ملے یہ شرط قرار پا کر

ہر دو طرفوں سے بھینسے بن بن کے نکلے اور لڑنا شروع کر دیا کہتے ہیں کہ وہ نظارہ عجیب تھا۔ تجویز بھی کسی نہایت ہی خیر اندیش کی تھی کہ خونریزی کے بغیر علاقہ فتح ہو آخر کا کھوکھروں کا بھینسا زبردست نکلا اور اس طرح یہ علاقہ ان کے ہاتھ لگ گیا غالباً یہ لڑائی موضع جنگہ (جنگ گاہ) کے قریب ہوئی تھی۔

آنا فاناً کھوکھروں کی کثیر تعداد اس سرزمین میں آباد ہو گئی کھیتی باڑی کرنا مویشی پالنا اور لوٹ مار کرنا پیشہ اختیار کر لیا۔ گجر قوم علاقہ کہون، جھنگڑ اور جالپ میں جا آباد ہوئی لیکن جلدی اقوام جنجوعہ وغیرہ نے گوجروں کو وہاں سے علاقہ گجرات وغیرہ کی طرف دھکیل دیا ۱۹۶ سنہ (بعہد مہاراجہ رنجیت سنگھ) کے قریب کھوکھر اپنے مقبوضہ علاقہ دھنی میں اچھی طرح زور پکڑ گئے چونکہ اس وقت مغلیہ سلطنت دم توڑ رہی تھی۔ اور درانی بادشاہوں کا زور ہو چکا تھا۔ شمالی ہند، افغانستان سے قریب تر ہونے کے باعث پٹھانوں کا تختہ مشق بنا ہوا تھا سندھ میں ہر طرف طوفان بدتمیزی برپا تھا۔ کھوکھروں نے بھی اس ہنگامہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی لیکن انہیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

چوہدری برخوردار سکنہ بھلہ کریالہ کی جاگیر کا حال گزشتہ باب میں درج ہو چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں چوہدری صبح صادق مرحوم سکنہ کریالہ کے بعد اس خاندان میں کوئی سربرآوردہ شخص پیدا نہیں ہوا ماسوائے غازی مرید حسین شہید بھلوی غازی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ باب پنجابی ادب ص ۲۷۹ کتاب ہذا۔ کھوکھروں کی آبادیاں علاقہ دھنی کے درج ذیل کے مواضعات میں ہیں:-

رودیوال، موہوال، بھوکنی، دریا مال، کریالہ، بھلہ، موہڑہ لسو، موہڑہ قاضی، رکھ سرسنہ تھرپال بولے بھیاں، موہڑہ کھوکھر چشم، رہال، چک بازید، چک نورنگ، کھنڈی جاموں، جینگاہ، تھوہا ہمایوں، سدوال، ڈھلال، اوڈھروال، خم گسر، موہٹے کھوٹ وغیرہ

- - - - - - - - - - -

۴:- جنجوعہ راجپوت -

بروئے تذکرہ روسائے پنجاب صفحہ 341 جنجوعہ راجپوں کا ایک قدیم خاندان ہے راجپوت پنجاب میں تین گردہوں میں آئے ان کا پہلا ورود جس وقت ہوا اس کی کوئی تحریری تاریخ موجود نہیں اور یہ زمانہ ۵۰۰ سال قبل مسیح تھا۔ کٹوچ چمبہ اور جالندھر کی پہاڑیوں کے روساء جن کے بزرگ دوآبہ باری اور رچنا پر حکمران تھے انہی پردیسیوں کی زندہ اولاد ہیں۔ راجپوتوں کا دوسرا دور متذکرہ بالا زمانے سے کم از کم ایک ہزار سال بعد ہوا جبکہ ہستاپور کے بانی کے بیٹے اجا امیدا نے اپنے یادو راجپوتوں کے ساتھ جہلم کے شمال پر چڑھائی کی اور اس خاندان شاہی کی بنیاد ڈالی جو راولپنڈی سے ملتان تک تمام علاقے پر حکمران رہا۔ راجپوتوں کا آخری دور وہ ہے جس میں یہ لوگ دکن سے نقل مکان کر کے آئے۔ اور یہ ورود دسویں سے پندرہویں صدی عیسوی تک ہوتا رہا جس میں یہ بہت سی دوسری مختلف نسلوں کے ساتھ پنجاب میں آئے اور جنکی اولاد جاٹ ٹوانے، سیال گھیبے اور کھوکھر وغیرہ ہیں۔

پنجاب میں جنجوعے ان یادو کی اولاد ہیں جنکے ساتھ اُجا امیدا نے چڑھائی کی تھی یہ لوگ راجپوتانے کے جوہیوں اور جودھیوں سے ملتے ہیں۔ سلسلہ کوہستان نمک جو دریائے جہلم کے شمال میں ہے راجپوتوں کا اصلی جائے ورود ہے آج تک اس پہاڑ کا نام کوہ جودہ ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ۷۴۰ء میں جوہیے اور جودھی کھوکھروں دودیوں اور شیدیوں کے ساتھ مل کر حسین شاہ رئیس لنگاہ کی طرف سے بھٹی راجپوتوں کی لڑائی میں لڑے یہ تمام اس راجہ مل کی اولاد ہونے کے مدعی ہیں جو پانڈو کی اولاد اور راجپوت نسل سے تھے جو قریباً ۹۹۰ء میں جودھپور یا قنوج سے نقل مکانی کر کے اس وقت پنجاب میں آیا جبکہ قنوج میں ایک راٹھور شہزادہ حکمران تھا۔ راجہ مل نے یہ سن کر کہ پانڈو نے ایک دفعہ جہلم کی شمالی پہاڑیوں میں پناہ لی اپنے ہمراہیوں سمیت اس طرف کوچ کیا اور ضلع راجگڑھ کی بنیاد ڈالی جو اب ملوٹ کے نام سے مشہور ہے بروایت برگیڈیر رب نواز اس جگہ کا ایک نام

ملاوٹ بھی تھا یہ مقام جو آسیدن شاہ سے کوئی دس میل کے فاصلے پر مغرب میں واقع ہے اور آج بھی جنجوعہ خاندان کا اہم مرکز ہے ۔

جب سلطان محمود غزنوی (۹۹۷ — ۱۰۳۰ء) نے قنوج پر حملہ کیا تو اس کی فوج بھی اس کوہستانی علاقے سے گزری تھی محمود نے جنجوعہ خاندان کے سردار کو طلب کیا اس کے انکار پر سلطان نے اس پر چڑھائی کر دی جنجوعوں نے سلطانی لشکر کا مقابلہ کیا مگر کسی وجہ سے راجپوت راجہ نے بہت جلد لڑائی بند کر دی لڑائی بند ہوئی تو راجپوتی روایات کے تحت جنجوعہ سرداروں نے محمود کی بڑی آؤ بھگت کی اور اپنے بہادر لڑاکا جوانوں کی کمک بھی پیش کی جس کو سلطان نے بڑی خوشی سے قبول کیا ۔:۔

معترا کی کامیاب مہم (۴۰۹ھ / ۱۰۱۸ء) میں پٹھانوں اور کوہستان نمک کے راجپوت جوانوں کے میل جول نے اور ان کی اخلاقی اور عسکری برتری نے راجپوت راجہ مل کو اسلام کی طرف راغب کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ راجہ مل کے اسلام قبول کرنے کے موقع پر جب جنجوں (زنار جنیؤ) ، توڑے گئے تو اسی دن سے اس نو مسلم قبیلے کا نام جنجوعہ پڑ گیا۔ لیکن جنجوعہ راجپوتوں کے شجرہ نسب، جو کہ سلطان آف مکھیالہ کے پاس موجود اور جسے راقم نے خود دیکھا ہے سے پتہ چلتا ہے کہ جنجوعہ راجہ مل سے آٹھ نو پشتیں اوپر ایک شخص کا نام ہے جس کی وجہ سے اس قبیلے کا نام جنجوعہ مشہور ہے بہر حال تاریخی طور پر ان کا مسلمان ہونا پندرہویں صدی عیسوی سے ثابت ہوتا ہے ۔

جنجوعہ روایت کے موجب کٹاس ابتداء ہی سے ایک متبرک جگہ ہے۔ مہابھارت میں جو مسیح سے تین سو سال پہلے کی تحریر ہے اس کا ذکر موجود ہے منشی سجان رائے بٹالوی اپنی کتاب خلاصۃ التواریخ جس کا حوالہ پروفیسر محمد اکبر کی انگریزی کتاب '' مغلیہ پنجاب میں دیا گیا ہے اس کی رو سے پتہ چلتا ہے کہ مکھیالہ کے علاقہ میں ایک جگہ کوٹ جھمینہ ہے یہاں کی جھیل اتنی گہری ہے کہ کوئی آدمی اسکی گہرائی نہیں جانتا یہ قدیم ایام سے ایک پرستش گاہ تصور کی جاتی ہے۔ مقدس ایام میں جبکہ سورج برج حمل میں داخل ہوتا ہے یعنی پہلی بیساکھی کو ہندو گروہ

دلگروہ اس جگہ نہانے کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ زمین کی دو آنکھیں ہیں دائیں آنکھ تو اجمیر کے قریب پشکر کی جھیل ہے اور بائیں آنکھ یہ جھیل ہے۔

کٹاس کی وجہ تسمیہ کے متعلق تاریخ ضلع جہلم میں یہ بتایا گیا ہے کہ براہمنوں کی روایت کے موجب جب شو (ایک ہندو دیوتا) کی بیوی ستی مرگئی تو اسے اتنا دکھ ہوا کہ اس کے آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی جاری ہوگئی اور ان سے دو متبرک تالاب وجود میں آگئے ایک اجمیر کا پشکر اور دوسرا اکشش جسکا معنی انگریزی میں Raining Eyes (تار اشک) ہو سکتا ہے کثرت استعمال سے یہ لفظ کٹاس رہ گیا ہے۔

خیر یہ تو بطور جملہ معترضہ کے آگیا۔ راجہ مل کے پانچ لڑکے تھے جن کے نام ویر، جودھ، کھلا، ترنولی اور خاکا تھے اور بروایت بعض چھ لڑکے تھے جنکے نام ویر، جودھ، ککھا، ترنولی، پیر کالا اور دالو جیٹھ تھے۔ ویر اور جودھ کی اولاد ضلع جہلم میں پائی جاتی ہے لیکن کھلا یا ککھا کی اولاد علاقہ جات کلر اور کہوٹہ، ترنولی یا ترنول کی اولاد اٹک اور اٹک کے گردونواح میں، خاکا کی اولاد مظفر آباد، کوٹ خاکا اور جموں کی سرحد کے پاس کے مواضعات میں متوطن ہے۔ برگیڈیر رب نواز کی تحقیق یہ ہے کہ ضلع راولپنڈی کی تحصیل کہوٹہ میں جنجوعہ آبادیاں پیر کالا کی اولاد ہیں ککھا کی اولاد ضلع پونچھ اور اردگرد کے علاقے میں پائی جاتی ہے اور کچھ راجپوت کہلاتے ہیں راقم کا خیال ہے کہ گکھڑوں کے مدمقابل غالباً یہی لگ تھے جن کا ذکر کیگوہر نامہ میں آیا ہے۔

راجہ مل کی اولاد سے جودھ اور ویر ضلع جہلم میں قابل ذکر ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ راجہ مل کی وفات پر اس کے بیٹوں نے "مالو کی دھن" کا علاقہ آپس میں تقسیم کرلیا جودھ نے کھڑاپچ کے قریب نمک کی کان لی قصبہ مکھشالہ (مہیال) براہمنوں سے جو وہاں آباد تھے چھین لیا قصبہ کا نام تبدیل کر کے مکھیالہ رکھ لیا۔ وہاں ایک قلعہ اور دو باؤلی تالاب بنواتے یاد رہے کہ مکھشالہ کے براہمن دراصل مہیال تھے جن کے دو قبیلے موہن اور بھیموآل یہاں پر آباد تھے جنہوں نے انہیں یہاں سے نکال دیا موہن نامی موضع تو ابھی تک قلعہ

سکھیالہ کے دامن میں بجانب جنوب مشرق ایک میل کے فاصلے پر نشیب میں موجود ہے۔
اور وہاں کی آبادی اعوانوں پر مشتمل ہے جو کہ سلطان ۶ ف سکھیالہ کے مزارعین ہیں اور بھیوال
قلعہ ننداناً نزد باغانوالہ میں مقیم ہو گئے

398ء میں جب تیمور شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو جنجوعٗ نے اس کی پوری
پوری مدد کی اور اس کے ماتحت تمام لڑائیوں میں شامل رہے بابر کے حملہ کے وقت 26ء ۱۵
میں جنجوعہ قبیلہ نہ صرف یہ کہ پورے کوہستان نمک پر چھایا ہوا تھا بلکہ ایک طرف اٹک کے کنارے
پر درناب کے مقام سے لے کر دوسری طرف دریائے جہلم کے قریب بھیرہ کے شہر تک ان کی
حکومت پھیلی ہوئی تھی۔

بابر نے جب کوہستان نمک، کلر کہار، فتح شاہ پور کے مقامات پر ڈیرہ لگایا تو ملک
ہست (اسد) خان جنجوعہ سردار نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی بابر نے خوش ہو کر ملک
ہست خان کو سلطان کا لقب دیا۔

تزک بابری میں 915ھ کے واقعات کے تحت لکھا ہے۔ بھیرہ سے سات کوس
کے شمال کی طرف ایک پہاڑ ہے اس کو ظفر نامہ وغیرہ کتب تواریخ میں کوہ جودھ لکھا ہے
اس کی وجہ تسمیہ معلوم نہ تھی اب معلوم ہوا کہ اس پہاڑ کے لوگ ایک دادا کی اولاد ہیں ان میں
دو قومیں ہیں ایک کا نام جودھ اور دوسری کا جنجوعہ۔ اس پہاڑ پر اور نیلاب و بھیرہ میں جو
قومیں آباد ہیں ان پر جنجوعہ قوم قدیم سے حکومت کرتی آئی ہے طرز حکومت دوستانہ اور
برادرانہ ہے حاکموں کا جو دل چاہتا ہے۔ وہ نہیں کر سکتے یا نہیں لے سکتے ...... مالگذاری
کی رقم بالقطع ابتدا میں مقرر کر دی جاتی ہے ...... جودہ کی بھی کئی شاخیں ہیں اور جنجوعہ
کی بھی یہ پہاڑ جو بھیرہ سے سات کوس ہے کوہستان کشمیر سے الگ ہو کر جنوب و مغرب کے بیچ
میں دینکوٹ کے نیچے دریائے سندھ پر ختم ہوتا ہے آدھے پہاڑ پر قوم جودھ آباد ہے
اور آدھے پہاڑ میں جنجوعہ مگر جودہ ہی کے نام سے منسوب ہو کر کوہ جودہ کہلاتا ہے ان
میں سب سے بڑے سردار کو رائے اور اس کے بھائی بیٹوں کو ملک ...... نیلاب

اور بھیرہ کے بیچ میں جو پہاڑ کشمیر کے پہاڑوں سے ملے ہوئے ہیں ان میں قوم جودہ اور جنجوعہ کے علاوہ جت (جٹ) اور گجور (گجر) کی قومیں آباد ہیں انہوں نے ہر بیشہ اور درہ میں اپنے گاؤں بسا لیئے ہیں ان قوموں کا حاکم کھکر (گکھڑ) ہے۔ ان کی طرز حکومت جودہ اور جنجوعہ (جنجوعہ) کی سی ہے اس زمانہ میں اس دامنہ کوہ کی حکومت تاتار (گکھڑ اور ہاتی گکھڑ سے متعلق تھی یہ دونوں ایک ہی دادا کی اولاد اور باہم چچیرے ہوتے تھے ٹیلوں اور کھڈوں پر ان کے مقامات تھے۔ جو بہت ہی مستحکم تھے تاتار کی ریاستگاہ پڑالہ (پھروالہ تحصیل کہوٹہ ضلع راولپنڈی) تھا۔۔۔۔۔ ہاتی کا علاقہ پہاڑ سے ملا ہوا ہے مقام گنجرزا بابوحسان کے تحت میں تھا۔ اس کو بھی ہاتی نے چھین لیا تھا تاتار ککھر دولت خان سے مل کر کسی قدر اس کا مطیع ہو گیا تھا۔ ہاتی اس سے نہ ملا تھا اور بر سر فساد تھا۔

جنجوعہ (تزک میں اس کی املا یہی ہے) جو ککھر کے قدیمی دشمن تھے انہوں نے عرض کی کہ ہاتی ککھر بڑا بدذات ہے رستہ لوٹ لیتا ہے اور مسافروں کو سخت پریشان کرتا ہے یا تو اس کو پہاڑوں سے لوٹا دیا جائے یا پوری گوشمالی دیجئے اس کام کے لئے دوسرے دن۔۔۔۔ ۔۔ خود چاشت کے وقت ہاتی کا سر کچلنے کے لئے سوار ہوا۔ ہاتی ککھر اسی زمانے میں تاتار کو مار کر اس کا ملک پر ہالہ دبا بیٹھا تھا۔۔۔۔۔۔ ملک ہست [دریائے سوہان کے نواح کی قوموں کے حاکم کا نام ملک ہست (اسد)] کا ایک ملازم سریا نامی گجوری (گجر) ہمارا رہبر تھا۔

بہر حال تزک بابری سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آیا بابر بادشاہ نے جنجوعہ سردار کو سلطان کا لقب دیا تھا یا نہیں ہے؟ بہر حال ایک مدت کے بعد آپس کی تفریق کے باعث جنجوعوں کی طاقت کمزور ہو گئی پنجاب میں سکھوں کے عروج پر اس خطہ کے دوسرے قبائل یعنی اعوانوں اور گکھڑوں کی طرح جنجوعوں نے بھی اپنے مضبوط قلعوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا

جنجوں کی شاخ بکھیالہ اور باغانوالہ کی طرح وٹلی کی شاخ بھی راجہ مل کے لڑکے جودھ ہی کی اولاد سے ہیں لیکن شاخ ڈٹوال کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ لوگ راجہ مل کے دوسرے لڑکے ویر کی اولاد ہیں شاخ کسک کچھ عرصہ تک تو بکھیالہ کے سلطانوں کے زیر اثر رہی مگر بعد میں اس سے

علیحدہ ہو گئی۔ سکھوں کے عہد میں سلطان فتح محمد خان کسک (کوسک) کے قلعہ پر قابض تھا جو
کہ ایک پہاڑی چٹان پر واقع ہے اس کے قبضہ میں کھیوڑہ کی نمک کی کانیں بھی تھیں۔ خود مہاراجہ
رنجیت سنگھ نے 1810ء میں اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا آخرکار پانی کی کمی کی وجہ سے۔
سلطان فتح محمد خان کو ہتھیار ڈالنے پڑے سکھوں نے جنجوعوں کی ملکیت نمک کی کانوں
پر قبضہ کر لیا لیکن بعد میں مہاراجہ مذکور نے خاندان کے گزارہ کے لئے ڈھوڈی، داڑہ اور
سادھوال کا مالیہ بطور گزارہ دے دیا چار ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر اور سالانہ 50 من نمک
دینا منظور کیا۔ اس خاندان کے اراکین 45 سال تک ہرن پور میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے
رہے اور کسک میں اسی وقت آئے جب انگریزی حکومت نے سکھوں کو شکست دے
دی نئی حکومت نے سلطان مہدی خان کو ڈھلی، کسک، اور منہالہ کے تین مواضعات اور دو
سو پچاس روپیہ سالانہ کی جاگیر دیئے ان کے پاس امیر تیمور (۹) کی عطا کردہ ایک سند بھی ہے
جس پر 1120ھ / 1708ء کی تاریخ درج ہے اور جس میں اس خاندان کو علاقہ کا بادشاہ (سلطان)
تسلیم کیا گیا ہے ان کے پاس ایک اور سند بھی ہے جو شہزادہ عباس قلی خان نے عطا کی تھی
اس پر 1130ھ / 1717ء کی تاریخ ہے اور اسی شہزادہ کا ایک اور پروانہ عطیہ جاگیر
بھی ہے

یہاں پر یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ امیر تیمور کا حملہ سندھ تو 801ھ 1398ء
میں ہوا۔ ظاہر ہے 1708ء میں سندیں دینے والا کوئی دوسرا تیموری ہو سکتا ہے
سابق گورنر سرحد سر اولف کیرو کی انگریزی تصنیف "دی پٹھان" 1958ء
کی رو سے احمد شاہ ابدالی (وفات 1772ء) کے بیٹے کا نام تیمور شاہ تھا جو 1774ء تا
1793ء تک حکومت کرتا رہا اور تیمور شاہ کے ایک بیٹے کا نام عباس تھا 1708ء میں
تو بہادر شاہ کا عہد حکومت بنتا ہے اور 1717ء میں فرخ سیر بادشاہ ہند تھا اس
زمانے میں پتہ نہیں لگ سکتا کہ مذکورہ شہزادگان کس حیثیت سے جاگیریں تقسیم کرتے رہے ہیں
ایک تیمور شاہ آخری مغلیہ دور میں لاہور کا حاکم تھا جس کا زمانہ 1170-1171ھ / 1757-1758ء

بنتا ہے :-

اندریں حالات   یہ سندیں کچھ مشکوک سی معلوم ہوتی ہیں تحقیق حال کے لیے سلطان محمد حیات خان آف وٹلی کو ایک خط تو لکھا تھا لیکن کوئی جواب موصول نہیں ہوا ۔

بہر حال ضلع جہلم اور راولپنڈی میں جنجوعہ راجپوت عام طور پر راجہ کہلاتے ہیں جنجوعہ حسب و نسب کے بڑے قائل ہیں ضلع جہلم میں جنجوعہ خاندان میں سے مکھیالہ، وٹلی اور دارا پور کی شاخیں خاص طور پر مشہور ہیں ان کے علاوہ چکری، واگہ انکہ، سلوئی کھبولہ، ڈلوال، وہالی وصرالی، اگروہا، اور ڈنڈوت وغیرہ دیہات میں بھی جنجوعے خاصی تعداد میں موجود ہیں ضلع راولپنڈی میں بھی جنجوعوں کی ایک مشہور بستی ہمٹوڑا ہے علاوہ ازیں واڑہ دھمیالی اور نابھن بھی جنجوعوں کے اہم مقامات ہیں :-

جنجوعہ قبیلہ قدیم زمانہ سے شجاعت و دلاوری کے لئے ممتاز رہا سپاہ گری ان کا پیشہ تھا تاریخ کے بے شمار معرکوں میں اس قبیلہ کے افراد نے حصہ لیا ہے تاریخی جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود غزنوی (997 - 1030ء) کے زمانے سے لے کر آج تک جنجوعہ قبیلہ میدان جنگ کی اگلی صفوں میں موجود رہا وہ سلطان کے لشکر سے نبرد آزما رہا تیمور اور بابر کے جھنڈوں تلے داد شجاعت دی احمد شاہ ابدالی (1176ھ/1762ء) پر شبخون مارا آخری دور میں سکھوں کے خلاف جنگ کرتے رہے انگریزوں کی حمایت میں بھی سر دھڑ کی بازی لگائے رکھی لیکن یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ جنجوعہ قوم اتنی خوش نصیب نہیں رہی جتنی کہ اس کی حریف گکھڑ، اعوان اور ٹوانہ قومیں ۔

اس مرحلے پر اس بات کا ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ آج کل چکوال کے بوہار اور ترکھان اور موضع مرید کے باشندے بھی اپنے آپ کو جنجوعہ کہلوانے پر مصر ہیں دیکھیں ان کے اس دعویٰ کی بنیاد کیا ہے ۔-

تاریخ گکھڑاں صفحہ ۵۳ پر لکھا ہے کہ سلطان ہاتھی خان گکھڑ (931 - 937ھ/1526 - 1530ء) کے زمانے میں اڈرانہ کے مقام پر گکھڑوں

اور جنجوعوں کے درمیان ایک خوفناک جنگ ہوئی تھی جس میں جنجوعوں کی کثیر تعداد ماری گئی تھی کچھ ڈر کے مارے باغیوں اور کسب داروں کے ہاں چھپ گئے اور ابھی تک اپنے آپ کو جنجوعہ کا بھی ڈغیرہ کہلاتے ہیں :۔

معلوم ہوتا ہے کہ دستکار طبقے کے ان لوگوں میں تاریخی شعور دوبارہ بیدار ہو چکا ہے مکھیالہ کا موجودہ سلطان ممتاز علی خان اور وٹلی کا سلطان محمد حیات خان ہے جیساکہ اوپر ذکر ہو چکا ہے مکھیالہ اور وٹلی کے سلاطین جودھ کی نسل سے ہونے کے دعویدار ہیں لیکن شاخ ڈلوال انہیں وجیرہ کی اولاد سمجھتی ہے ضلع جہلم کی تاریخ کا یہ اندراج کہ ماکھیالہ قصبہ اور قلعہ کو وجیرہ نے آباد کیا جو کہ مشرقی جنجوعوں کا مورث اعلیٰ اور اس کے جانشینوں کا دارالسلطنت تھا سے شاخ ڈلوال کے دعوے ہی کی تصدیق و تائید ہو رہی ہے لیکن افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ شاخ ڈلوال میں اب کوئی قابل ذکر ہستی موجود نہیں ہے۔

خاندان مکھیالہ بڑا مہمان نواز، فیاض اور خوش خلق ہے کہا جاتا ہے کہ اس خاندان کا ایک فرد ریاست علی خان اس قدر جبتی ستی تھا کہ لوگ عقیدتاً اس کے ازار بند کا دھاگہ بطور گنڈہ تعویز لے جاتے تھے۔ اور بانجھ عورتیں اپنی کمر کے ساتھ باندھ لیتی تھیں اور اس طرح ان کی گودیں ہری ہو جاتی تھیں۔

وٹلی کا خاندان مذہباً اہلسنت والجماعت ہے لیکن مکھیالہ والے اہل تشیع ہیں سلطان سرفراز خان نے سب سے پہلے شیعہ مذہب اختیار کیا اس تبدیلی مذہب کی وجہ سے وٹلی کے سلطان نے ان سے قطع تعلق کر رکھا ہے آپس میں رشتے ناطے نہیں کرتے ہنگام مرگ ایک دوسرے کے پاس فاتحہ خوانی اور تعزیت کے لئے جاتے ہیں لیکن روٹی وغیرہ نہیں کھاتے سلطان سرفراز خان اور موجودہ سلطان کے درمیان چھ پشتیں حائل ہیں جنکی تفصیل اوپر سے نیچے یوں ہے :۔

سرفراز خان ← غلام حسن خان ← کرامت علیخان ← فتح علی خان ← علی بہادر خان ← اصغر علی خان ← ممتاز علی خان مکھیالہ کا خاندان اس قدر

خوش خلق اور غریب پرور ہے کہ لوگ ان کی شرافت کو بعض اوقات بزدلی پر محمول کرنے لگتے ہیں سلطان بڈھا خان والیٔ قلعہ ماکھیالہ کی شان میں کیگوہرنامہ کے مصنف راجہ زادہ دنی چند (۱۱۳۷ھ / ۱۷۲۵ع) نے ایک فارسی غزل کہہ رکھی ہے

مژدہ اے دل آں صنم باروئی زیبا میرسد
مرحبا برہم جلیساں یاد دانا میرسد
اے غریق چاہ زنخداں از پریشانی منال
دست آویز ترا رسن زلف ہمن سا میرسد
دیدۂ صحرائیاں گر انتظار بہا کشید
محمل می شد روان بانگ جرسہا میرسد۔
اندریں وادی رہ گم گشتگان در انتظار
رہبر کوی سعادت خضر بیما میرسد۔
عندلیباں را پیام نوبہار آمد بگوش
آں گل با رنگ خوبی قدر عنا میرسد۔
ما مریض درد حالت را تشیم حالا خوشیم
حاذق دارالشفا بہر مداوا میرسد۔
گر ہمہ شرح غم گردون دون کم ہمتی
آنچہ از بی مہری او برسر ما میرسد۔
سرچو چنگ از غم گرانم بود ہاتف گفت شاد ؔ تمام
ای دو نیچہ حال تو دو گوشش وا لد میرسد (۱ص)

مکھیالہ کے بجوعوں کی شان میں ایک طویل کبت بھی قابل اندراج ہے جسے راجہ زادہ جعفر خان سکنہ بشارت کی زبانی سن کر درج کیا جاتا ہے۔

؎ بیعان اللہ رسول کوں جیت نام دھیان
جو دھد دیہ کی منس کو جانے کل جہان -

کبت جانت جہان رب رکھے تیری آن
ایسا سپھل سپوت نرجودھا بل وان
دلی والا تے داد منظور کیا سب ہوشیان ۔
کوٹ ہی ملوٹ راجہ مل تھا
بیٹ بھی کری دعا باپ دادا و شجاع ۔
سدا تیرا راج بھاگ جنجوعہ آدی خاندانہ
راجہ ارجن کا تھا یہ مکان عالیشان بھیو
وتعز من تشاء خاص حکم ہے قرآن کا
چھوٹے اور بڑے دیکھو آوے کے سپوت بیچے
ہر ایک ان میں سے تابع فرمان کا ۔
قادر کا کرم دیکھا عجیب اور شرم دیکھا
نور بھیر یا چہرہ دیکھا علی بہادر سلطان کا ۔
راجن تپ راجا سلطان علی فیروز خان
تکو لیے نہ دعوے اس فانی جہان کا ۔
بڑے بڑے راجے مہاراجے کل نفس ذائقۃ الموت
یہی امر ہے قدیم سے بیچ جہان کا ۔
والی تو سکندر نے ملک جیت سادھ لینے ۔
بابر اکبر ہمایوں جیسے رہیا نہ نشان افلاطون لقمان کا ۔
ہر پنچ تن کے دوارے بھاٹ صبح شام دعا ایہ مانگے ۔
رب پردہ اور شرم رکھے جنجوعہ خاندان کا

مکھیالہ میں پینے کے پانی کی بڑی قلت ہے اس حقیقت کے اظہار کے لئے ایک نقل مشہور ہے ۔

۷۔ گرطھو مکھیالہ تخت سلوتی ۔ پانی بھر دی آدکھی ہوئی ۔

علاقہ دھنی میں جنجوعوں کی صرف ایک ہی قابل ذکر بستی ہے جس کا نام دھرابی ہے ۔

جنجوعوں کی غالباً ایک ذیلی شاخ جودھرے (جودھ کی نسبت سے) درج ذیل دیہات میں پائے جاتے ہیں :۔

پمیردال گگا چھبی، بیگال اور علاول وغیرہ

۵۔ گوجر

لفٹیننٹ کرنل وائی کلی نے اپنی کتاب "پنجابی مسلمان" بزبان انگریزی میں لکھا ہے کہ جب جاٹ قبائل وادیٔ قندھار کے ساتھ ہندوستان کی طرف بڑھ رہے تھے تو ایک اور سیتھین (سکاتھین) قبیلہ یوچی نامی جس کے موجودہ نمائندے گجر و گوجر) ہیں نے کابل کشمیر اور شمالی پنجاب میں اپنے قدم مضبوطی سے جما رکھے تھے جہاں پر ان کی بستیوں کی نشاندہی گوجرانوالہ اور گجرات جیسے اضلاع اور مقامات کے ناموں سے ہو سکتی ہے تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے یوچی قبائل کا ایک حصہ جنوب کی طرف حرکت کرنے لگا۔ اور درہ بولان کے راستے جاٹ قبیلوں کی وجہ سے بعد ازاں بہت جلد یہ اپنے شمالی بھائیوں سے جدا ہو گئے۔

ہندوستان کی تاریخوں میں ایک گمنام سے قبیلے کا نام اکثر آتا ہے جسے کہ گرجارا کہا جاتا ہے جو تیسری اور چوتھی صدی عیسوی کے دوران کچھ مدت کے لئے برسر اقتدار رہا۔ ایک مورخ گرجارا سلطنت کی حدود متعین کرتے ہوئے ان کی راجدھانی قنوج قرار دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ بھوج اول کے عہد (۸۴۰ء) میں تقریباً سارا شمالی ہندوستان ان کے زیر علم تھا خیال ہے کہ یہ قبیلہ اصل و نسل کے لحاظ سے سیتھین یا ہن ہے قیاس غالب ہے کہ لفظ گجر، گجرات اور گوجرانوالہ کا ماخذ یہی ہے ایک دوسرا مصنف کہتا ہے کہ گوجر یوچی سیتھین نسل سے ہیں۔ جنہوں نے ایک صدی قبل اور بعد مسیح شمالی مغربی ہندوستان پر حملے کئے بسلسلہ کوہستان نمک کے گرد گجر یہ سب سے قدیم قبیلہ ہے۔ یہ غالباً ضلع گجرات سے ضلع جہلم میں داخل ہوئے ان کا اصلی وطن راجپوتانہ اور جنوب مشرقی پنجاب ہے ان کی زبان ہندی گوجری ہے جسے اس علاقے میں تہارو مہارو (تہمارا میرا) کہتے ہیں۔ ان کی قدامت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ ماتروں، کسروں اور کہوٹوں کی تمام روایتیں متفق ہیں کہ جب ان کے آبا و اجداد دھنی میں آئے تو یہاں پر آوارہ گرد گوجر چرواہے موجود تھے ان کی روایت کے مطابق یہ راجپوت تھے جو قدیم ایام میں چراگاہوں کی تلاش میں گجرات آ گئے اس وقت وہاں وڑائچ جاٹوں کی حکومت تھی جنہیں یہ مالیہ ادا کرتے تھے۔

گجرات شہر کی بنیاد کے متعلق جو مختلف روایتیں موجود ہیں ان میں سے ایک بقول جنرل کننگھم یہ بھی ہے کہ قدیم شہر کی بحالی کا سہرا علی خان گوجر کے سر ہے جس کا نام عجب طور سے اللہ خان گرجارا کے راجہ سے ملتا جلتا ہے جسے سنکرا ورمانے ۸۸۳ اور ۹۰۱ء کے درمیان شکست دی تھی۔

بعض گجر اپنے آپ کو جے پال اور انند پال کی نسل سے بتاتے ہیں جنہوں نے ہندانہ کے مقام پر سلطان محمود غزنوی کا مقابلہ کیا اور غالباً جنجوعہ سردار تھے۔ آئینِ اکبری میں انہیں بادگجر کہا گیا ہے اور راجپوتوں میں شامل کیا گیا ہے کیوں کہ ان کی گوتیں گورسی، جنجی اور پاوڑ (پنوار) آپس میں ملتی جلتی ہیں۔

تزکِ بابری میں آیا ہے کہ جب بابر سلسلہ کوہستان نمک میں کلر کہار کے مقام پر آیا اور پھر والہ پر چڑھائی کی تو جنجوعہ سردار ملک ہست کا ایک ملازم سریا گجر شاہی لشکر کی رہبری کے لیے مقرر کیا گیا نیز اس وقت میدانی علاقوں میں آوارہ گرد گجر، جدرہاں، اور جاٹوں کا ذکر بھی بابر نے کیا ہے۔

علاقہ زیر بحث کی سیاست میں ان کا عمل دخل بہت کم رہا ہے یہ گکھڑوں اور جنجوعوں کے ماتحت کاشتکاری میں مصروف نظر آتے ہیں۔ البتہ بہادر شاہ کے عہد (۱۷۰۹ء - ۱۷۱۲ء) میں یعنی اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں کالا گوجراں (نزد جہلم) کا چوہدری عبداللہ جسیم بڑا باثر شخص تھا جو کہ گجر چوپڑا اسی کا گورنر تھا اور ان کا یہ اثر الحاقِ پنجاب (۱۸۴۹ء) تک قائم تھا۔ قدیم زمانے کے گوجر خاندانوں کے نمائندے کالا کے پسوال چوہدری چکوال میں کانس کے راجگان اور خوجی کی خاندان بہت مشہور ہیں۔

گجر کے لغوی اشتقاق کے متعلق بڑی بڑی بحثیں ہو چکی ہیں اور اسی طرح ان کے اصلی وطن کے متعلق بھی لیکن میرے خیال میں ابوالبرکات مولوی محمد مالک خان رئیس کھوڑی ضلع گجرات کی بے نظیر اور مستند کتاب تاریخ شاہانِ گجر اس موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ آئندہ صفحات میں جو بحث آرہی ہے اس کا غالب حصہ اس کتاب سے ماخوذ ہے۔

مولوی صاحب کا کہنا ہے کہ جو لوگوں نے گوجر کا معنے "گئو چر" کیا ہے وہ درست نہیں کیوں کہ تاریخ میں برصغیر کے تمام قدیم و جدید گروہوں کی نسبت لکھا ہے کہ یہ ابتداء میں جانور پال تھے اور دریاؤں کی وادیوں میں اقامت گزیں تھے۔ اب بھی جاٹ، اہیر، گوجر، اور راجپوت سب جانور چراتے ہیں اس لیے انفرادی طور پر تو ہم کسی کو گوالا کہہ سکتے ہیں لیکن کسی خاص قوم کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا اگر یہ "گاؤ چرانے کی وجہ سے ہوتا تو سب سے پہلے یہ لقب آریہ منگول کا ہوتا جو ابتداً اپنے جانوروں

کوہ گرگر سبز وادیوں میں یکے بعد دیگرے آئے۔ گاؤچر فارسی ترکیب ہے نہ کہ ہندی۔ ہندی میں تو اس معنی میں چرواہا، گوالا، گڈریا ہونا چاہیے فارسی میں گائے چرانے والے کو گاؤبان کہتے ہیں۔ مثلاً نظامی کا شعر ہے ؎

چو شیر ملک آتش بدم درزند	دم گاؤبان را بہم بر زند

یہ لفظ سنسکرت زبان کا بھی نہیں کیوں کہ سنسکرت میں گوجر کا کوئی لفظ نہیں ہے جس کے معنی گوالا ہوں سنسکرت میں لفظ "گورجرا" آیا ہے۔ نیز گوجر کا نام بہ تبدیلی بعض حروف دوسرے ممالک میں بھی آتا ہے مثلاً غزر، جزر، جرز، گزر وغیرہ دوسرے ممالک میں اس لفظ کا پایا جانا اس امر کی بین دلیل ہے کہ گوجر کے لفظ کا "گاؤچرا" سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ کوئی اور ہی لفظ ہے جو متعدد تبدیلیوں کے بعد ہندوستان میں پہلے پہل بتلفظ "گرجر" استعمال ہوا ہے اور گرجر سے گجر ہوگیا۔ گوجر میں واؤ علامت ضمہ ہے جیسا کہ بعض تاریخوں میں خزر کو خازر اور گزر کو گازر لکھا ہے۔ الف علامت فتحہ ہوتا ہے جیسے تیمور اصل میں تمر ہے کسرہ کی جگہ ی اور ضمہ کے واسطے واؤ لکھا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ گوجر سکندر کی اولاد ہیں سکندر نے اپنے بیٹے کو فتوحات کے صلے میں گرز عطا کیا۔ گرز سے گرج ہوا اور گرج سے گوجر۔ یہ قابل تسلیم نہیں کیوں کہ گوجر سکندر سے پہلے کی ایک مشہور قوم ہے اگر سکندر نامہ نظامی کو تاریخی حیثیت دی جائے تو خزر کا ذکر سکندر نامہ میں بھی آتا ہے کہ سکندر کے وقت یہ قوم موجود تھی جو سکندر کے دربار میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ جنگلی وحشی ہم کو تکلیف دیتے ہیں پہاڑوں کے دروں سے نکل کر ان کے کھیتوں کو تباہ کرتے ہیں اور ان دروں کو بند کردیں تاکہ ہم آرام کی زندگی بسر کریں ؎

دریں پاسگاہ رخنہ ہائے گہست	عمارت گشتہ شود سنگ بست
مگر در آفت آں بیابانیاں	براحت رسد کار خزرانیاں
بفرمود شاہ تا گزرہائے کوہ	بہ بندند خزرانیاں ہم گروہ

اس سے ثابت ہوا کہ خزر (گوجر) سکندر کے وقت موجود تھے لیکن یہ اس کی اولاد نہیں ہو سکتے۔

بعض کہتے ہیں کہ گوجر دراصل گرگ تھے چونکہ یہ قوم سخت زور آور اور دلیر تھی اور دوسری قوموں کو پھاڑتی تھی اور تکلیف دیتی تھی اس لئے اس کو گرگ (بھیڑیا) سے تشبیہ دی گئی۔

تاریخ طبقات الامم از علامہ قاضی ابوالقاسم صاعد بن احمد اندلسی وفات ۴۶۳ھ میں ہے :۔

دنیا کا پانچواں گروہ ترک ہے جس کے قبائل خرلخیہ، کیماک، تغزغز، خزر (گوجر) سویرا جید لعہ

خنزدان، طیلسان، کنشک، برطاسس ان کی زبان اور ... یک ہے۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ خزر (گوجر) ترکوں کا ایک قبیلہ ہے اور یہ قدیم قوم ہے اور چونکہ ترک قوم کو درندہ یعنی گرگ کہتے ہیں۔ اس لئے گرگ اور گوجر ایک ہیں گرگ کا کاف جیم سے تبدیل ہو کر گرج ہو گیا ... گرج سے بہ تقدیم ج گجر ہوا۔ ترکوں کو شجاعت اور سخت جنگجوئی کی وجہ سے ان کے بادشاہ کو درندوں کا بادشاہ کہتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں مسٹر آرمسٹرانگ نے مصطفٰے کمال کی بے نظیر سوانح عمری کا نام گرے وا... (GREY WOLF) رکھا ہوا ہے۔

درحقیقت گوجر، گجر اور گرجارا یا گرجرا ایک ہی لفظ ہے علم اللسان والصوت کی رو سے الفاظ آپس میں بدلتے رہتے ہیں گرجرا دراصل گرجربلا... ہے اس میں اور گجر میں ایک حرف کا فرق ہے لیکن بعض اوقات رحذف کر دی جاتی ہے۔ جیسے ... شن ... شن چندر سے چند وغیرہ

قدیم تاریخ میں گوجرا قوم اسکی فتوحات اور کارناموں کے بکثرت واقعات موجود ہیں مسٹر اے سمتھ اور دیگر مورخین نے صاف لکھ دیا ہے کہ گوجرا اور گجرا ایک ہی لفظ ہے دونہیں نیز خاندان گجر کے جن بادشاہوں کا ذکر انگریزی تاریخوں میں ہے ان کو انگریزی مورخوں نے گوجرا لکھا ہے انہی گوجر راجگان کو عربوں نے جزر لکھا ہے۔

بعض پڑھے لکھے لوگ کہتے ہیں کہ گوجرا نام ہن قوم کا ہے جو وسط ایشیا سے آئی اس ... برصغیر میں حکومت قائم کی اب اس کا نام و نشان باقی نہیں ہے یا تو وہ تمام کے تمام مارے گئے ... بقیۃ السیف نے اپنا نام تبدیل کر دیا۔

مولف شاہان گوجر کے بموجب ہن کے افراد اس زمانہ میں بھی موجود ہیں کیونکہ ہن گوجروں کی ایک گوت ہے اور ان کی بستیاں بھی موجود ہیں لیکن ... اتی کلی اپنی کتاب محولہ بالا صد... لکھتا ہے کہ ہن پنوار راجپوت ہیں جو راجہ جگدیو کی نسل سے ہیں۔ ان دونوں بیانوں سے نتیجہ یہ نکلا چونکہ ... گوجروں کی بھی ایک گوت ہے اور واتی کلی ہی کے قول کے موجب جاٹ، گوجر اور راجپوتوں کے درمیان کا ... نسلی کی بجائے محض معاشرتی اور سماجی ہے (پنجابی مسلمان صد۴۶) لہٰذا گوجر اور ہن ہم نسل ٹھہرے۔

مسٹر وی۔ اے سمتھ اپنی تاریخ کے باب دوازدہم قوم گجر کے زیر عنوان لکھتا ہے۔

کتابوں اور کتبوں میں ہنوں کا ذکر اکثر ایک اور قوم گرجر کے ساتھ ہوتا ہے ... کا نام آجکل بھی گوجر کی صورت میں باقی رہ گیا ہے اور جو شمال مغربی ہندوستان میں بہت پھیلی ہوئی ہے ... معلوم ہوتا ہے کہ قدیم گرجر

بیرونی آباد کار تھے اور ان کا بہت قریبی تعلق اور ممکن ہے کہ خون کا رشتہ بھی ہنوں کے ساتھ ہو انہوں نے راجپوتانے میں بڑی سلطنت قائم کی جس کا صدر مقام کوہ آبو کے شمال مغرب میں پچاس میل کے فاصلے بھنمال یا سرمال تھا۔

مختلف ملکوں میں اس لفظ کو مختلف تلفظ کے ساتھ یوں استعمال کیا گیا ہے ہندوستان میں گوجر، انگریزی تاریخوں میں گرجرا، چین میں کوسا، روس میں کھوالیس یا خوالیس، روم میں جزناز، آرمینیا میں خزر یا جزر، بحیرہ ارافہ میں گزر، شام میں کیسر یا غیسر، کاکیشیا میں خاسر یا گاسر، ایران میں کاجار یا قاچار

(بحوالہ بمبئی گزیٹیر حصہ اول جلد ۹ صد ۳ - ۱۷۱)

گوجروں کے اصلی اور ابتدائی وطن کے متعلق چوہدری عبدالمالک مختلف تواریخوں کے حوالوں سے لکھتے ہیں کہ دوسری صدی قبل از مسیح کے وسط میں، وسطی ایشیا کے خانہ بدوش ترکی خاندانوں میں باہم مخالفت پیدا ہو گئی اور نوبت لڑائی بھڑائی تک جا پہنچی۔ ینگ نو خاندان غالب آ گیا اور یوچی خاندان مغلوب ہو گیا اور اس طرح اپنے آبائی وطن سے ترک سکونت پر مجبور ہو گیا اس علاقے کا نام صوبہ کن سو ہے جو کہ چین کا شمال مغربی صوبہ تھا یوچی قبیلہ یہاں سے ہجرت کر کے مغرب کی طرف کوچ کر کے تعلمکان کے صحرا میں جا نکلا یہاں ان کی مڈبھیڑ قبیلہ ووسن سے ہوئی اور یہ جنگ دریا تے ایلی اور اس کے دو معاونوں رتیکے اور کینگز کے دوابہ میں لڑی گئی۔ ووسن قبیلہ اگرچہ کہ بڑی بے جگری سے لڑا لیکن قلت تعداد کے باعث شکست کھا گیا اور یوچی قبیلہ ایک تند سیلاب کی طرح جیس ایسک کل کو عبور کر کے چند در چند شاخوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک شاخ تبت کی طرف جا پہنچی اور دوسری شاخ مغرب کی طرف بڑھتی گئی آخر قوم شک یا سی کو نکال کر سر سبز چراگاہوں کی تلاش میں شمال مغربی سرحدی دروں سے وارد برصغیر ہند و پاکستان ہوئی اور کچھ عرصہ بعد یوچی قوم کے سردار اعظم نے جو یورپ میں گڈفائسس اول کے نام سے مشہور ہے تمام قبائل کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر کے کوہ ہندوکش کے راستے کابل و کشمیر کو فتح کر لیا پھر پنجاب میں قدم جمالئے لہٰذا گوجروں کا اصلی وطن وسط ایشیا کا علاقہ ہے جس میں کچھ حصہ چین کا اور کچھ روس کا شامل تھا۔

یہ نام گوجروں کے نام سے کلی مطابقت رکھتا ہے قطعی شہادت سے گوجر خاندان یوچی سے ہیں اور یوچی سیتھین یا گوجر کو خزر بھی کہتے ہیں۔ بحیرہ خزر کے کنارے پر خزر (گوجر) آباد ہیں۔

بیان کیا گیا ہے پہر ذکر ہو استھین قوم کی ایک شاخ قوم یوچی ہے جس کا ایک قبیلہ گوجرا اور دوسرا جاٹ ہے یوچی خاندان کے بہادروں نے کابل کشمیر اور شمالی پنجاب میں اپنا تسلط جما لیا جہاں ان کی آبادی کا ثبوت

گوجرانوالہ گجرات وغیرہ سے ملتا ہے تیسری صدی کے آخر تک یوچی قوم کے ایک حصے نے جنوب کی طرف بڑھنا شروع کر دیا اور دوسرے ہی عرصہ کے بعد اپنے شمالی جاٹ بھائیوں سے (جو ان سے سبقت کر کے درہ بولان کے راستے سے آگے بڑھ گئے تھے) جدا ہو گئے وہ گوجر جو وادئ سندھ میں مقیم تھے بالآخر سوراشٹر یعنی گجرات کاٹھیاواڑ میں قیام پذیر ہوئے اور انہوں نے اصلی باشندوں یعنی اہیروں وغیرہ کو مطیع کیا اس طرح ان کا اقتدار پیچھے کی شکل میں شمالاً جنوباً کوہستان ٹک سے لے کر اراولی پربت اور چنبل تک اور شرقاً غرباً سندھ اور پنجاب سے جمنا تک پھیل گیا یوں انہوں نے پنجاب اور شمالی راجپوتانہ اور گنگا کے دوآبہ کا نصف غربی علاقہ آباد کر لیا۔

بقول ٹاڈ راجستھان باب ۲۱ جلد اول "ہندوستان کی قدیم اقوام مینا، میر، گونڈ، بھیل، سربا، سرجا، اہیر اور گوجر ہیں سری کرشن کے وقت گجر یج دیس میں موجود تھے۔ بھیشم پتامہ کی رضاعی ماں ایک گجری تھی۔ یوچی قبائل کی جنگ ۱۶۵ ق م میں ہوئی"۔

رامائن کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ گوجر ایک قدیم قوم ہے کیوں کہ جب لنکا کا راون سیتا کو اٹھا کر لے گیا تو راجہ رامچندر کسکندا پہاڑ (ناسک نند کیتی) پہنچا وہاں ایک بہادر سے اس کی ملاقات ہوئی جو بانر قوم سے تھا اور اس کا نام ہنومان تھا یہ ہنومان راجہ سگریو کا مدار المہام تھا راجہ سگریو کا گوت بھالوت تھا بانر اور بھالوت آج بھی گوجروں کے گوت ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رامچندر کے وقت بھی گوجر موجود تھے۔

ٹیکسلا کے قریب ڈھیری شاہان کے گوجر کہتے ہیں کہ ان کے بزرگ قدیم زمانہ سے یہاں کے رہنے والے تھے ٹیکسلا در اصل تکشلا تھا۔ اس پر تنک یا تکشک قوم (گوجر) کی حکومت تھی۔

گوجر ابتداً آفتاب پرست تھے اس واسطے گوجروں کو مہر یا مہر (آفتاب) کہتے ہیں۔ گوجروں کی ۳۶ دیویاں ہیں۔ جوالا مکھی عرصہ تک گوجروں کی زیارت گاہ رہ چکی ہے گوجروں کا ایک دیوتا مکیشر یا مکشیشا کی وجہ سے مکہ مشہور ہے۔ مکیشر اور مکہ کے باہمی تعلق کی تائید خدیو مصر کے سیکرٹری کے سفرنامہ سے بھی ہوتی ہے (ملاحظہ ہو کتاب شاہان گوجر صلا) سوات، بنیر کے اخوند صاحب اور پشاور کے پنجو شاہ گوجر قوم میں سے مشہور اولیائے کرام ہیں۔

گوجروں کی زبان ابتدا سنسکرت تھی بعد ازاں یہی زبان ہندکو جٹکی یا پنجابی ہو گئی۔ سوات بنیر، پونچھ کشمیر اور ایبٹ آباد کے پہاڑی علاقہ میں گوجری زبان بالکل خالص حالت میں موجود ہے۔ در حقیقت گوجر، جاٹ اور راجپوت بالکل ایک ہی ہیں۔ کیوں کہ ان کی گوتیں آپس میں ملتی جلتی ہیں۔

فارغ بخاری کی تحقیق کے موجب گوجری زبان پراکرت کا وہ روپ ہے جو یہ قبیلہ اپنے سات باختر سے لایا تھا گوجر اب بھی مشرقی افغانستان کے علاقہ لغمان اور رویگان میں دریائے کونٹر کے دائیں کنارے سے چار ویگار کی حدود تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی بولی وہی پراکرت، ہندکو یا گوجری ہے جیسے وہاں پشتی اور اس قبیلے کو پشائی کہتے ہیں۔ فارغ بخاری انہیں بیرونی آریہ بتاتا ہے۔

ضلع جہلم میں گوجروں کی اچھی خاصی آبادی ہے بعض گاؤں ان کی گوتوں یا ذات کی نسبت سے مشہور ہیں۔ مثلاً لیسوال، کوہلپور، واڑہ گوجراں، بھنلہ، بھٹیا، ڈینڈا، بجاڑ، گوجر لوپڑ، موہن، ڈھمن گوجراں، بوکن، اوانہ چک لودھی، ہٹیکریاں، مدوکالس، گوجر بانٹھ، سلتے، مہیسیاں، گوجر کٹاریاں، کالس، کولیاں، لوہسر موہڑہ، کالا گوجراں کے چوہدری تو بڑے ہی مشہور ہیں۔

گوجروں کا ایک جرگہ ضلع جہلم میں ہی رہتاس کے قلعہ کے ارد گرد پھیل گیا جس کے سربر آوردہ چوہدری سلیمان خان نے موضع کالا آباد کیا چوہدری عبدالرحیم خان گکھڑوں سے لڑتا رہا اور رفتہ رفتہ رہتاس کا حاکم بن گیا شاہان مغلیہ نے ۸۴ گاؤں کا حاکم یا ناظم مقرر کیا اور یہ علاقہ گوجر چوراسی کہلاتا ہے۔ اس نے بمقام برالی جو ڈھمن اور گھوڑی گالا کے درمیان ہے ایک قلعہ بھی تعمیر کیا۔ نادر شاہ (۱۷۳۹ء) نے ایک چھوٹا سا علاقہ بھسولہ اقوام گوجر کالس کو مرحمت کیا۔ (بحوالہ شاہان گوجر صـ ۳۸۶ – ۳۸۷) موضع بھون میں گوجروں کا پورا ایک محلہ ہے اسی طرح موضع بھٹیاں میں بھی گوجر آبادی ہے۔ مشرقی چکوال میں راجگان کالس نمایاں حیثیت کے مالک اور سردار ہیں، موجودہ زمانے میں ڈاکٹر غلام سرور ایم اے پی ایچ ڈی صدر شعبہ فارسی کراچی یونیورسٹی ممتاز فرد ہے۔ دھنی میں گوجروں کی خالص بستی صرف موہڑہ گوجراں ہی ہے۔

۶- اعوان قطب شاہی

کتاب مردم شماری مولفہ ابٹسن جو ۱۸۸۱ء میں لکھی گئی تھی اس میں اعوان قوم کے نسب کے بارے میں بڑے عجیب و غریب دعوے کئے گئے تھے مثلاً سپرنٹنڈنٹ مردم شماری نے لکھا کہ اعوان قوم جاٹ سے ہیں اور ان کا سلسلۂ نسب ہندوؤں سے ملتا ہے۔ مسٹر ارتھ بریٹ دھق کا قول ہے کہ اعوان یونانیوں کی اولاد سے ہیں۔ لیکن سر لیپل گرفن اس بات کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصل یونانیوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ پنجاب میں رہیں۔ ایک دوسرا انگریز مورخ جنرل کننگھم لکھتا ہے کہ اعوان درحقیقت راجپوت ہی ہیں جو سکندر اعظم کے حملہ سے مدتوں پیشتر ان قطعات پر آباد ہوئے تھے الغرض ان بھانت بھانت کی بولیوں سے متاثر ہو کر مولوی حیدر علی لدھیانوی نے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی خاطر ایک کتاب لکھی جس کا نام "تاریخ علوی" تھا اور اس میں چند ایسے واقعات درج کر دیئے جو مزید تحقیق پر درست ثابت نہ ہوئے چنانچہ ضرورت محسوس ہوئی کہ قومِ اعوان کے بارے میں مستند تاریخی حوالوں اور مواد کی مدد سے ایک ایسی دستاویز شائع کی جائے جو علمی دنیا میں قابل قدر تصور ہو۔ چنانچہ حکیم غلام نبی مرحوم رئیس لاہور کی مساعی جمیلہ سے دو کتابیں منظرِ عام پر آئیں جن کے نام بالترتیب زاد الاعوان، اور باب الاعوان تھے۔ ایک عرصے تک یہ بلند پایہ تحقیقی و تاریخی شاہکار سمجھے جاتے رہے لیکن کچھ عرصہ ہوا ہمارے ایک بزرگ قوم جناب ملک شیر محمد آف کالا باغ نے مولف زاد الاعوان اور باب الاعوان کی تحقیق انیق سے اختلاف ظاہر فرماتے ہوئے نہ صرف ایک کتاب "تاریخ اعواناں" ہی لکھ دی بلکہ رسالہ الاعوان لاہور جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۱۶ بابت ماہِ دسمبر ۱۹۶۳ء میں ایک مضمون بھی سپردِ قلم کیا جس میں اعوانوں

کے مورثِ اعلیٰ حضرت قطب شاہ کے متعلق تحریر کیا کہ آپ حضرتِ عباس علمدارؑ بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد کی بجائے حضرت ابی حنفیہؒ بن حضرت علیؓ کی اولاد سے ہیں چونکہ راقم کو بھی اس موضوع سے دلچسپی تھی لہٰذا اس دلچسپ بحث میں شریک ہو جانے کے دوران جو کچھ زیرِ مطالعہ و تحقیق آیا اس کا ماحصل یہ ہے ۔

۱۔ اعوان کی وجہ تسمیہ

اعوان لفظِ عون کی جمع ہے جس کے لغوی معنی مددگار، حمایتی وغیرہ کے ہیں۔ لیکن لغت سے قطع نظر اصطلاحی طور پر اعوان کا اطلاق اس قبیلہ پر ہوتا ہے جو کہ حضرت عون بن یعلےٰ عباسی علوی کی اولاد ہے حضرت عون بن یعلےٰ کی وفات ۵۵۶ ھ/ ۱۱۶۰ عیسوی میں ہوئی۔ آپ بغداد میں مدفون ہیں۔ اس وقت بغداد پر بالله عباسی حکومت کر رہا تھا۔

۲ قطب شاہی کی وجہ تسمیہ

خلاصۃ الانساب باب عباسی علوی سے پتہ چلتا ہے کہ انہی عون بن یعلےٰ کا لقب ملکِ ہند میں قطب شاہ تھا آپ حضرت پیرِ دستگیر شیخ عبدالقادر جیلانی بغدادیؒ کے مرید و خلیفہ تھے اور آپ ہی کی ہدایت کے تحت واردِ ہند ہوئے تھے۔ روحانی طور پر حضرت عون بن یعلےٰ کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ آپ اپنے زمانے کے ہندوستان میں قطب تسلیم کئے گئے ہیر وارث شاہ مرتبہ چوہدری محمد افضل خان کے آخر پر تشریحی نوٹوں کے ضمن میں صفحہ ۳۷۹ پر بحوالہ تذکرۃ الاولیا جن بائیس قطبوں کی فہرست دی گئی ہے ان میں ۲۰ ویں نمبر پر حضرت عون قطب شاہؒ کا نام بھی درج ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے قبیلہ اعوان قطب شاہی بھی کہلاتا ہے

۳۔ صحیح املاء

لفظ اعوان کی املاء آوان واحد آن بمعنی وقت غلط ہے اور اس غلطی کا شکار نہ صرف آئینِ اکبری کا مولف ابو الفضل علامی ہی ہو چکا ہے جس نے مال گزاری کے پرگنہ کے طور پر تحصیل تلہ گنگ ضلع کیمبل پور کو آوان محل کے نام سے لکھا بلکہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد دوم کا مقالہ نویس زیر کلمہ AWAN اور جامع اللغات اردو کا مولف بھی اسی املائی غلطی کا شکار نظر آتے ہیں۔ اول الذکر اعوانوں کو بابل کے حکمرانوں کے خاندان میں سے سمجھتا ہے کہ جن کا پایۂ تخت آوان تھا۔ اور ثانی الذکر انہیں مسلمان راجپوتوں کی ایک قوم قرار دے کر کہتا ہے کہ اصل میں اعوان کی املاء آوان ہے مگر آجکل انہوں نے یہ نام (اعوان) اختیار کر لیا ہے۔

دراصل یہ سب کچھ کمی علم یا قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے ورنہ عون بن یعلےٰ عباسی علوی، قریشی کی اولاد ہونے کی وجہ سے اس کی املا عربی قواعد ہی سے صحیح ہے اور یہ لفظ تقریباً ۵۰۰ھ / ۱۱۰۶ء سے مستعمل ہے جب کہ حضرت عون بن یعلےٰ الملقب بہ قطب شاہ وارد برصغیر ہند و پاکستان ہوئے۔

۴۔ اعوان اور سلاطین غزنویہ

غزنوی خاندان کی بنیاد یمین الدولہ سلطان محمود — (۴۰۵ — ۴۲۱ھ / ۱۰۱۴ — ۱۰۳۰ء) نے ڈالی اور اس خاندان کے کم و بیش ۱۵ فرمانروا صوبہ لاہور پر حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ بعض اعوان خاندانوں کا غلط طور پر یہ دعویٰ ہے کہ ان کے مورثِ اعلےٰ حضرتِ عون قطب شاہ (۴۱۹ — ۵۵۶ھ / ۱۰۲۸ — ۱۱۶۰ء) نے غزنی سے سلطان محمود کے ہمراہ ہو کر ہند میں جہاد کیا اور نائب السلطنت ہو کر لاہور کے حکمران رہے۔ تاریخی طور پر یہ بات پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچ سکتی، کیونکہ کتاب قصص ہند حصہ دوم مطبوعہ مفید عام پریس لاہور ص ۲۱ میں لکھا ہے کہ سلطان محمود بن سبکتگین بادشاہ غزنی ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء میں بعمر ۶۳ سال ۳۳ برس حکومت کر کے فوت ہوا۔ اور کتاب زاد الاعوان مصنفہ مولوی نور الدین سلیمانی ص ۲۵ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عون قطب شاہ کی ولادت ۴۱۹ھ / ۱۰۲۸ء میں بغداد میں ہوئی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عون کی پیدائش کے بعد سلطان محمود غزنوی صرف دو سال زندہ رہا۔ کیا دو سال کا دودھ پیتا بچہ شریک جہاد ہو سکتا ہے؟ جو علوی سلطان محمود کے ہمراہ آیا اور لاہور کا نائب السلطنت رہا۔ وہ سالار ساہو ہے اور جس کا بیٹا سید سالار مسعود غازی جہاد بھڑائچ میں جام شہادت نوش کر گئے وہیں مدفون ہوا لیکن نسبتاً یہ حنفی علوی حسینی عباسی نہیں۔

حضرت عون قطب شاہ نے ۵۰۰ھ / ۱۱۰۶ء میں زیر ہدایت حضرت پیران پیر غوث الاعظم بغدادیؒ وارد برصغیر ہوئے اور کالا باغ کے قریب دھنکوٹ کے راجہ کالک سے جنگ کی اور سلسلہ کوہستان نمک کا مغربی علاقہ اپنے زیر تصرف کر کے یہیں پر سکونت اختیار کر لی۔ دوابہ سندھ ساگر میں اعوانوں کا اولین مقام سکونت کوہستان نمک ہی تواتر سے ثابت ہے اور آج تک اس علاقہ میں اعوان ہی بستے ہیں اور اسی علاقہ میں وہ مقام تلہ گنگ نامی ہے جسے آئینِ اکبری میں آوان محل لکھا گیا ہے حضرت عون قطب شاہ کی آمد کے وقت لاہور کی حکومت علاء الدولہ مسعود سوم (۴۹۲ — ۵۰۸ھ / ۱۰۹۹ — ۱۱۱۴ء) کے پاس تھی۔

اس بادشاہ کے متعلق تاریخ فرشتہ مقالہ اول ص ۲۰۵ (اردو) میں تحریر ہے کہ سلطان مسعود

بہت ہی سخی اور نیک طبیعت انسان تھا۔ اس نے بڑے ہی انصاف سے حکومت کی اور ان تمام برائیوں کا قلع قمع کیا جو سلطنت کی تباہی و بربادی کا سبب ہو سکتی تھیں ..... اسی سلطان نے جاگیردار لاہور "حاجب طغا" کو ہندوستان کا سپہ سالار مقرر کیا جس نے دریائے گنگا کو عبور کر کے ہندوستان کے علاقوں میں ہنگامۂ غارت گری گرم رکھا۔ سلطان مسعود ۱۶ سال تک فرمانروائی کر کے ۵۰۸ھ میں فوت ہو گیا"

۵۔ اعوان اور سلاطین غور

لاہور کے غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ خسرو ملک تاج الدولہ تھا۔ اس کی حکومت ۵۵۵ تا ۵۸۲ھ مطابق ۱۱۶۰ تا ۱۱۸۶ء رہی بالآخر ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء میں سلطان شہاب الدین غوری (۵۸۲ـ۶۰۲ھ/۱۱۸۶ـ۱۲۰۶ء) نے اپنے تیسرے حملہ لاہور میں اس خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ سلطان شہاب الدین غوری کی ۵۷۲ھ/۱۱۷۶ء میں آمد سے پہلے حضرت عون قطب شاہ اپنا فریضہ تبلیغ اسلام ختم کر کے واپس بغداد جا چکے تھے۔ کیونکہ آپ کی تاریخ وفات ۵۵۶ھ/۱۱۶۰ء ہے۔ آپ نے اپنے چھ سالہ قیام ہندوستان کے دوران قلعہ دھنکوٹ کے راجہ کلک کی لڑکی سے نکاح کر کے اسے داخل اسلام کر لیا۔ اس بی بی کا اسلامی نام زینب رکھا گیا۔ اس بی بی سے آپ کے ہاں تین لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکوں کے نام مزمل علی کلگان، در یتیم جہاں شاہ، اور زمان علی کھوکھر تھے۔ لڑکی کا نام رقیہ تھا لیکن پہلی بیوی جو کہ حضرت غوث الاعظمؒ کی بیوی کی ہمشیرہ تھیں کے بطن سے آپ کے دو بیٹے عبداللہ گورڑا یا گولڑہ (۴۷۰ھ ـ ۶۰۰ھ / ۱۰۷۸ ـ ۱۲۰۳ء) اور محمد کندلان یا کنڈان (۴۷۵ھ ـ ۶۱۶ھ / ۱۰۸۲ ـ ۱۲۱۹ء) تھے۔

"چند بردائے ایک شاعر گذرا ہے راجہ پرتھوی راج والئے اجمیر و دہلی کا بڑا مداح تھا اس نے اپنے اشعار میں لکھا ہے کہ راجہ پر غنیم شہاب یعنی غوری چڑھ آیا اور مجاہد نامی اسی اثناء میں معزالدین محمود و گورڑا و کندلان و بختیار و قطب وغیرہ آ گئے۔ اور تھانیسر میں تلونڈی پر لڑائی بھاری ہوئی۔ اور راج مسلمانوں کا ہو گیا۔ اور پھر مسلمانوں نے مسلمانانِ لاہور سے راج لے لیا اور آدھے مجاہد مندکور اسی سال الٹے پھر گئے۔ اور آدھے یہاں قلعہ زن ہو گئے۔ اور اسی اثناء میں کئی فقرا اسلام بھی آ گئے اور دین قدیم سے اکثر لوگ پھر گئے۔"

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عون قطب شاہ کی عربی النسل اولاد میں سے عبداللہ گورڑا اور محمد کندلان غوری لشکر میں بطور نامی مجاہدین کے موجود تھے جو کہ فتح لاہور ۵۸۲ھ کے بعد

واپس بغداد چلے گئے۔ حضرت عون قطب شاہ ان سے پہلے بغداد جا چکے تھے اور ۵۵۶ھ/۱۱۶۰ء میں ان کی وفات ہوگئی۔

واضح رہے کہ شمالی ہندوستان میں ارشاد و تبلیغ کے سلسلے میں اگرچہ حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ (۴۰۰ھ - ۴۵۶ھ) کو اولیت حاصل ہے لیکن ان کے بعد اس ضمن میں جن حضرات نے خصوصی امتیاز حاصل کیا ان میں سے اعوانوں کے جدِ امجد حضرت عون قطب شاہ قادریؒ کو اولیت حاصل ہے۔ حضرت معین الدین چشتیؒ دوسرے اور شیخ بہاؤالدین زکریا قریشیؒ ملتانی سہروردی تیسرے نمبر پر آتے ہیں۔ ان ہر سہ بزرگوں سے ہزاروں لاکھوں انسانوں نے فیض حاصل کیا ہے۔

۶۔ اعوان اور خاندانِ غلاماں

سلطان شہاب الدین محمد غوری (۵۸۲ - ۶۰۲ھ / ۱۱۸۶ - ۱۲۰۶ء) لاولد فوت ہوا لیکن اس نے اپنی سلطنت کو اپنے ترکی غلاموں میں تقسیم کر کے ہندوستان کی حکومت قطب الدین ایبک (۶۰۲ - ۶۰۷ھ / ۱۲۰۶ - ۱۲۱۰ء) کو عطا کر دی قطب الدین ایبک سے خاندانِ غلاماں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور شمس الدین کیمورث ۶۸۹ھ/۱۲۸۹ء پر ختم ہو جاتا ہے اس خاندان نے ہندوستان پر تقریباً ۸۳ سال تک حکومت کی۔ کتاب تاریخِ ہند مصنفہ عبدالحکیم پشاوری مطبوعہ مفید ہند پریس میں ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن جو التمش کا غلام اور داماد تھا۔ ۶۶۴ھ/۱۲۶۶ء میں ہندوستان کے تخت پر بیٹھا اور ۲۱ برس حکومت کی۔ یہ بادشاہ بڑا ہیبت تھا... نظام الدین اولیاءؒ دہلی اور امیر خسرو دہلوی اور امیر جہاں شاہ علوی اور شیخ سعدی شیرازی اسی کے عہد میں ہوتے۔

مخفی نہ رہے کہ یہ میر جہان شاہ علوی وہی ہیں جو حضرت عون قطب شاہ کی ہندی نژاد بیوی زینب کے بطن سے تھے۔ اور ان کے متعلق کتاب انساب الاقوام عربی مطبوعہ ایران فصل علوی صد ۳۵ پر لکھا ہے:-

"منجملہ علویوں کے ایک گروہ جہان شاہی ہے اور منسوب ہے جہلن شاہ بن عون بن یعلےٰ کی طرف اور یہ لقب رکھا اس کا اہل ہنود نے کیونکہ وہ ان سے جہاد کیا کرتا تھا اور تیز رو اس کا معنےٰ ہے اور والدہ اس کی ایک شخص رئیس ہندی کی بیٹی تھی جو مسلمان ہو کر عون کے نکاح میں آئی تھی پس اس کے شکم سے کلکان و کھوکھر بھیر رتیہ تولد ہوئی اور اس کی اولاد سے بہت لوگ ہیں۔ (بحوالہ زادالاعوان صد ۱۳۶)

اس عہد کی تاریخ میں دو نام تجنیس خطی کی وجہ سے بڑا الجھاؤ پیدا کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک نام گکھڑ اور دوسرا کھوکھر ہے اور محل وقوع کے اعتبار سے بھی یہ دونوں مختلف الاصل قبیلے باہم خلط ملط ہو رہے ہیں کیونکہ دونوں کا محل وقوع کوہ جودھ بتایا جاتا ہے۔ اور کوہ جودھ درحقیقت سلسلۂ کوہستان نمک کا ہی دوسرا نام ہے جس کے مشرقی سرے پر قلعہ نندونہ یا نندنہ ہے اور یہ قلعہ ازمنۂ قدیم سے جودھ راجپوتوں کے اس خاندان کے زیر تصرف چلا آ رہا ہے جسے آجکل جنجوعہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ چونکہ کھوکھر اور جنجوعے راجپوت الاصل ہیں اس واسطے ممکن ہے کہ یہ ایک ہی خاندان کی دو مختلف شاخیں ہوں

مجھے یاد پڑتا ہے کہ سلطان آف لکھیالہ کے ہاں جو شجرۂ نسب موجود ہے اس میں ایک شخص کا نام جنجوعہ درج ہے جو کہ جودہ کی اولاد سے ہے۔ بہرحال یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ عون قطب شاہؒ کے فیض صحبت سے سلسلۂ کوہستان نمک کے کچھ راجپوت گھرانے جو اپنے آپ کو کھوکھر کہلاتے تھے، مسلمان ہو گئے۔ کیونکہ کتاب انساب الاقوام جس کا حوالہ اوپر گذر چکا ہے، کے صـ۳۶ پر درج ہے:۔

"علوی لوگوں سے ایک گروہ کھوکھر ہے اور وہ منسوب ہے کھوکھر بن عون بن یعلےٰ کی طرف اور یہ لقب اہل ہنود نے اس کا رکھا۔ کیونکہ اس کی والدہ کھوکھر رئیس کی بیٹی تھی اور وہ ایک قوم ہے اہل ہنود سے اور اس کی اولاد بہت ہے لیکن مختلط النسل ہے اس واسطے کہ تحقیق کھوکھر دو قومیں ہیں ایک اس سے دزمان علی کھوکھر بن عون قطب شاہ، اور دوسری اہل ہنود سے، اور دونوں قومیں ایک ہی نام سے مشہور ہیں۔ اور دونوں قومیں اسلام میں ہیں ۔۔۔۔ اور بعض ان سے ملک ہند میں اور بعض ایران میں اور بعض دوسرے ملکوں میں پھیل گئیں۔"

تاریخ کوہستان عربی قلمی از محمد ذکریا ابن ابراہیم دامغانی میں ہے:۔

"کھوکھر بضم کاف منسوب ہے طرف کھوکھر کی۔ اور وہ قوم ہے ایک اصلی باشندگان ہند سے اور اکثر ان کے ہو گئے اسلام میں، اور بعض ان سے اسی پرانے مذہب پر ہیں اور اسی قوم سے بیٹا عون کا تھا یعنی والدہ اس کی کھوکھروں سے تھی اور پھر اولاد اس کی اس کی طرف منسوب ہوئی اور یہ جو کہا گیا ہے کتب ہنود میں کھتری و چھتری پس ان سے چوہان و گھلوت و کھوکھر و کچھواہیہ وغیرہ گروہ ہیں (بحوالہ زاد الاعوان صـ۱۴۰)"

تاریخ مخزن ہند مصنفہ منشی ہنومان پرشاد قوم کائستھ قنوجی مطبوعہ نولکشور فصل پنجم صـ۱۲۲ پر ہے

"گویند کہ میر قطب نام شخصے از بغداد بہند آمد سہ زنانِ ہند در عقد آوردہ بود نذد از ایشاں نسل بسیار شد"

ترجمہ :۔ "کہتے ہیں کہ میر قطب نام ایک شخص بغداد سے ہندوستان میں آیا اور تین عورتوں سے نکاح کیا۔ ان سے بہت اولاد ہوئی۔"

رپورٹ مردم شماری پنجاب ص ۲۵۷ سے پتہ چلتا ہے کہ :۔

"مغربی پنجاب میں ایسے کھوکھر موجود ہیں جو اپنے آپ کو غزنین کے قطب شاہ کے بڑے لڑکے محمود کی نسل سے ہونے کے دعویدار ہیں حالانکہ مشرقی پنجاب کے تمام کھوکھر اپنے آپ کو راجپوت سمجھتے ہیں کھوکھر وسیع علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور کسی وقت بڑے طاقتور تھے۔ ان کی اکثریت دریائے جہلم اور چناب کی وادیوں میں پھیلی ہوتی ہے۔ خاص کر اضلاع جھنگ اور شاہ پور میں۔"

اس تفصیل سے یہ بتانا مقصود تھا کہ خاندانِ غلاماں کے سلطان ناصر الدین محمود شاہ (۶۴۴-۶۶۴ھ / ۱۲۴۶-۱۲۶۶ء) کے عہد میں گوجر دھ کے گرد و نواح میں جو کھوکھر ۱۲۴۷ء میں زیر عتاب سلطانی آئے تھے ممکن ہے ان میں اعوان کھوکھر اور راجپوت کھوکھر دونوں ہی ہوں یا صرف کھوکھر راجپوت ہوں کیونکہ ان کا تصور صرف اتنا تھا کہ ان کے کسی رانا نے مغل حملہ آوروں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیئے تھے۔ (بحوالہ ارلی ٹرکس ایمپائر آف دہلی از ڈاکٹر محمد عزیز احمد ص ۲۲۵)

۷۔ اعوان اور امیر تیمور

خاندانِ غلاماں (۶۰۲-۶۸۹ھ / ۱۲۰۶-۱۲۸۹ء) کے زوال کے بعد خاندانِ خلجی برسرِ اقتدار آیا۔ اس خاندان کا خاتمہ ۷۲۱ھ/۱۳۲۱ء میں ہوگیا اس عہد میں اعوانوں کی تاریخ پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن خاندانِ تغلق (۷۲۱-۸۱۵ھ / ۱۳۲۱-۱۴۱۲ء) کے دورِ حکومت میں جب امیر تیمور نے ۸۰۱ھ/۱۳۹۱ء میں ہندوستان پر بعہد نصرت شاہ (۷۹۷-۸۰۲ھ/۱۳۹۴-۱۳۹۹ء) حملہ کیا تو اس وقت دوابہ سندھ ساگر میں کالاباغ کے قریب اپنے اصلی وطن میں اعوانوں کا پھر ذکر آتا ہے۔

امیر تیمور اپنی مشہور و معروف تزک مترجمہ مولوی محمد انشاء اللہ مطبوعہ جارج سٹیم پریس لاہور ص ۷۵-۷۶ میں تحریر کرتا ہے۔

"اور پھر دار العرب ہندوستان کے راستہ میں اوغانیوں کی جو شریر جماعت سدِ راہ اور موجب زحمت

تھی اون کو رام اور ہموار کرنے کی میں نے یہ تجویز کی کہ جس وقت بعض اوغانیوں کا ارادہ ہندوستان میں راہ زنی کرنے اور آیند و روند کو چھیڑنے کا میں نے سن پایا اور معلوم کیا کہ خاص کر موسیٰ خان اوغان جو کہ قبیلہ کرکس کا سردار کلاں ہے اور اس نے امیر زادہ پیر محمد کے مقرر کردہ لشکر شاہ اوغان پر جو کہ میرا طالب ہوا خواہ تھا اور قلعہ ایراب (دھنکوٹ) کی محافظت کر رہا ہے۔ حملہ کر دیا ہے اور اوس کو قتل کر کے تمام ساز و سامان جو کچھ بھی قلعہ میں موجود تھا یا نہ تھا لوٹ لے گیا ہے نیز اسی وقت لشکر شاہ مقتول کا بھائی ملک محمد بھی میرے دربار میں آکر فریادی ہوا کہ موسیٰ خان نے ظلم و تعدی کر کے اوس کے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔ میں نے مصلحت و تدبیر سے کام لیا اور حکم دیا کہ ملک محمد کو قید کر لیں اور موسیٰ خان کی نسبت برملا کہا کہ وہ میرا ہوا خواہ اور مخلص ہے۔ میرے سرداران سپاہ و امیران دربار کو میری یہ حرکت ناگوار گذری .....

موسیٰ کو ملک محمد کے قید کئے جانے اور میرے کلام کی خبر ملی تو وہ قوی دل ہو گیا اور جونہی میرا فرمانِ طلبی جو میں نے اس کے نام بھیجا تھا اوسے ملا بے دہشت و بلا تامل حاضر ہو کر قلعہ میری نذر کر دیا"

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوغان سے کیا مراد ہے۔ اور یہ کونسا قبیلہ ہے؟

فرشتہ نے اپنی تاریخ جلد اوّل (اردو) صفحہ ۵۱۱ پر ایک امیر کا نام فیروزا اوغان لکھا ہے جو کہ سکندر لودھی کے عہد کا ایک مشہور جرنیل تھا۔ جناب اے حلیم اپنی انگریزی کتاب ہسٹری آف لودھیز کے صفحہ ۱۴۲ پر اسے فیروز اعوان لکھتے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اوغان دراصل اعوان ہے۔ علاوہ ازیں امیر تیمور کے حملۂ ہند کے وقت ایک اور مقام پر بھی ایک اعوان کا ذکر آتا ہے۔ فرشتہ اپنی تاریخ کے صفحہ ۵۳۶ پر لکھتا ہے :-

الیاس اعوان عالی قلعہ میرٹھ پر حملہ کے وقت سرنگ لگانے والوں میں سے ایک تھا۔

گویا کہ یہاں فرشتہ اعوان کا لفظ صاف طور پر لکھتے ہوئے اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ اعوان (اوغان) لشکرِ تیموری میں شامل تھے۔

۸۔ اعوان اور لودھی خاندان

تحت دھلی پر لودھی سلاطین ۸۵۲ تا ۹۳۲ ھ / ۱۴۴۸ء۔ ۱۵۲۶ء تک متمکن رہ چکے ہیں۔ ان کے عہد میں فیروز اوغان اور اس کا بیٹا اسماعیل نامی گرامی جرنیل تھے۔ سلطان عادل نظام خان سکندر لودھی ۸۹۴ تا ۹۲۳ھ (۱۴۸۹ء - ۱۵۱۷ء) نے کالپی کی حکمرانی جلال خان بن محمود خان سے لے کر فیروز اوغان کو دے دی تھی

واقعہ کے بارے میں فرشتہ صفحہ ۵۹۹ پر لکھتا ہے کہ

"جلال خان کے دونوں بھائی بھکن خان اور حاجی خان اس سے معرکہ آرا تھے لہٰذا بادشاہ نے کالپی کی حکمرانی جلال خان سے لے کر فیروز اوغان کو دے دی اور وہ اس شہر کا حکمران مقرر ہو گیا۔ اوغان نام کا ایک قبیلہ ہے جو افغان سے مشابہت رکھتا ہے"

اسی طرح جنگ گوالیار کے وقت (۹۲۵ھ / ۱۵۱۸ء) بعہد ابراہیم لودھی (۹۲۳-۹۳۲ھ / ۱۵۱۷-۱۵۲۶ء) ملک اسماعیل بن فیروز اعوان بھی منجملہ سرداران لشکر کے ایک تھا (بحوالہ ہسٹری آف لودھی از لعل حلیم صفحہ ۸۶)

اعوان اور خاندان مغلیہ

اس خاندان کا بانی ظہیر الدین بابر (۹۳۲-۹۳۷ھ / ۱۵۲۶-۱۵۳۰ء) تھا اور اس کا خاتمہ احمد شاہ ابدالی (۱۱۷۳-۱۱۸۲ھ / ۱۷۵۹-۱۷۶۸ء) پر ہوا۔ آئین اکبری از شیخ ابو الفضل علامی سے پتہ چلتا ہے کہ علاقہ تلہ گنگ (ضلع گنگ) میں اعوانوں کا اس عہد میں بڑا زور تھا چنانچہ مالگزاری کے پرگنہ کے طور پر اس علاقے کا نام اعوان محل لکھا گیا ہے۔ اسی علاقے کو قرآن شریف کے بکثرت پڑھنے پڑھانے کی وجہ سے آجکل "اعوان قاری" کہا جاتا ہے۔ مولوی حیدر علی اعوان لودھیانوی اپنی کتاب تاریخ علوی میں لکھتے ہیں کہ عہد اکبری سے پہلے لودھیوں کے عہد میں بموجب مولف تاریخ شہر لدھیانہ قبیلہ اعوان لدھیانہ میں آباد تھا۔

۱۰۔ اعوان اور ٹیپو سلطان

مفتی حسین تبسم کا خیال ہے کہ ٹیپو سلطان کے آباؤ اجداد علاقہ اعوان قاری سے نقل مکانی کر کے دکن میں گئے تھے لیکن جب بذریعہ خط میں نے ان سے اس دعوے کی تائید میں کوئی تاریخی ثبوت یا کسی ایسے خاندان کا اتہ پتہ مانگا جو اس امر کا دعویدار ہو کہ سلطان ٹیپو ان کا ہم جد تھا تو وہ سوائے اس کے کہ انہوں نے کہیں پڑھا ہے۔ اب حوالہ یاد نہیں رہا، سے اور کچھ نہ بتا سکے۔ میں نے خود اس ضمن میں جو کچھ تحقیق کیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے۔

(۱) کرنل ولکس اپنی کتاب تاریخ میسور میں لکھتا ہے کہ بعض تاریخی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ حیدر علی (والد ٹیپو سلطان) کے آباد اجداد پنجابی تھے۔ ان میں محمد بہلول نامی ایک شخص پنجاب سے نکل کر گلبرگہ آیا اور وہاں اقامت اختیار کی، یہاں اس کے دو لڑکوں محمد علی اور محمد ولی میں سے محمد علی کی شادی ہوئی۔

(۲) صاحب نشان حیدری لکھتے ہیں۔ کہ حیدر علی کے آباد اجداد صحیح عربی النسل عرب اور قبیلہ قریش سے تھے۔

(۳) لارڈ ولنشیا بھی حیدر علی کو عربی النسل ہی سمجھتا ہے۔

(۴) بعض مورخ انہیں افغانی النسل کہتے ہیں (بحوالہ تاریخ سلطنت خداداد میسور از محمود بنگلوری صفحہ ۴۲ تا صفحہ ۴۵۔

ان تمام بیانات پر ایک ساتھ نظر ڈالنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ٹیپو سلطان کے آباؤ اجداد اعوان قبیلے کے فرد تھے۔ کیونکہ اعوان قاری علاقہ پنجاب کے یہ لوگ عباسی علوی النسب ہونے کی وجہ سے قریشی اور عربی بھی ہیں۔ جن کے بزرگ عرب سے ترک سکونت کر کے بغداد میں آئے اور پھر وہاں سے حضرت عون شاہ وارد ہند ہوئے۔

پروفیسر محمد اکبر صاحب اپنی کتاب "پنجاب انڈر دی مغلز" صفحہ ۲۴۰ پر لکھتے ہیں کہ اعوان (قاری) واقع سندھ ساگر دوآب گھوڑوں کی پرورش کے لئے بڑا اچھا خطہ تھا" عربوں اور گھوڑوں کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اس حقیقت کی تائید تاریخ سندھ از سید ابوظفر ندوی صفحہ ۳۲۴ سے بھی ہو رہی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ عرب گھوڑوں کی حفاظت اور پرورش پر زیادہ توجہ دیتے تھے" بقول پروفیسر محمد اکبر مغلیہ عہد میں پنجاب کی منجملہ برآمدات ایک گھوڑے بھی تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اعوان قاری کے لوگ یہاں سے گھوڑے وغیرہ تجارت کے لئے کر اکثر جنوبی ہند میں جاتے رہتے تھے اور انہوں نے وہاں پر اپنی بستیاں بھی بسائی تھیں ایسی ہی ایک بستی کا نام اعوان ہے جو مالوہ اور خاندیش کے درمیان واقع ہے اس بستی کا ذکر سٹری آف افغانز ان انڈیا صفحہ ۱۴۰ پر بدیں الفاظ موجود ہے۔

"بہاز بہادر والئے مالوہ مغلوں سے شکست کھانے کے بعد مالوہ اور خاندیش کے جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا بیچ گڑھ میں اعوان کے مقام پر پیر محمد خان سردانی نے اسے پھر شکست دی"

یہی حوالہ اکبر نامہ ابوالفضل صفحہ ۱۶۶ اور مآثر الامراء جلد اوّل صفحہ ۳۹۰ پر بھی موجود ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ٹیپو سلطان افغان النسل تھا! ان کی غلطی کا باعث شاید معلوم ہوتا ہے کہ بقول فرشتہ صفحہ ۵۹۹ اوغان ایک قبیلہ کا نام ہے جو افغان سے مشابہت رکھتا ہے جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ اوغان دراصل اعوان ہے جو کہ تیموری لشکر اور پھر لودھی افغانوں کے لشکر میں ممتاز عہدوں پر فائز ہونے کی وجہ سے مورخین نے بلا تحقیق انہیں افغان لکھا حالانکہ اعوانوں کا افغانوں سے کوئی نسبی تعلق نہیں ہے۔

اس مسئلہ پر ایک اور پہلو سے بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ سٹین گاس کی فارسی انگریزی ڈکشنری میں

ارغان اور افغان کو ہم معنے قرار دے کر منجملہ دیگر معانی کے LAMENTATION بھی دیا ہوا ہے لیکن تاریخ افاغنہ جلد اوّل مرتبہ محمد شہاب الدین مطبوعہ حمیدیہ پریس لاہور کی رو سے افغانوں کا کوئی قبیلہ او غان نہیں ہے البتہ افغانوں سے ملتا جلتا قبیلہ اعوان محدودسی تعداد میں اب تک افغانستان میں موجود اور آباد ہے (ص۱۱۴)۔ لہٰذا اعوان ہی ایک ایسا عربی النسل قریشی قبیلہ ہے جس پر غلط فہمی سے افغان کا لیبل چسپاں ہو سکتا ہے۔

واضح رہے کہ اعوان قبیلے کا سردار اعلیٰ نواب کالاباغ آج تک قلعہ دھنکوٹ (دینکوٹ ایلب) کے قریب نیازی پٹھانوں کی اکثریت کے علاقے میں برسر اقتدار موجود ہے۔ اعوانوں کے مورث کا شجرہ نسب یوں ہے۔ عون قطب شاہ بن قاسم یعلےٰ بن حمزہ ثانی بن طیار بن قاسم بن علی بن جعفر بن حمزہ اول بغدادی بن حسن بن عبداللہ مدنی بن عباس علمدار غازی کربلا بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ

پس جب تک کوئی اور حتمی ثبوت ہاتھ نہ لگ سکے جو ہمارے خلاف پیش کیا جا سکے تب تک کسی کو یہ بات تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیئے کہ سلطان ٹیپو شہید کے اجداد علاقہ اعوان کاری سے نقل مکانی کر کے دکن میں گئے اور سلطان شہید اعوان قبیلے کا وہ ممتاز فرد ہے جس نے سب سے پہلے برصغیر میں آزادی و خود مختاری کا نعرہ بلند کیا اور اس اعلائے کلمۃ الحق میں اپنا قیمتی خون تک بہانے سے دریغ نہ کیا۔

۱۱۔ اعوان اور انگریز

اعوانوں کے خصائص کے متعلق کتاب مردم شماری ۱۸۸۱ء میں لکھا ہے کہ اعوان اگرچہ اپنا چال چلن ہوشمندی کی بناء پر اور کفایت شعاری پر رکھتے ہیں مگر اکثر اوقات بڑے بے صبر ہو کر نہایت احمقانہ درشتی کر بیٹھتے ہیں۔ کینہ توز بھی ہیں اور قومی جھگڑوں کو مدتوں تک نہیں بھولتے۔ بدلہ لے کر چھوڑتے ہیں۔۔۔۔ یہ بہادر اور پُر جوش قوم ہے۔

لالہ جیارام مرتب جغرافیہ ضلع شاہ پور نے اعوانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ اعوان بڑے بہادر ہیں۔ جنجوعوں سے ان کے بڑے معرکے رہے ہیں۔ ان کے مزاج میں لڑاکا پن بہت ہے مدتوں تک کینہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح ٹوانہ لوگوں سے بھی ان کے بڑے معرکے ہوئے ہیں اور کل پہاڑی علاقہ پہلے جنجوعوں کا تھا۔ اعوان لوگوں نے زور پکڑ کر انہیں زیر کیا اور ان کا علاقہ چھین لیا۔ آجکل پہاڑ کا علاقہ جو شاہ پور (سرگودھا) میں ہے انہی اعوانوں کا ہے۔

چنانچہ انہی جنگجویانہ خصائل کا نتیجہ ہے کہ اگر انہیں اور کوئی کام نہ ہو تو یہ آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے

ہیں۔ انگریز بڑی مردم شناس قوم تھی۔ اس نے ان کی نفسیات کا مطالعہ کر کے انہیں دھڑا دھڑ اپنی فوجوں میں بھرتی کرنا شروع کر دیا اور دورِ غلامی میں انہوں نے ایسی بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ چنانچہ پہلی عالمگیر جنگ (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) کے متعلق کے اہل برلیا مام نے جنگ یورپ کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں اس نے اعوانوں کی جنگ میں شمولیت اور ان کی دلیری و حوصلہ مندی کی داد پُر زور الفاظ میں دی ہے چنانچہ انہی جنگی خدمات کے صلہ میں صوبیدار فتح خان اعوان سکنہ دلیال کو ایک توپ اعزاز کے طور پر دی گئی جو کہ آج تک بطور یادگار موجود ہے اور ہر آنے جانے والے سے خراجِ تحسین حاصل کر رہی ہے۔

۱۲- اعوان اور دورِ آزادی

اعوانوں کو توائے جسمانی کی توانائی عطیۂ فیاض سے نسلاً بعد نسل ودیعت ہوتی ہے اور یہ واحد قبیلہ ہے جس کے توائے جسمانی پر برصغیر کی مرت کرنے والی آب و ہوا کا کوئی مضر اثر نہیں ہوا۔ بہادری و شجاعت، حمیت و غیرت، نعمتوں پر شکر اور مصیبتوں پر صبر کرنے کی نسلی خصوصیات کا مظاہرہ اعوانوں نے من حیث الجماعت تقسیم ملک کے خونیں فسادات (۱۹۴۷ء) کے دوران بھی کیا، جب کہ اس قوم کو مشرقی پنجاب کے اضلاع جالندھر، لدھیانہ اور ہوشیار پور سے آگ اور خون کے دریا ہیں کر قافلوں کی صورت میں پاکستان کی سرحد کی طرف آنے پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن چوہدری عبد الکریم اعوان سکنہ بڈیرہ وغیرہ جیسے سرداروں کی زیر قیادت جس شان و شوکت سے یہ قبیلہ آیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی یہ واحد قبیلہ ہے جس نے اپنی کوئی لڑکی یا عورت مشرقی پنجاب میں غیر مسلموں کے ہاتھ نہیں لگنے دی بلکہ خون آشام درندوں کو اتنی جرأت ہی نہیں ہو سکی کہ وہ ان کی گرد کو بھی چھو سکیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد ستمبر ۱۹۶۵ء کے معرکہ میں حق و باطل میں دیگر اقوام پاکستان کے دوش بدوش مادرِ وطن کے دفاع میں اس قوم کے سپاہیوں اور جرنیلوں نے جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں وہ قابلِ فخر ہیں اس قبیلے نے افواجِ پاکستان کو نذیر احمد مرحوم، حق نواز، ملک شیر بہادر، سرفراز خان، ملک اختر حسین جیسے جرنیل اور فضائیہ کو ائیر مارشل نور خان ملک جیسا کمانڈر انچیف عطا کر رکھے ہیں آئندہ بھی جب کبھی ملک و ملت پر چشم بد دور کوئی کٹھن وقت پڑا تو انشاء اللہ یہ قوم اور اس کے فرزند ہراول دستوں میں ہی نظر آئے گی۔

پاکستان کی دفاعی سروسیں تو ان کی جولاں گاہ مدتوں سے چلی آ رہی ہیں لیکن ملک کی سیاسی زندگی میں یہ قوم اپنی پچیس ۲۵ تیس لاکھ آبادی کے باوجود دیگر اشغال و اسباب کے باعث کسی قدر پسماندہ ہی رہی، اگر اس قوم کا سیاسی شعور بیدار ہو جائے اور اس کی سیاسی تنظیم بھی کما حقہ، ہو جائے تو پھر کوئی وجہ نظر

نہیں آتی کہ یہ قوم پاکستان کے مطلع سیاست پر مہر درخشاں کی طرح چمکتی کیوں نظر نہ آئے بہر حال اتنا بھی غنیمت ہے کہ تقسیم ملکی سے پہلے میاں عبدالحی مرحوم اور تقسیم ملکی کے بعد نواب کالاباغ ملک امیر محمد خان گورنر مغربی پاکستان، ملک محمد حیات ٹمن، ملک محمد قاسم اور ملک اللہ یار وغیرہ مطلع سیاست پر نمودار ہو چکے ہیں۔

سماجی اور تعلیمی میدان میں اس قوم کو اپنا صحیح مقام دلانے میں خادم قوم بابا لال خان اعوان مرحوم بانی رسالہ الاعوان لاہور اور ملک سیٹھ عباس خان اعوان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

۱۳۔ اعوان اور تبلیغ اسلام

تبلیغ اسلام کے سلسلے میں بھی اس قبیلہ نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں حضرت عون قطب شاہ کا پہلا معرکہ راجہ کلک والئے دھنکوٹ سے ہوا لشکر اسلام کو فتح حاصل ہوئی اور سون سیکسر کے ہندو راجپوت اور گکھڑ کثیر تعداد میں مشرف باسلام ہوئے ان کے بعد ان کے لڑکوں عبداللہ گوررڑا، محمد کندلان، زمان علی کھوکھر، محمد علی چوہان اور محمد علی کلکان جو سب کے سب مجاہد تھے، پہاڑ کے ہندو راجگان (کھوکھر، جنجوعہ، چوہان وغیرہ) سے خوب معرکے کئے گئے۔ گورڑا اور کندلان تو محمد غوری کے اس لشکر میں بھی شامل تھے۔ جس نے پرتھوی راج کو تلونڈی کے مقام پر شکست دے کر قتل کیا تھا ان میں سے عبداللہ گولڑہ کی فتح کی یادگار آج تک خوشاب سیکسر سڑک پر گولڑا نامی گاؤں کی شکل میں موجود ہے زمان علی کھوکھر نے بمقام کڑانہ نزد سرگودھا ایک ہندو کھوکھر راجہ سے جنگ کی رانی بھرتہ اسی جنگ میں زمان علی کھوکھر کے ہاتھ آئی جس کی اولاد آج تک کھوکھر اعوان کہلاتی ہے۔

علاقہ دھنار کا ایک گاؤں وٹیاں کسی زمانے میں جنجوعوں کا گڑھ تھا۔ ملک شہزادہ اعوان جس کی اولاد آجکل نور پور سیٹھی اور ملانی میں شہیال کہلاتی ہے، کی جنگیں جنجوعہ راجپوتوں کے ساتھ بڑی مشہور ہیں۔ اسی جگہ کے قریب ہی راجہ جنگش خان جنجوعہ کا قلعہ سمرقند بھی ہے۔ جنجوعوں کے ساتھ اعوانوں کا آخری معرکہ رنیال کے مقام پر ہوا اور جنجوعہ راجہ بھاگ کر قلعہ ملوٹ (وادی کہون) میں پناہ گزین ہو گیا۔ اس طرح علاقہ دھنار پر اعوانوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔

تصوف اور طریقت میں بھی اس قوم کو وافر حصہ ملا ہے حضرت عون قطب شاہ قادریؒ کے علاوہ حضرت سلطان العارفینؒ، سلطان باہوؒ، حافظ رحمت اللہؒ، سلطان ابراہیم ساڑی والاؒ، حافظ محمد عظیم ٹی پٹ اویسیؒ، شیر محمد لودھیانویؒ، شمس الدین سیالویؒ، حافظ محمد جمال ملتانیؒ، خواجہ محمد عبدالرحمن چھوہر شریف ہری پور

ہزارہ وغیرہ اسی خاندان اعوان کے چشم وچراغ ہیں ۔

۱۴۔ اعوانوں کی آبادیاں

اعوانوں کی آبادیاں ملک کے دور دراز حصوں تک پھیلی ہوئی ہیں آجکل اعوان ریاست کشمیر، پشاور، ہزارہ، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان کیمبل پور، راولپنڈی، میانوالی، جہلم، سرگودھا، گجرات، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، لاہور، جھنگ اور ملتان کے اضلاع میں پائے جاتے ہیں تقسیم ملکی سے پہلے اضلاع لودھیانہ، جالندھر، ہوشیارپور، اور امرتسر میں بھی ان کی کافی آبادیاں تھیں (جنوبی ہندوستان میں مالوہ اور خاندیش کے درمیان (AWAN) موضع اعوان بھی ان کی ایک بستی تھی علاوہ ازیں اس قبیلہ کے افراد آج بھی افغانستان میں آباد ہیں اور ایرانی خراسان کے اہلیان میں تو اعوان لو بڑا مشہور قبیلہ ہے یہ سحر النشین اور گلہ بان ہیں بندوق کے نشانہ میں ماہر ہوتے ہیں ۔

(بحوالہ منتخب التواریخ بداؤنی اُردو صد ۱۴۵ حاشیہ نمبر۱)

علاقہ دھنی میں اعوانوں کی بستیاں یہ ہیں :۔

سرکال کسر، سوہیر، کھارا، ڈیری انوال، تھرچک، میرا، کلرکہار، کھائی، میگن، بپلو، رتہ، بھرپور آیت وغیرہ۔ موضع بھون میں بھی اعوانوں کی آبادی تو کافی ہے لیکن یہاں پر یہ ایک پس ماندہ اور غیر منظم گروہ ہے اس قبیلے کی مشہور گوتیں کوٹ، بڈے، ودھنال اور جھنگل ہیں ۔

تاریخ گڈھوک

گلدستہ تاریخ قوم گڈھوک قلمی از شیخ نور الدین (وفات ۱۹۰۵ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ گڈھوک پہلے ہندو راجپوت تھے۔ اور سلطان شہاب الدین محمد غوری (۱۱۷۳ء۔ ۱۲۰۶ء) کے عہد میں (۶۰۲ھ/ ۱۲۰۶ء) ریاست بیکانیر کی طرف سے کوہستان نمک میں آئے اور ملوٹ (تاریخ بنیاد ۹۸۰ء) کے مشہور و معروف مقام پر رہائش اختیار کی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا مورث اعلیٰ کالیداس جو کہ بابا کالیداس کے نام سے مشہور ہے۔ وہ راجے چندول کی اولاد سے ایک بڑا رئیس اور عالی مقام راجہ تھا۔ اس وقت کوہستان نمک میں دور دراز تک کوئی آبادی نہ تھی۔ سوائے کٹاس کے جو کہ ایک نمکین چشمہ کے کنارے تھا۔ (اور اب بھی ہے) اور کوہستان نمک کے شمال میں جو علاقہ ملوکی دھن کے نام سے مشہور ہے۔ وہ اس وقت زیر آب ڈل یا ٹہنڈ کی صورت میں تھا۔ حتیٰ کہ بادشاہ ظہیر الدین بابر کا اس طرف سے گذر ہوا اور شاہی لشکر کٹاس کے مقام پر فروکش ہوا۔ اس وقت بادشاہ کا خیمہ پہاڑ کی چوٹی پر تھا۔ جب بادشاہ کی نظر اس پانی پر پڑی۔ تو اس نے پوچھا کہ کیا اس پانی کے گذرنے کا کوئی راستہ نہیں؟ لوگوں نے وہاں عرض کیا۔ کہ سالہا سال سے یہ پانی یہیں کھڑا ہے۔ اور کسی طرف جانے کا راستہ نہیں ہے۔

بادشاہ نے پوچھا کہ کیا اس علاقہ میں کوئی نامور اور بااقتدار آدمی ہے؟ لوگوں نے کہا کہ وہاں ملوٹ شہر میں راجے کالیداس ہے۔ جو کہ بڑا عالم فاضل اور عقلمند شخص ہے۔ بادشاہ کے طلب کرنے پر بابا کالیداس حاضر خدمت ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ جب بابا کالیداس بادشاہ کے حضور میں پہنچا۔ اس وقت بادشاہ اس پتھریلی چٹان پر بیٹھا تھا۔ جو اب تخت بابری کے نام سے مشہور ہے۔ کالیداس اس قدر طویل قامت تھا۔ کہ جب وہ تخت بابری کے پاس کھڑا ہوا۔ تو اس کا سر تخت پر بیٹھے ہوئے بادشاہ سے بھی اونچا تھا بادشاہ نے کالیداس کو ڈل خشک کرنے کا کام سپرد کیا۔ اور شاہی فرمان معہ

ضروری مدارج کے صادر کر دیا۔ بادشاہ خود کابل کی طرف لوٹ گیا۔ کالیداس اپنے شہر واپس آیا اور ملّو باشندہ ملوٹ کے ہمراہ ڈل پر پہنچا۔ اور اس کے چاروں طرف گھوم پھر کر جائزہ لیا۔ پس وہ کرنگلی پہاڑ (کوہ جودہ) کے مشرق میں پہنچا۔ تو اس نے ایک جگہ دیکھی جو کہ اردگرد کے پہاڑوں کی نسبت کسی قدر نیچی تھی۔ چنانچہ تجویز ہوا کہ پانی کا اخراج اس جگہ سے عمل میں لایا جائے۔ چنانچہ لوگوں کو پہاڑ کھودنے پر لگا دیا۔ اور تھوڑے عرصہ میں ہی یہاں سے پانی گذر کر دریائے جہلم میں گرنے لگا۔ اس درہ کا نام گھوڑی کا لا رکھا گیا۔ یعنی گھوڑی کے گذرنے کا راستہ چنانچہ ابھی تک پہاڑ کھودنے کے نشانات موجود ہیں۔

البتہ جب پانی کا اخراج عمل میں لایا جا چکا تو بابا کالیداس پہاڑی علاقوں میں گیا یعنی جھنگڑ، کاہون اور دہنانہ وغیرہ کے علاقوں میں ہر موضع سے دو دو تین تین گھروں کو خانہ بدوش کر کے اس سرزمین میں برابر فاصلہ پر آباد کر دیا۔

چنانچہ ایک حصہ میں ہوتوں کو کھوٹانی کے نام سے دوسرے حصے میں قوم مائر کو بنام موہلی اور تیسرے حصے میں قوم قصرائے (کسر) اور چوتھے حصے میں مختلف قوموں کو چونوہا نام سے آباد کر دیا۔ پس اس تمام جگہ پر جہاں پہلے پانی تھا۔ اور اب وہ خشکی بن چکی تھی۔ چوراسی چھوٹے چھوٹے گاؤں بسا دیئے۔

چونکہ ملک پنجاب میں آفرین اور شاباش کے کلمہ کے طور پر دھن کا لفظ مستعمل ہے اس لئے اردگرد کے لوگوں نے بابا کالیداس کو اس کارنامے پر شاباش اور واہ واہ کے ڈونگرے برسانے شروع کر دیئے۔ کہ کالیداس دھن ہو۔ اس واسطے اس علاقے کا نام دھن پڑ گیا۔ اس علاقہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ایک اور روایت بھی ہے کہ علاقہ زیر بحث میں چھل اور گہری جگہوں کو جہاں پانی ٹھہر رہ جاتے۔ ڈھنڈ یا ڈھن کہتے تھے۔ پانی خشک ہو جانے اور اس زمین کے آباد ہو جانے کے بعد بھی پہلے کی طرح اس علاقے کا نام ڈھن ہی رہا۔ اور کثرت استعمال سے حرف ڈال دال سے تبدیل ہو گیا۔ اور اس کا نام دھن پڑ گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ چونکہ پہلی دفعہ اس

لے علاقہ جھنگڑ کاہون اور دہنانہ میں کسریا اور اقوام کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ جھنگڑ کے ایک گاؤں میں چند گھر مائروں کے ہیں لیکن وہ علاقہ دھن سے وہاں گئے یعنی کہ ادھر سے ادھر آئے ہیں۔ ۱۲

علاقہ کو چوراسی گاؤں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ اس لئے اس کا نام دھن چوراسی بھی ہے۔ جب بابا۔ کالیداس اس کام سے فارغ ہو گیا تو بابر کابل سے ہندوستان آیا۔ جب بادشاہی لاؤ لشکر نے کلر کہار کے مقام پر قیام کیا۔ تو کالیداس نے حاضر خدمت ہو کر بابائی کی نکاسی اور علاقہ کی آبادی کا سارا حال کہہ سنایا۔ بادشاہ اس کارگذاری پر بڑا خوش ہوا۔ اور کالیداس کو خاص خلعت گھوڑے اور انعام سے سرفراز کیا۔ نیز دھنی کے سات گاؤں موہڑہ شیخاں ما رام شینہ۔ رتہ۔ ریہنہ بھٹی۔ جیسر پور اور منوال بطور جاگیر کالیداس کو عطا کئے۔ اور اس ملک دھن کا ذمہ دار مقرر کر دیا۔

جب یہ کچھ ہو چکا تو بابا کالیداس نے بادشاہ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد مزید عرض کی:

چیزے رسوم برائے بندہ تعین شود تا کہ بر صفحہ روزگار یادگار بماند و نیز بہ پس ماندگان می بکار آید۔ کیونکہ علاقہ آپ کے اقبال اور بندہ کی کوشش سے آباد ہوا ہے۔ یہ درخواست قبول کرتے ہوئے بادشاہ نے حکم دیا کہ علاقہ دھن کے مالیہ میں سے دو فیصدی رائے کالیداس اور اس کے متعلقین کو بطور رسوم دائمی کے مقرر کر دیا جائے۔ چنانچہ فرمان لکھ دیا گیا۔ اور مذکورہ رسوم اس وقت سے لے کر سرکار انگریزی کی عملداری کے آغاز تک قائم رہا۔ لیکن جب سرکار انگریزی کا عمل دخل ملک پنجاب میں جاری ہو گیا۔ تو بابا کالیداس کی تمام اولاد کیا۔ ہندو اور کیا مسلمان بخدمت لاک صاحب مہتمم بندوبست سرسری ضلع جہلم بمقام پنڈدادنخان حاضر ہوئی۔ اور مقررہ رسوم کے عطا کئے جانے کی درخواست گزاری۔ مہتمم بندوبست نے حکم دیا۔ کہ رسوم مقررہ تبھی آپ کو مل سکتی ہیں۔ جب کہ آپ اپنی اولاد کو پٹواریوں کی بجائے مقرر کروائیں۔ اور وہ یہ دو فیصدی وصول کر کے تمہیں دے دیا کریں۔ چونکہ کسی نے اس تکلیف کو برداشت کرنا گوارا نہ کیا۔ لہذا اس دن سے رسوم (بندھان) ضبط ہو گیا۔ اور اس کے بعد ایک پھوٹی کوڑی تک کسی کو نہ ملی۔

الغرض جب بابا کالیداس کو شاہی انعام واکرام سے لاد دیا گیا۔ تو اپنے معاون و مددگار راجہ ملو کی یادگار کے طور پر بابا کالیداس کی التماس پر اس علاقہ کا نام ملو کی دھن مقرر کر دیا گیا۔

بعد ازاں کالیداس ملوٹ سے ترک سکونت کر کے موضع کلر کہار میں آ گیا اور ملک دھن کی آباد کاری میں اپنی موت تک مصروف رہا۔ اسے کلر کہار ہی میں دفن کیا گیا۔ چنانچہ کالیداس

کی سمادھ (مڑھی) آج تک گلر کہار میں موجود ہے۔

کالیداس کے تین بیٹے تھے۔ اس کے بڑے بیٹے بھگوتی داس کی اولاد کھوکھر اور دریا مال کے مواضعات میں ہے۔ دوسرے بیٹے آسانند کی اولاد بھون جبیر پور اور منوال والے تھے اور تیسرے بیٹے شنکر داس کی اولاد ڈلوال۔ ڈھیریالہ کہون اور گلر کہار والے تھے۔ پھر کاروباری اور انتظامی دشواریوں کے پیش نظر چھوٹے بھائی کی اولاد گلر کہار ہی میں رہی۔ اور دوسرے دونوں بھائیوں کی اولاد علاقہ دھنی کے مختلف مقامات پر پھیل گئی۔ کافی عرصے تک ان کے ایک ایک، دو دو آدمی سرکار دربار میں حاضر رہ کر اپنے حقوق وغیرہ کی نگہبانی کرتے رہے۔ اور جو کچھ نقد وجنس کی قسم سے حاصل ہوتا۔ وہ ایک جگہ اکٹھا کر لیتے۔ یہ نظام اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک قائم رہا جب کہ اس نے حکم دیا کہ سوائے مسلمانوں کے کوئی آدمی سرکاری دفتروں میں آمد و رفت نہیں رکھ سکتا۔ یوں ہندوؤں کا داخلہ سرکاری دفتروں میں ممنوع قرار دے دیا۔

چنانچہ حکم صادر ہو گیا۔ کہ جہاں کہیں قانونگویوں کا فرقہ ہے۔ ان کی بہتری اس میں ہے۔ کہ وہ اپنے میں سے برضا و رغبت کسی ایک کو حلقہ اسلام میں داخل کر دیں: تاکہ وہ دفتر میں آجایا کرے۔ اور سرکاری کام سرانجام دیتا رہے۔ سرکار دربار سے جو کچھ اس کو حاصل ہو۔ وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں میں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلم تقسیم کر دیا کرے۔ چنانچہ تمام جاگیریں تنخواہیں اور رسومات، تمام ہندو مسلمانوں کے لئے بحصہ مساوی بدستور قدیم تقسیم ہوتی رہیں۔

پس کھوکھر والوں میں سے رائے نرائن داس ولد بابا بھگوتی داس کا ایک لڑکا جس کا نام شیخ محمد صالح تھا۔ عہد عالمگیری میں مسلمان ہو گیا۔ اسی طرح برادری کی بعض میں سے بھی ایک آدمی نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن جبیر پور اور دریا مال کے لوگ ہندو ہی رہے۔ کیونکہ انہوں نے کار دفتر سے فراغت حاصل کر لی۔ اور کاروبار تجارت و زمینداری وغیرہ میں مصروف ہو گئے لیکن جاگیروں اور بندھان سے اپنا حصہ وصول کرتے رہے۔

کالیداس کی اولاد سے جو لوگ گلر کہار۔ ڈلوالی اور ڈھیریالہ میں سکونت پذیر تھے۔ ان میں سے حاکم رائے جس کے چار بیٹے تھے۔ کی اولاد میں سے تیسرے بیٹے سمی سردار نے اسلام قبول کر لیا اور

نہ ۱۶۹۵ء کی سند کے مطابق جس کا حوالہ [illegible] بھگوتی داس کے لڑکے کا نام [illegible]

پشت بہ پشت یہ دستور چلتا رہا کہ اہل اسلام کی اولاد کا عمل دخل دفتر میں رہا۔ اور وہ کچہری کا کاروبار کرتے تھے رسوم و جاگیروں کی آمدنی تمام برادری کے خورد و کلاں میں تقسیم کر دیتے۔ دوسرے لوگ جن کا داخلہ دفتروں میں ممنوع تھا۔ وہ زمین کی آبادی نوکری اور تجارت کا کاروبار کرنے لگے۔ اور جدی جائداد سے حصہ بھی لیا کرتے۔ اور بیاہ شادی کے موقعہ پر تمام برادری ہندو مسلمان اکٹھی ہوا کرتی۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ تنبول و بھاجی تعلقات برقرار رکھتے۔

گدھوکوں کا دعوی ہے کہ ان کا مورث اعلیٰ رائے چندر پال راجپوت نسل کا تھا۔ اور بیکانیر میں رہا کرتا تھا۔ اور اس کا شجرہ نسب کورو پانڈوؤں سے ملتا ہے۔ پہلے پہل راجہ پال کی معیت میں وہاں سے کوچ کر کے ملوٹ میں آئے۔ اور وہاں پہاڑ کی چوٹی پر ایک قلعہ تعمیر کیا چونکہ جھیتہ چندو رائے کی کوئی اولاد نہ تھی۔ لہذا وہ اولاد کے حصول کے لئے ہمیشہ سری کالکاجی کی پرستش کرتا رہتا تھا۔ کہ اس کے ہاں اولاد نرینہ پیدا ہوئی۔ اور اس کا نام کالک داس رکھا گیا۔ جو کہ تبدیلی الفاظ سے کالیداس بن گیا۔ چندو رائے کی وفات پر کالیداس اس کا جانشین مقرر ہوا۔

جب بابر بادشاہ اس علاقے سے گذرا تو اس نے کالیداس کو اس علاقہ سے پانی کی نکاسی اور اس کی آبادی کا حکم دیا۔ بابا مذکور نے عرض کی کہ ایک تو صوبہ دار لاہور کے نام حکم جاری کیا جائے۔ کہ پہاڑ کھودنے کے لئے جس قدر رقم کا میں مطالبہ کروں۔ وہ خزانہ عامرہ سے نکال کر مجھے بھیج دی جایا کرے۔ اور دوسرے اندر گرد کی تمام رعایا کو حکم سنایا جائے۔ کہ علاقہ کی آبادی کے لئے سوہوں کے پیچھے دوڑیں اور ایک سیر فی سو سیر مجھے دیں تاکہ انہیں اس جگہ کو آباد کروں۔ اور حاکمان وقت میں سے کوئی رکاوٹ نہ ڈالے۔ پس اس کی التماس کے بعد جب دونوں حکم جاری ہو گئے۔ اور بابا کالیداس نے پانی نکال دینے کے بعد بہ تفصیل ذیل چودہ علاقے بنائے۔ ملک دھن۔ تھر چک۔ دھراب۔ پل غازی۔ تاری۔ رندوٹ۔ موٹ نڑالی۔ طویلہ سارنگ۔ دروازہ کہار سون سکیسر۔ کنٹ۔ کہون۔ کیک نہار

مذکورہ علاقوں کی حد بندی کے بعد بابر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور علاقہ وغیرہ کی آبادی کا اظہار کیا۔ اس وقت تو جیسا کہ بادشاہ نے پوچھا کہ اس علاقے میں کتنے باشندے

کو کیا کہتے ہیں۔ تو اس نے بتایا کہ دھن۔ اس پر بادشاہ نے کہا۔ اے کالیداس دھن دھن برکار تو۔ کالیداس نے عرض کیا۔ کہ چونکہ ظل اللہ کی زبان سے لفظ دھن نکلا ہے۔ اس واسطے اس علاقے کا نام دھن رکھا جائے۔ پس بادشاہ نے حکم دیا کہ کارگزاری کے صلہ کے طور پر کالیداس کو پچاس لاکھ روپیہ انعام دیا جائے۔

بابا مذکور نے یکمشت اتنی رقم لینے سے انکار کرتے ہوئے درخواست کی کہ اس انعام کی بجائے مجھے ایسا انعام دیا جائے۔ جو کہ میرے پسماندگان کے بھی کام آوے۔ اور بادشاہ کا نام بھی صفحہ روزگار پر یادگار رہے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ کیسے۔ عرض کیا گیا کہ جس قدر علاقہ آباد کیا ہے۔ علاقہ کی آمدن سے دہ یکی دس فیصدی۔ پنجدو روپیہ رسوم قانونگوئی و خطاب قانونگوئی اور حضور کی پیش گاہ سے پنج روپے نذرانہ سرد ہی عطا کیا جائے۔ چنانچہ درخواست کے مطابق پروانے جاری ہو گئے۔ علاوہ ازیں سات مواضعات بطور المیہ و جاگیر دیئے گئے۔ (واضح رہے کہ بابر بادشاہ کی طرف سے عطا کی ہوئی کوئی سند ان کے پاس نہیں ہے۔ اور نہ تزک بابری ہی میں اس قسم کا کوئی ذکر موجود ہے۔ غالباً یہ سب کچھ در مدح خود میگوید کی قسم کی چیز ہے)

جب بابر بادشاہ فوت ہو گیا۔ تو اس کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت نشین ہوا۔ نیا آباد شدہ علاقہ (دھنی) ظالم حاکموں کی وجہ سے ویران ہونے لگا۔ پس ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء میں رائے بھگوتی داس پسر کلاں کالیداس کے نام حکم جاری ہوا۔ کہ وہ حسب سابق علاقہ کی آبادی کرے۔ انعامات و رسومات و جاگیرات جو کہ سابق بادشاہوں کی طرف سے مقرر تھیں اور اب نہیں رہیں۔ انہیں برقرار سمجھا جائے۔ چنانچہ تین ہزار تنکہ بطور خلعت بھی دیا گیا اور رائے بھگوتی داس نے دل و جان سے علاقہ دھنی کی آبادی میں کوشش کرنا شروع کر دیا۔

پس ۹۷۰ھ میں مذکورہ بالا علاقے بادشاہ کی طرف سے میر محمد خان کے سپرد ہوئے۔ اور بھگوتی داس کے نام ان پرگنوں کا دخل دلوانے کے لئے حکم صادر ہوا۔ اور میر محمد خان کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ قانونگویان کے صلاح و مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرے۔ گویا انہیں اپنا شریک کار تصور کرے۔ چنانچہ وہ یونہی کرتا رہا۔

بعد ازاں ۷۹۴ھ میں خدمت گذاری کے معاوضہ کے طور پر سابقہ رسومات کے علاوہ جہتہ نرائن داس کو گیارہ ہزار روپیہ انعام بھی عطا ہؤا۔ پھر ۱۰۵۲ھ میں بوجہ خیر خواہی سرکار چیندر قلی گکھڑ کے نام بھی سرکاری فرمان جاری ہؤا۔ کہ قانون گویوں کی رسومات وجاگیروں کو بحال کرے۔ پس اس طرح یہ معافیاں سکھوں کی عملداری تک قائم رہیں۔ چنانچہ کلر کہار ڈلوال ڈھیر مالیہ کی برادری کے لئے شاہان سلف کی سرکار سے مندرجہ ذیل پانچ محال کی معافی وجاگیر قائم رہی۔ ملوٹ۔ ڈنڈوٹ۔ کہون۔ کنٹ۔ دروازہ کہار اور ان محالات سے تقریباً چالیس ہزار روپیہ دصول ہوتا تھا۔ دوسری جاگیروں کا اندازہ اسی سے کر لینا چاہیئے۔ جو کہ بابا کالیداس کے ان دو لڑکوں کو ملی ہوئی تھیں۔ جو علاقہ دھن میں سکونت پذیر تھے۔ گویا بابا کالیداس کی اولاد کی کل آمدنی ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ تھی۔

جب مغلیہ سلطنت کمزور ہو گئی اور یہاں پر طوائف الملوکی پھیل گئی۔ تو ملک پنجاب میں کبھی تو کابل کی حکومت کی طرف سے حاکم آتے۔ اور ملک کو لوٹ لیتے اور کبھی سکھ غالب آجاتے تو وہ جاگیرداروں سے خراج وصول کرنے کے لئے انہیں قید وبند کی سزائیں دیتے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس افراتفری اور اندھیر گردی میں جاگیردار تنگ آگئے۔ اور جاگیردار کا لفظ وبال جان بن گیا۔ تو یہ طبقہ ملازمت وزمینداری کے کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ حتیٰ کہ دہلی دربار میں جا کر ملازمت کا پٹہ گردن میں ڈال دیا۔ اور بادشاہان وقت کی خدمت میں منشی گری شروع کر دی۔ کہتے ہیں کہ اس قوم کا ایک فرد شیخ محمد اسلم پہلا شخص تھا۔ جس نے شاہی ملازمت اختیار کی۔ اور شاہی فرامین اور مکتوبات لکھنے میں اس قدر مہارت رکھتا تھا کہ ایک دن بادشاہ شکار کے لئے جا رہا تھا۔ اور شیخ مذکور بھی ساتھ تھا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ایران کے بادشاہ کے نام ایک خط لکھو۔ جس کا مضمون فلاں ہے۔ پس شیخ محمد اسلم نے خورجین سے کاغذ وقلمدان نکالا۔ اور سواری کی حالت ہی میں خط لکھنا شروع کر دیا۔ بادشاہ نے اس اثناء میں گھوڑا دوڑا لیا۔ شیخ موصوف نے بھی بادشاہ کے پیچھے پیچھے گھوڑا دوڑایا۔ اور اسی طرح خط لکھتا چلا گیا۔ جب بادشاہ نے گھوڑے کو کھڑا کیا۔ تو خط بادشاہ کی خدمت میں مہر لگانے اور دستخط ثبت فرمانے کے لئے پیش کیا۔ بادشاہ نے شیخ صاحب کی مہارت ولیاقت کی خوب تعریف

کی۔ اور نئی جاگیر دی اور تنخواہ میں معقول اضافہ کیا۔ اسی طرح بادشاہ نے شیخ محمد اسلم کو بر سر دربار عام فرمایا کہ سہ قطعہ مکتوب بادشاہان اطراف کو لکھے جائیں۔ اور ہر ایک کا مضمون بھی شیخ موصوف کو بیان کر دیا۔ مضمون سننے کے بعد شیخ صاحب دفتر کے کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ اور خط لکھنا بھول گئے۔ جب کچہری برخاست ہونے کا وقت قریب پہنچا۔ بادشاہ نے شیخ کو بلایا۔ اور کہا کہ کیا تینوں خط لکھ دیئے ہیں۔ شیخ ہراساں ہو گیا۔ اور بادشاہ کے خوف سے ڈرتے ہوئے فی الفور جواب سنا دیا کہ جناب مکتوبات لکھ دیئے ہیں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ لاؤ دستخط کر دوں۔ شیخ گیا اور مجبوراً سہ قطعہ سفید کاغذ لے آیا۔ اور ہر ایک کا مضمون فارسی زبان میں بادشاہ سے عرض کر دیا۔ بادشاہ نے ان کے مضمون پسند کئے۔ اور کہا کہ لاؤ دستخط کر دوں۔ جب کاغذات بادشاہ کے ہاتھوں میں آئے تمام کورے تھے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ اے شیخ کورے کاغذ لائے ہو۔ شیخ خاموش رہا۔ پس بادشاہ حقیقت حال سے واقف ہو گیا اور شیخ کی حسن لیاقت اور طلاقت زبان پر آفرین بھیجی۔ اور ہم چشموں و ہمعصروں پر ترقی دے دی۔ اور ممتاز کر دیا۔ اور کہتے ہیں کہ شیخ اسلم لکھائی میں زریں رقم تھا۔ اور ہمیشہ رات کو حلوہ تیار کروا کر اپنی انگلیوں پر باندھا کرتا تھا۔ تاکہ نرم رہیں۔ اور حروف کے مرکز ٹھیک اور صاف آئیں۔ شیخ محمد اسلم کی اولاد سے بہت سے لوگ ہیں۔ اور وہ موضع کھوکھر میں سکونت رکھتے ہیں۔ ازاں جملہ شیخ عبداللہ الہادی تھا۔

یہ طویل اور اکتا دینے والے اقتباسات گلدستہ تاریخ قوم گڈہوک فارسی قلمی مؤلفہ شیخ نور الدین (ولادت ۱۲۸۰ھ / ۱۸۳۲ء) سے لئے گئے ہیں۔ جو کہ بقول مؤلف اپنے بزرگوں کی روایت اور شاہان سلف کے فرامین کے مطالعہ کے بعد ضبط تحریر میں آئے ہیں اب اس کہانی کا وہ پہلو درج کیا جاتا ہے۔ جو سرکاری کاغذات و دستاویزات پر مبنی ہے تاریخ ضلع جہلم میں تحریر ہے کہ گڈہوکوں کے مورث متھرا میں رہتے تھے۔ بابر کے حملہ (۹۲۵ھ/ ۱۵۱۸ء) کے وقت ان کا ایک بزرگ بھتہ چندر رائے دہلی میں آیا اور بابر کی ملازمت کر لی۔ اور اسی کے ساتھ چار سال بعد کوہستان نمک کے علاقے میں آیا۔ (قابل دھیان بات یہ ہے۔ کہ بابر کا پہلا حملہ ۹۲۶ھ / ۱۵۱۹ء میں ہوا۔ اور وہ چناب سے آگے نہیں بڑھا۔

اور وہ پانچویں حملے (۱۵۲۶ء) کے پہلے اور پہلے حملے سے چھ سال بعد تک دہلی میں داخل نہیں ہوا۔
مہتہ چاندورائے کلر کہار کے مقام پر بابر کے ساتھ تھا۔ اور جنجوعہ راجپوتوں کے مورث راجہ مل کے
ہمراہ گھوڑی گلہ کو کاٹ کر مشرقی دھنی کے خشک کرنے کے کام پر مقرر کیا گیا (تزک بابری کی رو
سے اس وقت جنجوعوں کا حاکم ملک ہست تھا نہ کہ مل) جسے اس نے کامیابی سے سرانجام دیا۔ کسروں کا مورث
غزنا اور رتن دیو منہاس کی اولاد میں سے [illegible] سدھر بعد ازاں اس خطہ کی آبادکاری میں ان کے ساتھ شامل
ہوئے (کھوتوں کا مورث کہنسار بھی)

اس وقت کوہستان نمک میں جنجوعہ حکمران تھے۔ بابر نے چندورائے کو نقد انعام دیا۔ پہاڑ اور دھنی
کے سوا تعلقوں کے مالیہ کا ایک فیصد معہ چند حقوق چرائی اس امر کے ثبوت ہیں ان کے پاس کوئی
تحریری ثبوت نہیں ہے۔ البتہ ہمایوں کے عہد کی ایک سند ہے جو کہ کالیداس یا کالک داس بن چندورائے
کے نام ہے۔ اس کی تاریخ اجراء ۹۶۲ھ / ۱۵۵۴ء ہے۔ جس کے ذریعے علاقہ کہون کے انتظام و ترقی کے
صلے میں تیس ہزار تنکہ انعام دیا گیا ہے۔ یہ سند کلر کہار کے باغ صفا کا ذکر بھی کرتی ہے۔ جس کا حوالہ تزک
میں موجود ہے۔ اور یہ بالکل حقیقی ہے۔

دوسری سند عہد اکبری کی ہے۔ اس کی تاریخ ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء ہے۔ اس کے ذریعے کالک
داس کو بیرہ اور نیلاب کی خدمت سپرد کی گئی۔ جس سے مراد جہلم اور سندھ (اٹک) کے درمیان ایک
غیر مخصوص اور غیر متعین علاقہ ہے۔

دو سال بعد کی تیسری سند بتاتی ہے کہ نرائن داس ابن کالک داس کو شیر شاہ سوری (۱۵۴۰ء
- ۱۵۴۵ء) کی بغاوت کے دوران جو کہ بیس سال پہلے ختم ہو چکی تھی نقصانات کا معاوضہ دینے کے
لئے پندرہ ہزار دام عطا کیے گئے۔

چوتھی سند اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ء - ۱۷۰۷ء) کے چالیسویں سال حکومت (۱۶۹۵ء) میں
ہے۔ جس پر مرزا دیانت بیگ خانخاناں کی مہر لگی ہے۔ جس کی رو سے محمد شریف ابن جگو تیداس راچند،
آتمارام، نندرام قوم گدھوک کو دھنی، کہون، کہار اور جمال طوٹ میں سات سو روپے کی رقم عطا کی گئی ہے
گدھوک بیان کرتے ہیں۔ کہ ان کا مورث کالیداس اور اس کی اولاد ابتدائی مغل شہنشاہوں کے عہد
میں اس علاقے میں بخوبی متمکن ہو چکے تھے۔ اور کوہستان نمک اور اس کے شمالی علاقوں کی حکومت میں ان کا

خاصہ حصہ تھا۔

کالیداس کی سادہ کھر کہار میں ایک نمایاں چیز ہے۔ اور لاریب کھر کہار گدھوکوں کا صدر مقام ہے اگرچہ کہ اب (قبل از ۱۹۴۷ء) ان کے گاؤں ڈلوال، بھون، اور کھوکھر ہیں۔ لیکن کتب ایسے موجود ہیں جن چند ورائے اور کالیداس کا مرتبہ مغل شہنشاہوں کی نظروں میں بہت بلند بتایا گیا ہے۔ اور کہون و دھنی کے علاقے میں ان کے تسلط کے گن گائے گئے ہیں۔ مغلیہ عہد کے قانونگو یہی تھے۔ اور علاقہ دھنی کے مالیہ کے کاغذات ان کے پاس بکثرت ہیں۔ سب سے قدیمی کاغذ ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء کا ہے۔

باوجود ان تمام باتوں کے انگریزی عہد یعنی ۱۹۰۰ء کے ایکٹ انتقال اراضی کی رو سے گدھوک غیر زراعت پیشہ تھے۔ لیکن ۱۹۰۷ء کے بعد انہیں درجہ دوم کے زراعت پیشہ قرار دیا گیا ہے خان بہادر شیخ عبدالعزیز کھوکھر برادری اور سردار دنی چند آنریری مجسٹریٹ برادری بھون میں اسی کے سربرآوردہ شخص ہو گزرے ہیں۔ ان دونوں سے پہلے ڈلوال کے گدھوک خاندان میں سے دیوان گھرانہ بڑا مشہور تھا۔ دیوان پورہ انہی کا ہے۔ سکھوں کے عہد میں دیوان مولراج گورنر ہزارہ اسی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔

گدھوک کی وجہ تسمیہ ہنوز تحقیق طلب ہے۔

باب ۳

دھنی کا لسانی اور ثقافتی جائزہ

ڈی ٹیرا کی تحقیقات

اس مخصوص خطہ کی لسانی اور ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں اس علاقہ میں بنی آدم کی بود و ماند کے ارتقائی مراحل پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیئے تاکہ لسانی تغیر و تبدل کی بہتر طور پر تحسین کی جا سکے اس ضمن میں علمائے اثریات و اقوام کی تازہ ترین تحقیقات کا ملحض یہ ہے کہ آریوں کی آمد سے لاکھوں برس پیشتر ابن آدم اس علاقے میں جو دریائے سواں کی گذرگاہ ہے اپنا مسکن بنا چکا تھا ڈی ٹیرا کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ برفانی عہد اور برف پگھلنے کے مختلف ادوار میں مختلف ممالک میں پتھر کے جو بھدے اوزار استعمال کئے جاتے تھے ان سے کام لینا وادی سواں میں بسنے والی انسانوں کی جماعت بھی جانتی تھی۔

چونترہ کی صنعت

وادی سواں کی تہذیب کے جو قدیم آثار اب تک دریافت ہو چکے ہیں ان میں زیادہ اہمیت چونترہ صنعت کو دی جاتی ہے جو برف پگھلنے کے تیسرے دور سے متعلق ہے چونترہ دریائے سواں کے کنارے واقع ہے یہاں جو اوزار تیار کئے جاتے تھے وہ ابتدائی اوزاروں سے مختلف اور عمدہ ہوتے تھے یاد رہے کہ دریائے سواں سے دھنی کا بھی خاص تعلق ہے کیونکہ علاقہ دھنی میں دریائے سواں کی گذرگاہ تقریباً ساٹھ میل لمبی ہے۔ موضع ولہہ کے قریب اس علاقہ کے تین نالے کڑاہی، بھگناؤ، سوج اور وڈالہ اس میں گرتے ہیں، جن کی وجہ سے ان ندیوں کے سنگم کا نام "پنجند" یعنے پانچ ندیاں پڑ گیا۔

وادی سواں کی تہذیب

وادی سواں کی تہذیب کا عہد ہڑپہ تہذیب (۳،۷۵۰ تا ۲۵۰۰ ق م) اور موہنجو دارو تہذیب (۳۲۵۰ تا ۲۷۵۰ ق م) سے صدیوں پہلے کا ہے یعنی تین لاکھ سے پانچ لاکھ سال تک۔ ہڑپہ اور

موہنجوداڑو سے جو اوزار اور دوسرا سامان برآمد ہوا ہے ان میں کوئی بھی لوہے کا نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ مغربی پاکستان والے اپنی تمدنی اور تہذیبی سربلندی کے دور میں بھی لوہے سے ناآشنا تھے۔

وادیٔ سواں کی زبان

وادیٔ سواں یا ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے باشندوں کی قومی زبان کیا تھی؟ یہ ابھی تک ایک سربستہ راز ہے بعض اسے سنسکرت قرار دیتے ہیں اور بعض دراوڑی زبانوں میں سے کسی ایک کو اس خطہ کی زبان تصور کرتے ہیں البتہ یہاں کے رسم الخط کو تصویری قرار دیا جا سکتا ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس وقت ابجد کی ایجاد ہی نہ ہوئی تھی بعض حضرات کی رائے یہ بھی ہے کہ اس زبان کا رسم الخط کسی دوسرے ملک کی زبان سے کسی قسم کی مشابہت ہی نہیں رکھتا تھا وہ خالص سندھی زبان تھی جس کے آثار اب ناپید ہو چکے ہیں ان بھانت بھانت کی بولیوں کے ہوتے ہوئے اس علاقہ کی زبان کا سراغ لگانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بہرحال اتنی بات ضرور واضح ہے کہ اس قدر مہذب قوم زبان سے خواہ وہ تصویری زبان ہی کیوں نہ ہو اور اسے ابتدائی زبان ہی کیوں نہ قرار دیا جاتے محروم اور بے بہرہ نہ ہوگی۔

آریوں کی آمد

اس خطہ میں آریوں کی آمد تقریباً ۱۵۰۰ ق م سے پہلے بھی انسانی آبادیاں موجود تھیں جیسا کہ رگوید کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آریہ حملہ آوروں کا مقابلہ یہاں کے اصلی باشندوں سے ہوا جب وہ شکست کھا گئے تو ان میں سے چند ایک سرداران قبیلہ نے آریوں کی اطاعت کا جوا اپنی گردنوں میں ڈال لیا اور انہیں کے ساتھ بود و باش اختیار کر لی۔ رگوید میں ایسے لوگوں کو داس کے نام سے پکارا گیا ہے ان داسوں میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:-

الی بشا، دھنی، چوری، پپرو، ورچین اور شمبرا

ان داسوں کی زبان کیا تھی؟ اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا بعض محققین انہیں کول اور دراوڑ سمجھ کر ان کی زبان کو دراوڑی کہتے ہیں۔

سنسکرت اور پیشاچی

آریہ لوگ جب اپنے قدیم وطن باختر سے نکلے تو ان کے بڑے بڑے قبیلوں کے نام بھرت، پکت، ایت اور پارت وغیرہ تھے۔ پکت (موجودہ پختون) قبیلے کی زبان پکتی (پختو) کہلاتی تھی جو کہ دوسرے قبائل کی زبانوں کی نسبت کافی ترقی یافتہ تھی۔ یہ زبان آریوں کی قدیم ترین زبان ژند سے ملتی جلتی ہے ادھر اس کی ساخت پہلوی سے بھی

مماثلت رکھتی ہے جس سے پشتو اور پہلوی زبانوں کا مآخذ ژند معلوم ہوتی ہے۔

ضلع مردان کی تحصیل صوابی کے موضع لاہور کے عالم بے بدل پنی نی نے مختلف قبائل کی بولیوں سے منتخب کر کے ایک نئی زبان کی بنا ڈالی اور اس کا نام "سم کرت" (اصلاح زبان) رکھا گیا جو لبعد میں "سانس کرت" (مشہور زبان، منتخب بولی) کہلاتی ہے۔[1]

عبدالعلیم اثر افغانی کی تحقیق کی رو سے پنی نی (۳۰۰ ق م) کے زمانہ میں پشتو، اوستا، ارامی، عبرانی ویدک، سیدناگی، سباتی، فنیقی، براہمی یا دانانی زبانیں مروج تھیں نیز اس عہد میں یہاں سباتی، ارامی براہمی اور یا دانانی رسم الخطوں کے امتزاج سے ایک الگ رسم الخط خروشتی کے نام سے بھی رواج پا گیا اور یہ خط ۵۱۸ ق م میں دارا اوش اول (خاندان ہخامنشی) کی فتح وادی سندھ کے ساتھ شمال مغربی ہندوستان میں وارد ہوا۔ تقریباً اسی زمانے میں سنسکرت رسم الخط بھی وجود میں آگیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سنسکرت رسم الخط کا منبع اور سرچشمہ خروشتی رسم الخط ہی ہے جو کہ کشان سلطنت کی وجہ سے تیسری صدی قبل مسیح میں چینی ترکستان میں بام عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ برصغیر میں آریوں نے جس تہذیب کو پروان چڑھایا وہ ویدک تہذیب کہلاتی ہے اور آریوں کی ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں کی شہادت ویدوں ہی سے ملتی ہے کیوں کہ یہ وید برصغیر کی قدیم اور تاریخی دستاویزیں ہیں ان کی زبان ویدی سنسکرت ہے۔

رگویدی عہد
۱۵۰۰ تا ۵۰۰ ق م

رگ ویدی عہد سے سطح مرتفع کوہستان نمک میں آریوں کا عمل دخل شروع ہو چکا تھا برصغیر کے قدیم ناٹکوں میں جن کا تعلق پہلی صدی عیسوی سے ہے سنسکرت بولنے والے کرداروں کا تعلق عام طور سے براہمنوں یا اونچی ذات کے لوگوں سے ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنسکرت کا رواج خاص خاص طبقوں میں کافی عرصہ تک رہا پنی نی نے زندہ زبان کی صرف و نحو لکھی۔ اس سے پہلے سنسکرت کے قواعد نویس یاسکا (۵۰۰ ق م) مصنف نروکتا بولی جانے والی زبان کو بھاشا کہتا ہے۔

راجہ کیکیہ

علاقہ زیر بحث پر مہابھارت کی جنگ کے زمانہ میں کیکیہ راجہ کی حکومت تھی جو کرشن مہاراج کا خسر تھا اور اس کے پانچ لڑکے جنگ مہابھارت میں پانڈوؤں کی طرف سے دادِ شجاعت دیتے ہوتے گاجر مولی کی طرح کٹ مرے ان لوگوں

[1] ماخوذ از ادبیات سرحد حصہ سوم

کی زبان ویدک سنسکرت اور دیسی بھاشاؤں کا آمیزہ ہوگی جسے لسانیات کی اصطلاح میں ادیچیہ (مغربی پاکستان کی زبان) کا نام دیا گیا ہے پھر اس زبان نے مختلف تغیر و تبدل دیکھنے کے بعد پہلی بار پراکرت کا روپ دھارا اور اسی پراکرت کا ادبی روپ پالی کہلایا جس کے قدیم نمونے بدھ اور جینیوں کی مذہبی کتابوں یا اشوک (۲۵۰ ق م) کی لاٹوں پر کندہ ملتے ہیں اشوک کی یہ لاٹیں شہباز گڑھی، مانسہرہ اور کٹاس کے مقامات پر پائی جاتی ہیں ان لاٹوں پر کی تحریریں خروشتری رسم الخط میں ہیں۔

خروشتری زبان

دھنی کی زبان اور اس کے رسم الخط کے متعلق قدیم ترین کتبی شہادت موضع میرا تھر چیک (مغربی دھنی) کے ایک کنوئیں سے دستیاب ہوتی ہے یہ کتبہ خروشتری زبان میں لکھا ہے اور صرف سمت ۵۸ اور ایک لفظ "سرا مانیرا" بمعنی بدھ مذہبی بھائی پوری طرح پڑھا جا سکا ہے (بحوالہ آرکیالوجیکل سروے رپورٹ صفحہ ۹۳، جلد ۵، میرا پلیٹ نمبر ۲۸ جے پی لائن سن آف دی پنجاب پولیس، لاہور میوزیم)

محققین کا اندازہ ہے کہ اشوک کے زمانے میں اس علاقہ کی زبان پراکرت کہلاتی تھی جس پر سنسکرت کا اثر زیادہ تھا۔

پراکرت

قدیم تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پراکرت کوہ ہندوکش کے جنوب میں بسنے والے قبائل کی مشترکہ بولی تھی جس کا رواج ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح سے ملتا ہے۔ جبکہ آریوں کے قبیلے پکت، بھارت، سیت، پارت وغیرہ باختر اور اس کے نواح میں آباد تھے۔ اس سارے علاقے کو دردی بمعنی غبار آلود، چٹیل، اجاڑ اور صحرا کہا جاتا تھا اس لئے پراکرت کو دردی یا دردستانی بولی کا نام بھی دیا گیا اور چونکہ پکت (پختو) قبیلہ کی زبان پکتی (پشتو) کا پراکرت پر زیادہ اثر تھا۔ زیادہ تر الفاظ بھی پراکرت نے پکتی ہی سے لیے اور پکت قبائل ہی میں اس نے زیادہ رواج بھی پایا۔

پشاچہ

عہد وسطیٰ (۵۰۰ ق م تا ۶۰۰ء) کی ادبی پراکرت کی پانچ واضح شکلوں میں سے ایک پشاچی پراکرت (وہ پراکرت جو سابقہ پنجاب، سرحد اور کشمیر کے علاقے میں بولی جاتی تھی) ہے۔ وررچی (تقریباً ایک صدی قبل مسیح) نے جو چار پراکرتیں گنائی ہیں۔ اس میں پشاچی بھی شامل ہے (پشاچ بمعنی کچا گوشت کھانے والے) فارغ بخاری کا کہنا ہے کہ پکت قبائل کے نام کی رعایت سے

پراکرت کو پشاچہ کے نام سے موسوم کیا گیا یہی پراکرت (دردی یا پشاچہ) آگے چل کر ہندکو کے نام سے مشہور ہوئی۔

ہندکو

ہندکو دراصل آندکو ہے قبیلوی تعصب کی وجہ سے بھارت قبیلہ جو بھارت ورشس کا مالک تھا۔ نفرت اور تحقیر کی وجہ سے پکت وغیرہ قبائل کی پراکرت کو "آندکو" کہتے جو دراصل سیندکو یعنے سندھ کی بولی ہے۔ سندھ یعنی دریائے اٹک بھارتیوں کے لہجے میں ڈھل کر آند کی شکل اختیار کر گیا اور کو کے معنی بولی کے ہیں۔ جس سے کوی (شاعر) اور کوتا (شاعری) نکلی ہے۔

۱؎ اند، چاند سنسکرت میں چاند کو اندو کہتے ہیں۔ قدیم چینی سیاح ہیون سانگ نے بھی اپنے سیاحت نامہ میں اسی کا حوالہ دیا ہے۔ چاند کی ملک ہند سے نسبت کے متعلق ملاحظہ ہو۔ کتاب العلم عدد ۵۳ جہاں پر مفصلاً مندرج ہے کہ کس طرح چندر بنسیوں کی خدمات کے طفیل ملک ہند کا نام اندو راج کی رعایت سے اندوستھان مشہور ہوا اور پھر بگڑ کر ہندوستان ہو گیا۔ ۱۲

ہیم چندر نے جس کا زمانہ بارہویں صدی عیسوی کا ہے اس پشاچی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں ادب بھی ملتا ہے کشنوں کے عہد (پہلی صدی سے چوتھی صدی عیسوی تک) میں مغربی پاکستان میں پشاچی پراکرت کا رواج ہوا اس علاقہ میں شاہی سرپرستی کے تحت گندھارا کی بولی ادبی اور معیاری زبان کی حیثیت سے رائج ہو گئی ٹیکسلا اور سنگھا پورہ کے دارالعلوم اس وقت علم و ادب کے مرکز تھے یاد رہے کہ سنگھا پورہ کا دارالعلوم علاقہ دھنی ہی میں واقع تھا۔

اپ بھرنش

لسانیات کی رو سے ۶۰۰ء تا ۱۰۰۰ء کا زمانہ اپ بھرنش کا زمانہ کہلاتا ہے۔ اس عہد کی پراکرتوں اور اپ بھرنش میں سے درج ذیل صرف دو اپ بھرنشیں ہمارے موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ پہلی براچڈ اپ بھرنش (سندھی زبان) اور دوسری ککیئی اپ بھرنش۔ یہ براچڈ سے ملتی جلتی اپ بھرنش ہے اس لئے سندھی اور ککیئی میں مماثلت پائی جاتی ہے ککیئی کو لہندا یا لہندی بھی کہتے ہیں۔

لہندا یا لہندی

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلہ پر ککیئی اور لہندا کی اصطلاحات کی وضاحت کرتا جاؤں تاکہ مسئلہ زیر بحث میں جو موقف میں نے اختیار کر رکھا ہے اس کے مالہ اور ماعلیہ کے متعلق قارئین کرام بہتر طریقہ سے تحسین و

تقبیح کا فرض ادا کر سکیں۔

"لہندا" کے متعلق ڈاکٹر مسعود حسین اپنی کتاب "تاریخ زبان اردو" کے صہ ۹-۶۸ پر لکھتے ہیں۔!

لہندا مغربی پنجاب کی زبان ہے اس کی اور مشرقی پنجاب کی حدود کچھ اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ بعض سرحدی اضلاع کے اندر دونوں میں امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے لہندا پر دردیا پشاچ زبانوں کا اثر بہت زیادہ ہے۔ مغربی پنجاب میں کیکۂ دیس بھی شامل ہے۔ جہاں قدیم زمانے میں پشاچی پراکرت اور براچڈ اپ بھرنش (سندھی) بولی جاتی تھیں۔ لہندا مغربی، پنجابی، جاٹکی، ہندکی یا اُچی کے ناموں سے بھی مشہور ہے لیکن ان میں سے بہتر نام لہندا ہی ہے۔ اس کے معنی سمت مغرب کے بھی ہیں۔ لہندا میں کوئی ادبی کارنامہ نہیں ملتا۔ یہ اپنی گرامر اور فرہنگ دونوں کے اعتبار سے مختلف ہے اس کا اپنا رسم الخط لنڈا ہے لیکن آج کل یہ فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

کیکۂ کی تحقیق

کیکۂ کے متعلق جامع اللغات اردو میں لکھا ہے :۔

(س ۔ مذکر) ۱۔ ایک ملک جو پنجاب میں دریائے بیاس کے مغرب میں تھا ۲۔ ایک قوم جو یہاں آباد تھی ۳۔ اس قوم کا ایک راجہ جو کرشن جی کا خسر تھا وہ اور اس کے پانچ بیٹے پانڈووں کی طرف سے جنگ مہابھارت میں شامل تھے۔

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات کا مشترکہ مفاد یہ ہے کہ علمائے لسانیات کی تحقیقات کے مرجب مغربی پنجاب کی بولی کا نام لہندا ہے اور اس لہندا زبان کا ایک روپ جو پشاچی پراکرت اور براچڈ اپ بھرنش کا آمیزہ ہے نیز یہ مخلوط زبان کیکۂ دیس میں بولی جاتی تھیں۔ لہندا کی وسعت کا اندازہ ایک اور بات سے بھی لگ سکتا ہے جس کا ذکر مسٹر لیمبرک نے اپنی مشہور و معروف انگریزی کتاب "سندھ" کے صہ ۲۱۳ پر کر رکھا ہے وہ سندھی زبان کی ماہیت و نوعیت کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

پنجاب کے جاٹ قبیلے جن میں سیال، جوئیہ اور کھہار وغیرہ شامل ہیں۔ انہیں سندھ میں سرائی کہتے ہیں۔ ان کی اکثریت کلہوڑوں کے عہد (۱۶۵۷-۱۷۸۳ء) میں سندھ میں آئی ..... سرائی کا ابتدائی مطلب "شمال کا آدمی" تھا بعد میں کلہوڑوں کے ساتھ تعلق کی وجہ سے ایک "اعزازی لقب" بن گیا ان کی اکثریت آپس میں "لہندا" بولی بولتی ہے۔ جسے سندھ میں سرائیکی کہتے ہیں ..... شتربان جاٹ اور پنجابی بلوچوں کے بعض قبائل کی زبان بھی یہی ہے۔

گویا تمام وادیٔ سندھ کی زبان کا اصطلاحی نام "لہندا" ہے جس کا بقول ڈاکٹر مسعود حسین اپنا مخصوص اور علیحدہ رسم الخط لنڈا مانا ہے۔

شاردا اور لنڈا رسم الخط

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ لنڈا رسم الخط کہاں ایجاد ہوا؟ جہلم کے ڈسٹرکٹ گزیٹیئر سے پتہ چلتا ہے کہ لنڈا رسم الخط رہتاس کے ٹکوں کی ایجاد ہے اس مرحلہ پر بطور جملۂ معترضہ کے گزارش ہے کہ ہندی رسم الخط کا اصلی نام ناگری ہے جو کہ گجرات کے ناگر براہمنوں کا ایجاد کردہ ہے اور شاردا رسم الخط کشمیر کے پنڈتوں کا۔ اسی طرح رہتاس کے ٹکے جو کہ کشور کشا اور شمشیر زن تھے انہوں نے لنڈا رسم الخط کیا ایجاد کرنا تھا۔ یہ کارنامہ چکوال کے اس علاقہ کے دانشوروں نے سر انجام دیا ہوگا جسے مقامی طور پر آج بھی لنڈی پٹی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ علاقہ سہگل آباد سے کالس تک پھیلا ہوا ہے۔

لنڈی پٹی

لنڈی پٹی کی وجہ تسمیہ کے متعلق حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہا سکتا البتہ جب اس مرکب کے لغوی معانی پر نظر دوڑائی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پٹی دراصل پتی ہے جو کہ پالی کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور پالی زبان خود سنسکرت کے لفظ پنکتی سے ماخوذ ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لنڈا رسم الخط لنڈی پٹی کے دانشوروں (غالباً موضع میسرلہ کے پنڈتوں) کا ایجاد کردہ ہے جو کہ اس زمانے میں کھٹر راجگان یا ٹک (ٹکشک) گوجروں کے ماتحت تھے۔ ہیونسانگ ۶۲۵ء سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹاکیہ (طاکیہ) یا ٹکا دیش ملتان اور کشمیر کے درمیان کا علاقہ تھا لنڈی پٹی کی بولی لہجہ کے اعتبار سے آج بھی دھنی بولی سے کسی قدر مختلف ہے اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ علاقہ دھنی کی بولی لیکہ تھی جو کہ لنڈا رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اور وہ براچڈا اپ بھرنش (سندھی) اور پشاچی پراکرت (گوجری، ہندکو) کا آمیزہ تھی بالفاظ دیگر لیکہ اور لہندا باہم متبادل ہیں۔

اسلام کیا آیا

آٹھویں صدی عیسوی سے اسلامی کلچر اور سیاست کا اثر پنجاب پر پڑنا شروع ہوا اور اسلامی تہذیب و تمدن، زبان و مذہب کا یہ اثر عرب کے ذریعہ پنجاب پر نہیں پڑا بلکہ شمال مغرب سے افغانوں کے ذریعہ پڑا۔ ان کی وساطت سے عربی کے اسلامی الفاظ صوم و صلوٰۃ کی جگہ روزہ، نماز، خدا، پیغمبر کا رواج ہوا یہ الفاظ افغان فارسی سے لائے تھے۔ عربی کے تھا ہی مغل بادشاہوں نے بھی غزنویوں، غوریوں، خلجیوں، تغلقوں اور لودھیوں کی طرح فارسی ہی کو سرکاری زبان بنائے رکھا

اگرچہ کہ ان کی اپنی مادری زبان ترکی فارسی تھی وہ ہندوستان کی کئی دوسری زبانیں بھی سیکھ گئے تھے دوسرے اسلامی مبلغوں نے بھی بہت سی مقامی آبادی کو مسلمان بنالیا جس کے نتیجے کے طور پر پشتو فارسی کو بھی خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ چنانچہ فارسی پشتو کے مقامی بولیوں پر عمل اور ردعمل کے ذریعے یہاں کی بولیوں میں تغیر عظیم واقع ہوگیا اس کا اندازہ یوں لگ سکتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کا ایک عرب سیاح ابن حوقل (وفات ۹۷۶ء) اپنے سفرنامہ "المسالک والممالک" میں لکھتا ہے کہ ملتان میں ملتانی، سندھ میں عربی اور ہندی زبانیں بولی جاتی ہیں امیر خسرو (۶۵۲-۷۲۵ھ) کے زمانے کی گیارہ بولیوں پر جب نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں سندھی بولی اپنے وسیع مفہوم میں استعمال کی گئی ہے جس میں ملتانی اور لہندا بھی شامل ہیں لیکن امیر خسرو پنجابی کو لاہوری کے نام سے پکارتے ہیں۔

ملتانی یا لاہوری

آٹھویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک سرکاری اور درباری زبان اگرچہ فارسی ہی تھی لیکن عام بول چال کی زبان سندھ میں سندھی، ملتان (معہ تمام علاقہ تھل) میں ملتانی اور پنجاب میں لاہوری تھی۔

(لیکن درحقیقت تمام وادیٔ سندھ کی زبان لہندی ہے جس کے سندھی، ملتانی اور لاہوری وغیرہ مختلف روپ ہیں) جس کا رسم الخط سنسکرت سے اخذ کردہ لنڈا ہی تھا بقول حافظ شیرانی غالباً شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر (۱۷۰۷ء) کے عہد میں پنجابی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے خیال سے فارسی رسم الخط کو لنڈا کی بجائے اپنا لیا گیا لیکن جدید تحقیق یہ ظاہر کر رہی ہے کہ پنجابی زبان کے لئے فارسی رسم الخط کا استعمال جلال الدین اکبر (۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) کے عہد سے کہیں پہلے شروع ہوگیا کیوں کہ پنجابی کے مشہور شاعر شاہ حسین (۹۴۵-۱۰۰۸ھ) کی کافیوں کا مسودہ مجلس شاہ حسین لاہور کے پاس ہے۔ وہ فارسی رسم الخط میں ہے اس نتیجے کی تائید حافظ شیرانی مرحوم ہی کے ایک اور بیان سے ہو جاتی ہے جبکہ وہ اپنی مایہ ناز کتاب "پنجاب میں اردو" صد ۳۴ پر لکھتے ہیں۔

فارسی خط زمانہ قدیم سے ہندی اصوات اور ہندی السنہ کے لکھنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے ابتدا میں خط نسخ نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے لئے مخصوص تھا چنانچہ پشتو، سندھی، پنجابی (بلکہ بنگالی کا لٹریچر بھی اور سب بھی) آج بھی نسخ میں لکھی جاتی ہیں، عالمگیر کے بعد شمالی ہند میں نستعلیق [illegible]

گورمکھی

اس سے ثابت ہوا کہ عہدِ عالمگیری کی اصلاح درحقیقت نسخ کی بجائے نستعلیق کا استعمال ہے نہ کہ فارسی رسم الخط کا رواج لیکن بعد ازاں سکھوں کے نامور گرو گوبند سنگھ (۱۶۶۶ - ۱۷۰۸ء) کے زیرِ اثر مذہبی تعصب کے نتیجے میں لنڈا رسم الخط میں اصلاح کر کے گورمکھی رسم الخط ایجاد کر لیا گیا اور یوں پنجابی زبان کے لئے دو خط مروج ہو گئے فارسی اور گورمکھی

پوٹھوہاری کی ماہیت

الغرض دھنی کی بولی کئی صدیوں کی طویل مسافت طے کر کے دراوڑی سے پنجابی زبان کے لہندی روپ میں جلوہ گر ہوئی ہے اس حقیقت کی تائید تاریخ ضلع جہلم از مرزا اعظیم بیگ مطبوعہ ۱۸۸۱ء سے بھی ہو رہی ہے کہ سارے ضلع جہلم کی زبان بحیثیت مجموعی پنجابی ہے لیکن عموماً یہ پنجابی کا وہ روپ ہے جسے لہندا کہتے ہیں تاریخ ادب میں جیسے کہ پہلے مذکور ہوا۔ لہندا یا لہندی کے کئی اور نام جیسے ہندکو، جٹکی، ملتانی اور پوٹھوہاری وغیرہ بھی ملتے ہیں لیکن ان تمام ناموں سے ماہرین لسانیات لہندی کو قابلِ ترجیح قرار دیتے ہیں کیوں کہ ہندکو، ملتانی اور پوٹھوہاری محدود علاقوں کے لہجے ہیں پشاور کے گرد و نواح کی بولی ہندکو ہے ملتان کے گرد و نواح کی ملتانی اور بھیرہ سے مارگلہ تک کے علاقے کی پوٹھوہاری لیکن لہندی کی وسعت پشاور سے کراچی اور واہگہ سے کوئٹہ تک ہے۔

(ملاحظہ ہو ہسٹری آف انڈیا۔ از ایشوری پرشاد نقشہ نمبر ۱ بر صد ـــــ)

جو لوگ پوٹھوہاری کی حدود دریائے جہلم سے اٹک تک اور کوہالہ پل (آزاد کشمیر) سے سون سکیسر کی پہاڑیوں تک وسیع سمجھتے ہیں وہ صریحاً غلط ہیں۔ عبدالغفور قریشی صاحب نے اپنی کتاب "پنجابی زبان دا ادب تے تاریخ" صد ۳۔ ۵۹۳ پر جو یہ لکھا ہے:-

۶۔ پوٹھوہاری۔ ایہہ جہلم توں پار پوٹھوہار دے علاقے وچ بولی جاندی اے۔ ایس علاقے وچ راولپنڈی کیمبلپور گجرات وغیرہ شامل ہین۔ پوٹھوہار وچ ملّھی تھّکی جنگھاں اجھنا کھنے تہاڈے وغیرہ لفظ ودھیرے بولے جاندے ہین۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قریشی صاحب کا جغرافیہ کچھ کمزور ہے کیوں کہ ان کے ذہن میں علاقہ پوٹھوہار کی حدود کا تصور دھندلا ہے آپ خواہ مخواہ ضلع گجرات کو جو دوابہ چج یا چینیٹ میں واقع ہے دوابہ سندھ ساگر کے ساتھ خلط ملط کر رہے ہیں۔ ان کی درستی معلومات کے لئے عرض ہے کہ تزک جہانگیری کے موجب پوٹھوہار ...

(نزد سوہاوہ) سے درہ مارگلہ (نکلسن کی لاٹ) اٹک ہے اور پس کیمبلپور کا ضلع تو چھچھ میدان میں واقع ہے ان کی بولی کا مخصوص لہجہ چھاچھی ہے۔ شہنشاہ جہانگیر (۱۶۰۵ - ۱۶۲۷ء) سے منسوب ایک دوہے میں چھچھ اور دھنی کی تخصیص موجود ہے ؎

چھچھ ہزارے کنکاں جنگیاں   دھنی کھوب گائیں
سوہے بکرتی گھوڑ بھلے   ہشتنگر کے وہائیں

اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ - ۱۷۰۷ء) کے ہمعصر بادشاہ مراد خانپوری (وفات ۱۷۰۲ء) نے بھی اس ضمن میں یوں کہہ رکھا ہے ؎

سب دا ننگل تے نیلاب کناں دھن گھیبی تے پوٹھوہار کساں
جتھے خوباں لکھ ہزار گناں ہے خانپور اپنا دیس بناں

لہٰذا ثابت ہوا کہ عظیم تر پوٹھوہار کی کوئی حقیقت نہیں یہ صرف ریڈیو پاکستان، راولپنڈی کے چند اہل کاروں کا چکر ہے جو انہوں نے اسلام آباد کو حکومت پاکستان کا صدر مقام مقرر کرنے کے بعد سے چلا رکھا ہے۔ حالانکہ وقتاً فوقتاً ان کی اپنی زبان و قلم سے ان کے اس غیر تاریخی موقف کی تردید ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً باقی صدیقی کے ایک گیت کے بول ہیں ؎

اِہ دیر گھیبی دے   پتر سوائیں دے
ماہیئے دھنکی دے   اتے ڈھولے پوٹھوہاری

اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ ۲ کتاب ہذا۔

پنجابی کی اندرونی تقسیم

اسی طرح جو لوگ ملتانی کو پنجابی یا لہندی سے الگ اور مستقل بالذات زبان سمجھتے ہیں وہ بھی بر سر غلط ہیں۔ کیوں کہ ملتانی لہندی سے الگ اور علیحدہ نہیں ہے۔ شیخ اکرام الحق ملتانی نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ پاکستان لنگوئسٹکس ۱۹۶۲ء کے صفحہ ۱۵۴ پر جو نوٹ درج کیا ہے اس میں بھراں، آکھن، میڈا کو قدیم ملتانی کے الفاظ قرار دیا ہے۔ یہی الفاظ عین لہندی کے بھی ہیں۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم نے بالکل درست کہا تھا کہ اردو پنجابی سے نکلی ہے کیوں کہ یہاں پر پنجابی لہندی کے مترادف ہے۔ اور لہندی بذات خود ملتانی اور ماجھی (لاہوری) کو محیط لہٰذا اگر پنجاب میں اردو کے فاضل مصنف نے ملتانی سے مثالیں اور دلیلیں اخذ کی ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں

پڑتا اصل حقیقت یہی ہے کہ پنجابی ہی اردو کا سرچشمہ ہے اور دوسری علاقائی بولیاں پنجابی ہی کی مختلف شاخیں اور نہریں ہیں۔

اندریں حالات پنجابی کے بہی خواہوں کا فرض ہے کہ اپنی مادری زبان پنجابی کو اس کا جائز مقام دلانے کے لئے متحد ہو کر اس کی نشو ونما کے لئے بھرپور کام کریں تاکہ ہم پنجابی کو ذریعہ تعلیم و تدریس اور وسیلہ نشر و اشاعت تسلیم کروانے میں اسی طرح کامیاب ہو سکیں جس طرح سابق صوبجات سندھ و سرحد میں سندھی اور پشتو والے کامیاب ہو چکے ہیں۔ ملتانی پوٹھوہاری یا سرائیکی وغیرہ کو پنجابی (لہندی) سے علیحدہ سمجھنا اور پنجابی سے محض ماجھی (لاہوری) مراد لینا اسی طرح غلط ہے۔ اندھوں نے ہاتھی کے کان، ٹانگوں، دم اور سونڈ ہی کو ہاتھی سمجھ لیا تھا علاقائی بولیوں کو مستقل زبانیں قرار دینا۔ درحقیقت پنجابی زبان کی نشو و ارتقا کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کھڑی کرنا ہے۔

الغرض لہندی میں بلا کی شیرینی، توانائی، لوچ اور رس ہے یہ بولی بڑی ترقی یافتہ اور منجھی ہوئی ہے دوابہ سندھ ساگر میں جتنا کچھ ادبی سرمایہ پنجابی زبان کا موجود ہے وہ سب کا سب زبان و محاورہ کے اعتبار سے بالکل دھنی روپ کا حامل ہے۔ اس روپ کی تحریر و تقریر میں بالکل معمولی سا فرق ہے۔ دھنی کے روپ کے حامل چند شاعروں کا نمائندہ کلام ملاحظہ ہو اگرچہ کہ وہ دوآبہ سندھ ساگر کے مختلف مقامات کے رہنے والے ہیں:۔

۱۔ ملک بیلوہ (مرزا صاحبان سے اقتباس)

چڑھدے مرزا خان نوں جٹ دینگل دیندا مت
بھٹھ رناں دی دوستی کھری جنہاں ندی مت
ہس ہس لاوندیاں یاریاں رو رو دیندیاں دس
پٹے پٹاون یار دے سینے دے کے لت
جس گھر لایئے دوستی مول نہ گھتیئے لت
سٹھیں ہستہ نہ آوندی دانشمنداں دی پت

۲۔ بادشاہ مراد خانپوری

ملاں ہو کر علم نہ جانے اچی بانگ سناون کیا
بہمن ہو کر بید نہ جانے متھے تلک لگاون کیا

جوگی ہو کر جگت نہ جانے جھوٹے کن پڑاون کیا

جس بیڑی وچ ونجھ نہ چپہ اس بیڑی چڑھ جاون کیا

جس مہری وچ مہر نہ ہووے اس سنگ پیت لگاون کیا

جس گھر گتیاں نہ ہووے آدر اس گھر پیرا پاون کیا

جس حلوے وچ گھیو نہ ہووے اس حلویدا کھاون کیا

شاہ مراد کر تھیا تھیا نچن پتی بسشرماون کیا

۳۔ شاہ چراغ چوہانوی ؂

سن وے فریاد بیر نت پئی کرلیندی ونج آکھو بابل چوچکا کیئی ریت رچائیا

جدوں دی میں کھیڑیاں آئی سدھ تو نہ لئی کائی چاک وے ہزارے والیا پیریں مہندی لائیا

انبڑی نہ لکھی پاتی ویرن نے نہ پائی جھاتی چاک وے ہزارے والیا کوئی ڈوم نہ آئیا

نند تے جیٹھانی سس طعنے دین ہس ہس روندیاں چراغ وانگوں اینویں عمر گنوائیا

۴۔ شاہ شرف مریدوی ؂

نہ میں سوہنی نہ گن پلے میں تاں کس دامان کریساں

جاوے چوکاں میریاں چکڑ بھریاں میں تاں کیہڑی مل مل دھوساں

صابن تھوڑا اتے میل گھنیری میں تاں پئی کندھیاں تے بھوساں

شاہ شرفا جد ملیہم ماہی میں تاں پا زلفاں گل روساں

۵۔ قاضی عبدالعلیم سکنہ ڈھاب کلاں

واہ وا مرشد کامل اکمل عزت حرمت والا شمس الدین مبارک بندہ وچ سیال اجالا

کچے چم کرے بلغاری نظر کرے جاں بھر کے ڈبی بیڑی غفلت والی بنے لاتے پھڑ لے

ایڈ ملاح نہیں ڈٹھا کوئی ونج ہلاوے چپے غفلت دے گرداباں وچوں کڈھ گھنے جاں نپے

مرشد جنید اخاص حضوری وطن جنہاں ندا تونسہ   وچ زمین آسماناں ٹارے وحدت والا ڈھونسہ

۶۔ غازی مرید حسین سکنہ کھبلہ :-

بھل کے اکھیاں لا بیٹھی تیر عشق دے چھاتیوں پلار ہو گئے
آکھیں نیند نہ آوندی اک رتی بدلے پھلاں دے سیج تے خار ہو گئے
گیا اٹھ آرام جہاں وچوں بدلے سکھاں دے دکھ ہزار ہو گئے
ایم آپ اس عشق نے مشک بدھی بدلے صحت دے اکھ آزار ہو گئے

۷۔ اللہ وتہ جوگی جہلمی :-

شمع اک دھوکے داناں اے اس دھوکے دنیا ماری
ایسے دھوکے وچ پروانے ساڑی جند پیاری
دیوا بتی تیل پرایا کجھ نہ اہدا اپنا !
شام پوے تے روشن ہووے لے کے اگ ادھاری

۸۔ درشن سنگھ آوارہ سکنہ کالا گجراں :-

زاہد تینوں عقل مبارک جھگڑے ٹنٹے والی
شکر سائیں دا جس نے سانوں رکھیا عقلوں خالی
عشق محبت دی، ایہہ پوتھی جس دن توں ہے چھیڑی
الماری وچ گھٹ کے رکھی پوتھی عقلاں والی

۹۔ ہیرا سنگھ درد سکنہ گھگروٹ ضلع راولپنڈی

اسیں گیت وطن دے گاواں گے   سب جھگڑے ہور مٹاواں گے
ساڈی آنا جسنے نشانی لبھے   جیہڑی سانوں ہاپسن ہاری اسے

جس گودی پا کے پالے ہاں　　　　جبّ ند ماتا اتوں گھم واں گے

۱۰۔ پیر مہر علی شاہ گولڑوی آکھدے

اوتھے بردیاں منت دکا وندیاں نیں　　　　شالا آون وت کبھی اوہ گھڑیاں
کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا　　　　گستاخ اکھیں کتھے جا لڑیاں

۱۱۔ میاں الٰہی بخش کنڈل، بنڈ داودخاں

سسی سدھ سوال مرد نوں کیتا ذرا سنی وچ میندڑیاں باتاں
اچے قدر تیلیاں دھونیں انہاں تلیاں وانگ پراتاں
ڈردی وار ہیں تنہیں وعرت ہلاوندے انہاں واہ ٹرن دیاں گھاتاں
الٰہی بخشا شہد ے ٹرے کبھی مروندے ڈھلکیاں ہوئیاں واتاں

✳

باب ۴

دھنی کی ادبی خدمات

یہ علاقہ قدیم زمانے سے علم و ادب کے نشوو ارتقا میں بھرپور حصہ لیتا رہا ہے لیکن انگریزی عہد میں اس کی عسکری خدمات کچھ اس قسم کی رہی ہیں کہ بیرون علاقہ لوگ اس کی شہرت کا باعث صرف خوش پوش اور سجیلے جوانوں، دھنی نسل کے بیلوں اور زری جوتیوں ہی کو سمجھتے رہے ہیں چنانچہ اسی تاثر کے پیش نظر مولانا ظفر علی خان مرحوم نے بھی ایک دفعہ کہا تھا کہ ؎

نام اس تحصیل کا چکوال ہے　　　　خاک پاکستان کی یہ ڈھال ہے

اس علاقہ کی شمشیر زنی کے چرچے تو بکثرت رہے لیکن اس کی علمی و ادبی خدمات کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے حالانکہ یہاں کی سنگلاخ زمین جس طرح اپنے سینے میں پٹرولیم و معدنی کوئلہ کے وافر ذخائر سمیٹے ہوئے ہے اسی طرح علم و ادب کی دیرینہ اور توانا روایت کی امین بھی ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے

سنگھا پورہ کا دار العلوم

ٹیکسلا کے دار العلوم کی شہرت تو چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے لیکن اسی کی ہمعصر جس درس گاہ کا ذکر مشہور چینی سیاح ہیون سانگ (۶۳۰ء) نے اپنے سفرنامہ میں "سنگھ ہپورا" کے نام سے کیا ہے۔ اس کا چرچا علمی دنیا میں بہت کم سننے میں آیا ہے حالانکہ ہیون سانگ کے مطابق یہ دار العلوم بھی ٹیکسلا سے کسی صورت کم تر نہیں تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ سنگھ ہپورا یا سنگھا پورہ نامی مدرسہ کالج یا یونیورسٹی کہاں واقع تھی؟ ماضی کے ماہرین آثار قدیمہ میں اس شہر کے محل وقوع کے متعلق کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ جنرل کننگھم آرکیالوجیکل رپورٹ آف انڈیا میں لکھتا ہے کہ وادی کہون چوا سیدن شاہ کے قریب ملوٹ نامی گاؤں ہیون سانگ کا سنگھا پورہ ہے لیکن ڈاکٹر سٹین مذکورہ بالا خیال کی بڑے زور سے تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ جگہ ملوٹ ہرگز نہیں ہو سکتی بلکہ چوا سیدن شاہ ہی کے قریب وادی گندھالہ میں مورتی نامی مقام ہو سکتا ہے جہاں کہ اشوک کا بنایا ہوا ایک

استوپا تھا یا موضع وملیال کے قریب وہ جگہ ہو سکتی ہے جہاں کہ قدیم زمانے کے آثار "پنڈ" کے نام سے پائے جاتے ہیں یعنی ان دونوں نامور ماہرین میں سے کوئی بھی حتمی طور پر یہ نہیں بتا سکتا کہ سنگھا پورہ کہاں واقع تھا۔

ایک مسلمہ قانون

علم آثار قدیمہ کا ایک مسلمہ قانون ہے کہ پرانے عہد میں شہروں اور بستیوں کے نام خدا کے نام کے اشتقاق یا دیوی دیوتاؤں سے خاص نسبت کی وجہ سے بھی رکھے جاتے رہے ہیں۔ اس اصول کے تحت جب ہم سنگھا پورہ کے معانی پر غور کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ سنگھ بمعنی شیر ہے پور یا پورہ گوید میں ایسے شہر کو کہتے ہیں جس کے گرد پتھروں یا مٹی کا جنگلہ لگایا ہوا ہو تو گویا سنگھا پورہ کی بستی کسی ایسے دیوتا کے نام پر بسائی گئی تھی جو طاقت اور قوت کا نمائندہ تھا۔ ہندو دیو مالا میں راجہ ہرنیہ کیشپ اور اس کے بیٹے پرہلاد بھگت کا قصہ بڑا مشہور ہے۔ ہرنیہ کیشپ جیسے ظالم بادشاہ کو وشنو بھگوان نے نرسنگھ (شیر نر) کی صورت میں نمودار ہو کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

ہندو عقیدے کے مطابق وشنو نہایت ہی رحیم و کریم دیوتا ہیں۔ دنیا کو تباہی سے بچانے کے لئے انہوں نے نو اوتار لئے اوتار کے معنے نزول یا اترنے کے ہیں جب دنیا کی حالت خراب ہو جاتی ہے تو خدا بقول ان کے حیوان یا انسان کی صورت میں زمین پر جلوہ گر ہوتا ہے اسی نظریہ کی بنا پر بعض دیگر مذاہب ہندو مذہب میں جذب ہو گئے مثلاً بدھ مت اور بھاگوت مت۔

وشنو کے اوتاروں میں رام اور کرشن سب سے اہم مانے جاتے ہیں یہ کل اوتار دس ہیں۔ جن میں سے چوتھا نرسنگھ اوتار، انسان اور شیر کی مرکب صورت میں اور نواں بدھ کی صورت میں نمودار ہوئے لہٰذا سنگھا پورہ کا شہر اور درسگاہ کسی ایسی جگہ واقع ہونا چاہیئے جس کو ہندو بھی مذہبی استھان سمجھتے رہے ہوں۔

جب اس نقطہ نظر سے ہم وادی کہون اور علاقہ دھنی کے بعض مقامات پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں دو مقام ایسے نظر آتے ہیں جو مندرجہ بالا شرط پر پورا اتر سکتے ہیں ان میں سے ایک تو کٹاس ہے اور دوسرا سنگھ پورہ واقع رقبہ بھون۔ کٹاس کے گرد و نواح کے چند مقامات کے متعلق تو دعوے ہوتا رہا ہے کہ وہ سنگھا پورہ کا محل وقوع ہو سکتے ہیں لیکن خاص کٹاس سے مذہبی عقیدت کی وجہ "دھرتی نیتر" ہے جس کا مفصل حال قوم جنجوعہ کے ضمن میں درج کیا جا چکا ہے البتہ سنگھ پورا ایسی جگہ ہے جو کہ صوتی لحاظ سے سنگھا پورہ کے قریب ہے اور دوسرے اس جگہ واقع ایک چشمے کے پانی سے ہندوؤں کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ بقول مولانا ممتاز علی ایم اے بی ٹی تقسیم ملک سے پہلے بھون کے ہندوؤں کے ہاں جب کوئی پہلوٹھا لڑکا پیدا ہوتا تھا تو اس جگہ کا پانی ملا کر اسے بطور گھٹی

چلایا جاتا تھا علاوہ ازیں پہلی جیساکہ کوکٹاس کے مقام پر لگنے والے میلے کے اختتام پر بعض ہندو ناتھ سادھو وہاں سے اٹھ کر اسی سنگھ بھوار نامی جگہ پر رین بسیرا کے لئے ضرور آیا کرتے تھے اور پھر جس کے جا دھر سینگ سماتے چلے جاتے اس روایت کے پیش نظر میرا خیال ہے کہ ہیون سانگ نے جس بدھ بھکشوؤں کی درس گاہ کی زیارت کی تھی، وہ جگہ عین ممکن ہے کہ یہی ہو کیوں کہ اسی جگہ کے قریب "کالے والی بن" اور "موہڑی" وغیرہ جگہوں پر قدیم آبادیوں کے آثار آج تک بکھرے پڑے ہیں اور کئی ایک ایسے مقامات بھی پائے جاتے ہیں جن کے نام کا شیر یا شینھ لازمی جزو ہے مثلاً شینھ بکری اور شینھ مار وغیرہ۔

(ملاحظہ ہو رپورٹ بندوبست بابت ضلع کیمبل پور از مسٹر ٹالبٹ مہتمم بندوبست)

علاقہ دھنی میں بدھ مت کے آثار کے متعلق لالہ ہرکرن داس مولف تاریخ خاندان کیمبل پور سال صفحہ ۱۴۱ پر لکھتا ہے کہ جن علاقوں میں اب گکھڑ کہوٹ اور راوان (اعوان) آباد ہیں ان سے پیشتر آریہ آباد تھے جو بدھ مذہب رکھتے تھے کیوں کہ موضع نیلا میں ان کے آثار قدیمہ موجود ہیں۔ بلکسر کے قریب ایک پرانے شہر کے آثار برآمد ہوئے ہیں وہاں پر ساکی مٹی کا چبوترہ بعینہٖ موجود ہے۔ جو پچیس سو سال سے بنا ہوا ہے۔ اگر محکمہ آثار قدیمہ معمولی سی دلچسپی کا بھی اظہار کرے تو برصغیر کی قدیم تاریخ کی ترتیب و تدوین کے لئے اس علاقے سے قابل قدر مواد حاصل ہو سکتا ہے۔

اسی طرح موضع بیلو کے قریب بھی چبوترہ نامی ایک قدیم آبادی کے آثار موجود ہیں جہاں پر کہ قدیم زمانے کی لوہے کی بھٹیوں کے آثار بھی دیکھے جا سکتے ہیں وہیں ایک ایسا کنواں بھی برآمد ہوا ہے جس کا دہانہ بیضوی طرز کا ہے۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب کے نمونے لوہا کے آثار

اس کنوئیں کی تہذیبی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے محمد ادریس صدیقی کی تالیف وادیٔ سندھ کی تہذیب کے صفحہ پر موہنجوداڑو کے قدیم کنوؤں کے بارے میں یہ بیان خاص اہمیت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:-

"یہ کنوئیں اوپر سے نیچے تک پختہ ہیں اور سب کنوئیں گول ہیں لیکن دو ایک مقامات پر بیضاوی کنوئیں بھی بنے ہوئے ملے ہیں یہ اپنی وضع میں منفرد ہیں اور کسی دوسری جگہ نہیں دیکھے گئے۔"

محکمہ آثار قدیمہ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ایسی منفرد وضع کا کنواں علاقہ دھنی کے موضع بیلو میں بھی موجود ہے جو کہ آپ کو دعوت عام دے رہا ہے کیا آپ اس علاقے کی طرف توجہ مبذول فرمائیں گے ممکن ہے کہ موضع بیلو کے ارد گرد کھدائی کرنے سے موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی تہذیب کی رہ گمشدہ کڑی بھی مل جائے جو لوہے کا زمانہ"

کہا جاتا ہے۔

بطور جملہ معترضہ کے گزارش ہے کہ اس علاقہ کی جنگی اور فوجی صلاحیتوں کی شہرت نے اسکی علمی و ادبی ثروت مندی پر تاریکی کے اتنے دبیز پردے ڈال رکھے ہیں کہ اس سرزمین کی علمی و ادبی یا تہذیبی و ثقافتی توانائی و ثروتمندی کا جب ذکر چھڑ جاتا ہے تو سامعین و قارئین چونک سے پڑتے ہیں اور وہ اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں کرتے۔ لیکن ایسے حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ کسی ایسی ہی کیفیت کا میر انیس کو بھی سامنا کرنا پڑا تھا جب انہیں کہنا پڑا کہ ؎

فلک سے توڑ کے لایا ہوں ان زمینوں کو

خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

ادبی کارناموں کی چند مثالیں

اس علاقہ کی بدقسمتی تھی کہ اسے اپنی کوکھ سے پیدا ہونے والا کوئی صاحب قلم دانشور ایسا نہ مل سکا جو اس کے اس پہلو کو ہمدردانہ نظر سے دیکھتا اور اجاگر کرتا۔ اس کی ادبی خدمات کی طرف سب سے پہلے پروفیسر کرم حیدری کی نگاہ اٹھی تھی جنہوں نے اپنی کتاب "سرزمین پٹھوار" میں صد ۱۵۱ سے صد ۱۶۱ تک یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کا سرسری سا تعارف کرا رکھا ہے۔ پروفیسر احمد حسین قریشی مؤلف "پنجابی ادب کی تاریخ" نے بھی کسی قدر اس علاقے کے پنجابی شعراء کا ذکر کیا ہے لیکن راقم کو یہ عاجزانہ و انکسارانہ فخر حاصل ہے کہ علاقائی ادب تاریخ کے سلسلے میں چند معرکہ آرا تحقیقات کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پنجابی کے مقبول عام قصہ "مرزا صاحبان" کو سب سے پہلے پنجابی نظم کا جامہ پہنانے والا پیلو اسی علاقے کا باشندہ تھا۔ پنجابی غزل کا موجد بادشاہ مراد بھی اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ اردو غزل کا بانی ولی دکھنی (وفات ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۴ء) نہیں تھا بلکہ حضرت شاہ مراد ہی تھے گورمکھی رسم الخط کا پیش رو لنڈا بھی تحصیل چکوال کے دانشوروں ہی کی ایجاد تھا۔ برصغیر میں سب سے پہلا مغلیہ باغ بھی اسی علاقے کے ایک پرفضا مقام کلر کہار میں لگایا گیا تھا جس کا نام باغ صفا ہے اور وہ اب تک موجود ہے۔

الغرض جس پہلو سے بھی دیکھا جاتے یہ تسلیم کئے بنا چارہ نہیں کہ اس علاقہ میں علم و ادب اور روحانیت و تصوف کی روایتیں بڑی قدیم اور دیرپا ہیں اگر زبان زد عام کہاوتوں کی کچھ معنویت ہوتی ہے تو "دھن پر فقیر دی مرن" کی مقامی کہاوت میں پوشیدہ معنویت اسی امر پر دلالت کر رہی ہے کہ تارک الدنیا سنیاسیوں اور عارف باللہ

درویشوں سے عقیدت اس خطہ کی سرشت میں ایسی رچی بسی ہوئی ہے کہ بعض اوقات یہ عقیدت حماقت کی حد تک بھی جا پہنچتی ہے اور لوگ مجبوراً "دھن احمقاں" کی پھبتی بھی کس دیتے ہیں۔

بہرحال حماقت کی حد تک خوش عقیدہ انہی مریدان باصفا کی رشد و ہدایت کے لئے وقتاً فوقتاً اس خطہ میں ایسے بزرگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے زبانی یا نظم و نثر میں اس خطہ کے لوگوں میں شریعت و طریقت کے اتباع اور ان سے وابستگی کی جوت جگاتے رکھی ان میں سے بعض نے آلۂ ابلاغ و اظہار کے طور پر فارسی یا پنجابی کو استعمال کیا اور بعض نے صرف اردو کو۔ تاریخی ترتیب کے پیش نظر پہلے ہم فارسی زبان کو لیتے ہیں جو کہ محمود غزنوی کے عہد (۱۰۳۰ء) سے سکھوں کے عہد (۱۸۴۹ء) تک سرکار دربار کی زبان رہ چکی ہے۔

و۔ فارسی ادب

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ فاتح قوم جہاں بھی جاتی ہے اپنی اجتماعی معاشرتی اور ادبی روایات اپنے ساتھ لے کر جاتی ہے برصغیر میں بھی فارسی ادب کا آغاز اسی حقیقت کے ماتحت ہوتا ہے سب سے پہلے محمود غزنوی (۹۹۷ – ۱۰۳۰ء) نے ہندوستان میں ایرانی عنصر کو داخل کیا اگرچہ محمود کے زمانہ ہی سے ہندوستانی مقبوضات میں فارسی بولنے والے لوگ بکثرت آباد تھے لیکن محمود اور اس کے چند جانشینوں کے عہد میں پایۂ تخت غزنی رہی اس لئے وہی علاقہ شعراء و ادباء کا مرجع رہا البتہ جب غزنویوں سے سلجوقیوں نے سلطنت چھین لی اور ہندوستان کے مقبوضات کے سوا ان کے پاس کچھ نہ رہا تو لاہور علم و ادب کا مرکز بنا۔ غزنوی دور سے وابستہ یوں تو بہت سے شاعر تھے لیکن دو مشہور شاعر ایسے ہیں جو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے اور فارسی شعر و شاعری میں نام پیدا کیا ان میں سے ایک تو مسعود سعد سلمان (۱۰۴۶ – ۱۱۲۱ء) ہے اور دوسرا ابوالفرج رونی (وفات ۱۰۹۱ء) ان کے بعد خاندان غلاماں کے بادشاہ بلبن (۱۲۶۶ – ۱۲۸۶ء) کے عہد میں افق ہند پر ایک اور ستارہ چمکا جس کا نام امیر خسرو (۱۲۵۳ – ۱۳۲۵ء) ہے ان کا دوست خواجہ حسن دہلوی (۱۲۵۴ – ۱۳۲۶ء) بھی طوطیٔ ہند کے نام سے شہرت دوام کا مالک تھا۔

مغلیہ عہد میں فارسی ادب اور زیادہ چمکا اس خاندان کے اکثر بادشاہ اور ان کے امراء خود بھی شعر کہتے تھے اور ان کے دربار میں فارسی گو شاعروں کا جمگھٹا بھی رہتا تھا جس میں نادری، سمرقندی، قاسم کاہی، شاہ طاہر دکنی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اکبر اگرچہ خود ان پڑھ تھا مگر علماء و فضلا کی صحبت کا دلدادہ تھا اس نے شعر و ادب کی پرورش کے لئے مناسب فضا مہیا کر دی اس نے فارسی کو سرکاری زبان بنا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو بھی فارسی سیکھنے لگے۔ مختلف مذاہب کے اختلاط سے مذہبی لٹریچر میں ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا اسلامی تصوف کے ساتھ ہندو ویدانت اور فلسفے کا امتزاج اور گہرا ہوتا گیا۔ جہانگیر کے عہد سے شاہ جہاں کے عہد تک فارسی علم و ادب کی خوب گہما گہمی رہی اس کے بعد بتدریج زوال آنے لگا اور اگرچہ کہ تصانیف کی کمی نہ تھی لیکن ان کا معیار پست ہوتا ہو گیا اس دور کے مشہور شعراء میں فیضی، عرفی، نظیری، ملک قمی، ظہوری، طالب آملی، ابوطالب کلیم صائب تبریزی، غنی کاشمیری منیر، برہمن، ناصر علی سرہندی، بیدل، حزیں وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نثر نگاری کے میدان میں بھی مغل دور کے ادیب پیچھے نہیں رہے، مگر انداز بیان میں تکلف و تصنع ہر جگہ نمایاں ہے۔ اس دور کے صوفیانہ رسائل کی عبارت نسبتاً سادہ ہے، مگر تاریخی کتابوں میں وہی دقت پسندی نمایاں ہے اس عہد کی مشہور تاریخی کتابیں یہ ہیں:-

ہمایوں نامہ از گلبدن بیگم، ابوالفضل کا اکبر نامہ اور آئین اکبری، ملا عبدالقادر کی منتخب التواریخ تاریخ فرشتہ طبقات اکبری، تاریخ الفی، طبقات شاہ جہانی، وقائع نعمت خان عالی اور سیر المتاخرین وغیرہ لغات نویسی بھی مغلیہ دور کا اہم ادبی مشغلہ رہا۔ تذکرہ نویسی کی طرف بھی توجہ دی گئی۔

مغلیہ دور کے خاتمے کے بعد میر، غالب، آزاد بلگرامی، شبلی، اقبال وغیرہ نے فارسی روایت کو خوب پروان چڑھایا لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد فی الحقیقت فارسی علم و ادب کا چراغ برصغیر ہند و پاکستان میں گل ہو گیا۔

خطہ دکنی میں فارسی علم و ادب کا مطالعہ تین دوروں کے حوالے ہی سے کیا جا سکتا ہے:-

پہلا دور بادشاہ مرادؒ کا، اس کی ابتدا تقریباً شاہ جہاں کی تخت نشینی (۱۶۲۷ء) سے ہوتی ہے اور خاتمہ تقریباً ۱۸۸۷ء میں۔

دوسرا دور مولوی سراج الدین کا، اس کا آغاز ۱۸۸۷ء سے ہوتا ہے اور خاتمہ تقریباً ۱۹۳۱ء میں

تیسرا دور ذکاء اللہ بسمل کا، یہ تقریباً ۱۹۳۱ء سے شروع ہو کر تا حال جاری ہے۔

پہلا دور

(۱۶۲۷ء تا ۱۸۸۷ء)

نام :- شاہ مراد تخلص :- شاہ مراد جائے پیدائش خانپور تحصیل چکوال

وفات :- ۱۱۱۴ھ / ۱۷۰۲ء • مدفن : تکیہ شاہ مراد

شاہ مراد جن کے والد کا نام قاضی جان محمد تھا۔ صدیقی قریشی خاندان کے چشم و چراغ تھے اس علاقہ میں آپ کا خاندان علمی فضیلت کے باعث ممتاز مقام کا حامل رہ چکا ہے آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی لیکن انتہائی تعلیم غالباً بھیرہ میں ہوئی روحانی مسلک کے لحاظ سے آپ قادری (دانشمندری) ہیں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ آپ اس علاقہ کے پہلے فارسی شاعر ہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ باوجود تلاش بسیار تا حال آپ سے پہلے کسی شاعر کا فارسی کلام دستیاب نہیں ہو سکا ان کی نسل کے مولوی سراج الدین مرحوم نے ۱۹۰۸ء میں قلمی بیاضوں اور لوگوں کی زبانی روایت سے یکجا کر کے ان کا فارسی ریختہ، اردو اور پنجابی کلام "گلزار شاہ مراد" کے نام سے شائع کیا تھا جو اب تقریباً نایاب ہے اب دوبارہ بزم ثقافت چکوال کے زیر اہتمام راقم نے اسے نئی ترتیب سے شائع کیا ہے۔

گلزار شاہ مراد میں آپ کی ۸ غزلیں اور ایک مختصر سی مثنوی ہے ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک قادر الکلام شاعر تھے آپ کی تمام غزلوں کا رنگ صوفیانہ ہے ان میں سوز و ساز، نغمہ و مستی، جوش اور ولولہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے لیکن بایں ہمہ ان کا اسلوب روایتی ہی ہے البتہ بعض بعض اشعار پھڑکا دینے والے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ اقبالی فلسفہ خودی کے مدون کرنے والوں میں شاہ مراد کو بھی پیش روی کی فضیلت حاصل ہے۔ مثنوی کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

عجب تو ئی کہ ترا حسن بے نظیر آمد	عجب منم کہ مرا عشق در ضمیر آمد
عجب تو ئی کہ چراغ آمدی تو در شب تار	عجب منم کہ چوں پروانہ سوختم دنار

غزل کے چند اشعار بطور نمونہ یہ ہیں۔

دلبر بگیر دامن عاجز مروت در گلزار من	مہ بیں نور شش چو خورشیدش شاہ دیدار من

در بیان حسن او گر بر زبان حرفے نہم　　شمع گرود ہر دلے پروانہ بر گفتار من

یار من در وقت رخصت از درون بیرون نشد
خوب شد از تیغ ہجرش دل در آں دم خون نشد
گر دلم گردوں شکستے من شکستم پشت او
ہر چہ شد از یار شد از گردش گردوں نشد
شاہ از درو فراقش نامراد آمد گدا
بر سر من آں چہ شد آں بر سر مجنوں نشد

۲- نام: صدر الدین　　تخلص: نور الدین　　جائے پیدائش: کھوکھر تحصیل چکوال
تاریخ پیدائش: ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء　　تاریخ وفات: /۱۹۰۵ء

شیخ صدر الدین المعروف والمتخلص بہ نور الدین قوم شیخ گڈہوک - آپ حضرت میاں نیک محمد صاحب مدفون بمقام ڈھڈی نزد للہ تحصیل پنڈ دادنخان کے بھانجے اور دست پروردہ تھے فارسی زبان کے بلند پایہ

صوفیانہ مسلک نقشبندیہ (ڈھڈی کھل)

ادیب اور فارسی و پنجابی کے اچھے شاعر تھے آپ نے حضرت میاں نیک محمد نقشبندی کی مختصر سی سوانح عمری بزبان فارسی لکھی ہے علاوہ ازیں گڈہوک قوم کی مختصر سی تاریخ بنام گلدستہ تاریخ گڈہوک بھی فارسی میں لکھی ہے دونوں کتابچے تا حال قلمی صورت ہی میں ہیں آپ ضلع اٹک میں بعہد عملداری سکھاں خزانچی کے عہدے پر فائز تھے انگریزی عہد میں آپ ملتان میں فارسی علم و ادب کی تعلیم و تدریس میں مصروف رہے آپ نے اپنے ماموں اور مرشد کی مدح میں تین قصیدے اور ایک مثنوی یادگار چھوڑی ہیں، مثنوی میں آپ نے اپنی باطنی کیفیات کو آپ بیتی کی شکل میں بڑے دلکش انداز میں عیاں ہے قصائد میں زور اور پختگی موجود ہے بطور نمونہ قصیدہ اور مثنوی کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

انتخاب از قصیدہ اول در مدح میاں نیک محمد صاحبؒ

شدم بخدمت پیرے خدا نما داخل　　کہ گرد نور ہدایت بچشم ما داخل

سواد دیدہ و دل را زحبذبہ لاہوت | نمود کحل جواہر بہ توتیا داخل
فقیر نیک محمد چو دست من بگرفت | یقین کسند بہ ریاض ابد بقا داخل
خیال عمدہ چکد نور دین زخامۂ تو | مگر شدی بحضور خدا نما داخل

انتخاب از قصیدۂ دوم در رثاء حضرت علیہ الرحمۃ

جان من آرام شد آرام جان من کجاست | از فرقتش پایم بگل سرو روان من کجاست
بودم چو گل خنداں باد حالا چو غنچہ دم زدم | ایں غنچہ گل گردد از غنچہ دہان من کجاست
درد درون گویم بہ کے شد آں طبیب از من نہاں | تشخیص فرمایم کہ کند آں نبض دان من کجاست
نیک محمد نام او شد نیکنام و نیک دین | نیکی ربود از نیکواں آں نیکدان من کجاست
از نور دین جوئی اگر یابی نہ مثلش در جہاں | مشفق شفیق و مہرباں آں مہربان من کجاست

انتخاب از مثنوی

شب شدم چوں دراز بستر خواب | خواب نوشیں زرخ کشاد نقاب
ہم دریں سیر عالم رویاء | پیر دیدم چو خضر مہ سیما
پیش رفتم سلام برخواندم | دست بستہ ستادہ در ماندم
تاکنوں زاں کلام شکر بار | جاں پر از نکہت است و دل گلزار

نثر کے نمونے

بادشاہ مرادؒ کی اور تو کسی فارسی نثر کی تحریر کا نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا البتہ ان کے ایک تمسک عشقی کا نمونہ گلزار شاہ مرادؒ سے نقل کیا جاتا ہے۔

تمسک عشقی بادشاہ مرادؒ

منکہ فقیر شاہ مراد عرف خدا خراہ متوطن قصبہ محبت پور معمولہ پرگنہ باطن ام جو کہ ہفت روپیہ سکۂ الٰہی کہ ازاں ہفت روز را خلاص باشد از دلارام صراف نقود تلوب سکنہ قصبہ دلبر آباد معمولہ پرگنہ خوبی قرض گرفتم و نذیو راز زر دل کہ مرصع بہ لعل عشق کردگار و در غیر روزگار بہا تش بے شمار بودہ باشد در پیش او گرو ی نہادم کہ عند الطلب پیش رافع عذر نسازم اگر عذرے کنم در محکمۂ عشق بازاں نامسموع گردد و بنا براں ایں چند کلمہ بطریق تمسک عشقی

نوشتہ دادہ شدہ کہ تا فی الحال سند باشد فی التاریخ روز میثاق رفقط

گواہ شد	العبد	گواہ شد	گواہ شد
رنگ زرد دل پر درد	لاغر جسم گریہ چشم	مراد عاشق دل در دہد عجبو بے	سوز شب و روز

نمونہ نثر شیخ نورالدین

اقتباس از کتاب سوانح عمری حضرت میاں نیک محمد مدفون بمقام ڈھڈی (قلمی)

"بدانکہ اجداد و بزرگان آنحضرت را موطن اصلی قصبہ بھیرہ بود کہ از مضافات صوبہ پنجاب حالا متعلق ضلع شاہ پور است داد شاں در آنجا از اقوام ہنود عرف اروڑہ بودہ اند چنانچہ جد حقیقی آنحضرت بسیار مالدار و بنام شاہو کار مشہور بودہ چونکہ در مزمان ماضیہ وادان بالیہ شاہان افاغنہ و درّانی از طرف کابل می آمدند و ملک متحدہ دوآبہ سندھ ساگر را تاخت و تاراج میکردند و از شاہو کاران نذرانہ سخت و جزیہ کرخت میگرفتند لہٰذا جد حقیقی آں قبلہ گاہی ازیں معنے پیوستہ در گرداب اضطراب میماند"۔

دوسرا دور

اسے مولوی سراج الدین کا دور قرار دیا گیا ہے اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زیادہ تر منظوم فارسی تعتیں یقینیں یا تاریخیں لکھی گئیں البتہ بطور استثناء کے ایک مرثیہ اور ایک نظم بھی ملتی ہے۔

۱۔ مولوی سراج الدین

آپ باوا شاہ مراد کے خاندان سے تھے اور آپ مولانا نعیم صدیقی کے والد بزرگوار ہیں آپ خود بھی اچھے عالم تھے اور آپ کے ادبی ذوق کا اندازہ اس بات سے لگ سکتا ہے کہ آپ نے پہلی بار ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء میں حضرت شاہ مراد کے فارسی، ریختہ، اردو اور پنجابی کلام کو گلزار شاہ مراد کے نام سے جمع کر کے شائع کیا مولوی صاحب نے باوا شاہ مراد کے تمسک عشق کو نظم کا جامہ پہنا کر گلزار شاہ مراد میں ہی شامل کر رکھا ہے علاوہ ازیں آپ نے تاریخ تالیف کتاب گلزار شاہ مراد کے زیر عنوان ایک طویل نظم کہہ رکھی ہے جس کے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں :۔

حمد شس ہزار گویم شکر شس لکھوک صد ہا | منت سپاس اور اکالطاف کرد برما
زاں جملہ شاہم اوئے خوش خلق و خوش نہاوے | از دام حرص آزادے سرشار عشق مولے
ناظم ہمہ احمد دین است عالم خلاف اینست | چوں ظلمت شبین است فریاد رس اغثنا
اشعار پر فصاحت ابیات با لطافت | اقوال پر نصیحت چوں جمع شد بہ عجبا
از آسمان ندائے آمد برائے تاریخ | از شعرہائے موزوں ہذا کتاب عجبا

۱۹۰۸ء

۲۔ مولوی احمد دین چکوالی

آپ اپنے زمانے کے عالم اجل اور فاضل بے بدل تھے ضلع جہلم کے علاوہ دور دراز سے لوگ علم دین حاصل کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے آپ ایک حاذق طبیب بھی تھے آپ کا آبائی وطن موضع لوکہ تحصیل پنڈ دادنخان ضلع جہلم تھا وہاں سے آپ کے والد ماجد مولوی غلام حسین نقل مکانی کر کے چکوال میں آ گئے خاندان کے بعض افراد ابھی تک اپنے وطن مالوف ہی میں آباد ہیں۔ سلسلہ نسب یوں بیان کیا جاتا ہے۔ مولوی احمد دین بن غلام حسینؒ قاضی محمد احسن بن محمد حنیف بن محمد بن نور محمد۔ آپ اعوان قطب شاہی قوم کے ہیں اس لئے علوی بھی کہلاتے ہیں۔

آپ کی تاریخ پیدائش ۱۲۶۸ھ ہے تاریخی نام چراغ دین تجویز ہوا لیکن شہرت اپنے دوسرے نام احمد دین ہی سے حاصل کی۔ ۲۴ محرم ۱۲۷۴ھ کو باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تمام علوم متداولہ میں اپنے والد ماجد ہی سے سند تکمیل حاصل کی آپ قرآن کے حافظ بھی تھے ۱۲۹۸ھ میں زیارت حرمین شریفین کے لئے روانہ ہو گئے وہاں پر اپنے والد ماجد کے استاد حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مہاجر (وفات ۲۴ رمضان ۱۳۰۸ھ) کے سایۂ عاطفت میں رہے انہی سے علم میقات وغیرہ کی تکمیل کی۔ علاوہ ازیں درج ذیل اساتذہ کرام سے بھی تلمذ حاصل تھا:۔

مولانا حبیب الرحمان مہاجر مکی، شیخ العلماء علامہ ذہنی وحلان ۱۲۸۰ھ میں حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ سے بیعت کی اور آپ کو خرقہ خلافت عطا ہوا۔ ۱۳۱۰ھ میں دوبارہ سفر حجاز کے ارادہ سے نکلے اور مختلف مقامات مقدسہ کی زیارت کر کے بغداد شریف میں وقت کے ولی اللہ حضرت نقیب سلمانؒ سے سلسلہ قادریہ میں بھی بیعت کی اور صاحب اجازت ہوتے۔

واپسی پر کراچی کے کھڈہ میں مولانا عبید اللہ صاحب کے ہاں کچھ عرصہ قیام کیا وہاں ایک اسلامی مدرسہ

"مظہر العلوم" کی بنیاد ڈالی جو کہ تاحال اشاعت علوم دینیہ کر رہا ہے مولانا محمد صادق صاحب آپ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں آپ نے وہاں بھی خدمت خلق کے لئے ایک مطب کا اجراء فرمایا اور سستے علاج کے لئے آپ نے شہرت دوام حاصل کی۔

قدرت سے طبیعت شاعرانہ پائی تھی عربی فارسی اور اردو زبان میں شعر کہتے تھے لیکن زیادہ توجہ شاعری کی طرف نہ تھی کبھی کبھار کہا کرتے تاریخی مادے بحساب ابجد نکالنے میں آپ کو ید طولےٰ حاصل تھا بے شمار لوگ آپ سے تاریخی مادوں کے لئے استدعا کرتے اور آپ لکھ کر بھیج دیتے فارسی اور اردو شعرا کے اشعار پر اکثر تضمین کی ہے الداعی تخلص تھا زیادہ کلام فارسی میں ہے۔

انگریزوں نے افغانستان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی اور بری طرح شکست کھائی اس واقعہ کو فارسی اشعار میں حافظ شیرازی کی پہلی غزل پر تضمین کرتے ہوئے بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا پہلا شعر یہ ہے ؎

نصاری پُر خسارہ اہل کابل را مقابل شد
الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا

اپنے لائق فائق بیٹے قاضی ضیاءالدین سابق ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کی ناگہانی وفات پر جو مرثیہ لکھا اس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

چشم عبرت برکشا اے دوست حال من ببین
کز مقام بام اعلےٰ اوفتادم بر زمین
گشت آں نور بصر یک لخت غائب از نظر
ہمچو اخگر شد جگر از شعلہ ہائے آتشین
الغیاث ایں درد مارا نیست درماں الغیاث
الغیاث ایں بحر مارا نیست پایان الغیاث
سال تاراج چنین تاباں صنم اکنوں شنو
۱۹۲۵ء
بے بدل، رحمت زحق باجسم وجان او قرین
۱۳۴۴ھ

قصہ دردم یکی از صد بیاسد در بیان
نامہ حسرت گذشتہ از شمار اربعین
تحفہ حمد و صلوٰۃ از من بود ہر دم قبول
در جناب کبریا و نزد ختم المرسلینؐ

مولوی صاحب کے حین حیات تونسہ شریف کے صاحبزادگان کے مابین سجادہ نشینی اور املاک کی تقسیم کے بارے میں جھگڑا پیدا ہو گیا اور نوبت عدالت تک جا پہنچی پھر اپیل در اپیل کی صورت میں عدالت عالیہ اور پریوی کونسل میں مقدمات دائر ہوئے اس واقعہ سے آپ کو بہت دکھ ہوا اور اپنے اس دکھ کا اظہار انہوں نے ایک نظم کی صورت میں کیا اور اسے تونسہ شریف کے سجادہ نشین کی خدمت میں بھیج دیا یہ نظم حافظ شیرازی کی اس غزل پر گویا تضمین تھی جس کا مطلع ہے ؎

ما مریداں روی بسوئے کعبہ چوں آریم، چون
روی بسوئے خانہ خمار دارد پیر ما

اس طویل نظم کا ایک بند یہ ہے ؎

مسند تونسہ شریف اندر مفادات طریق	بود ممتاز زمانہ از پئے تنویر ما
اندریں اقلیم پنجاب از مساند منتخب	ذکر اوصاف کمالش برتر از تعبیر ما
اندریں حال آیتے از سورۂ مریم بران	منطبق آمد ازاں گشتہ عیاں تحذیر ما
خبر شکیب ہائے دریں تشویش ما را چارہ نیست	کایں چنیں رفت است در روز ازل تقدیر ما
ربنا اغفر لنا اکتبنا عامداً او ناسیاً	عفو کن تقصیر در تقدیم دیا تاخیر ما

باش اے عاجز خموش از صدق دریاری بکوش
شاید آید در قبولی نالہ شب گیر ما

۳۔ میر کریم الدین برق کریالوی

آپ ڈسٹرکٹ بورڈ سکول جہلم میں مدرس تھے جب منشی فیروز الدین نے دیوان حسن ملتانی طبع کروایا تو آپ نے تاریخ کے یہ اشعار کہے جو دیوان حسن ملتانی سے نقل کئے جاتے ہیں ؎

مبارک کتابیست عالی مقام | کزو ستر حق ظاہر آ بالتمام
مرتب شدہ اندریں روزگار | زدستِ مبارک مہے تابدار
بود نام و کامش بحق الیقین | شدہ نام آں شیخ فیروز دین
نمودہ شرح فاضل ذوالوقار | بہ تحقیق کامل و فکر ہزار
مصنف حسن بود نیکو خیال | کہ در ذاتِ حق بود محو جمال
کلامش لطیف است و سخنش برین | گوے بردہ از شاعرانِ زمین
چنین گفت ای برقؔ ہاتف بہ من | بگو سال تاریخ اصل سخن

بکن قصہ را دور رو دروش بزن
عیاں شد دوبارہ غلام حسن
۱۸۸۷ء

چوں لفظ قصہ را از مصرع ثانی تفریق کنند یعنے دور کنند سال تاریخ طبع کتاب ہذا پیدا گردد
واٰں سنہ ۱۸۸۷ء برباشد
عیاں شد الخ - قصہ = ۱۸۸۷ء

نثری نمونے

اس دور کی فارسی نثر کا نمونہ زبدۃ الفاضلین شیخ فیروز دین اول مدرس فارسی گورنمنٹ سکول جہلم کی تحریر سے اخذ کر کے پیش کیا جاتا ہے شیخ موصوف کی جائے پیدائش موضع کھوکھر زیر تحصیل چکوال ضلع جہلم ہے آپ گڈہوک (شیخ) خاندان سے تعلق رکھتے ہیں علم و ادب کا ذوق آپ کو ورثہ میں ملا تھا آپ بڑے علم دوست، سخن شناس، نکتہ دان اور فاضل آدمی تھے آپ نے دیوان حسن ملتانی جو کہ صوفیانہ شاعری کا ایک عمدہ اور کلاسیکل نمونہ ہے ۱۳۰۴ھ میں بصرف زر کثیر مطبع سراج المطابع جہلم سے شیخ محمد الدین وکیل جہلم کی فرمائش پر زیور طبع سے آراستہ کیا اور ساتھ ہی اس کی تصحیح کر کے فوائد غریبہ و نکات عجیبہ کے ساتھ محشی کیا، نمونہ تحریر یہ ہے۔

"چند روز پیش از شہادت ایں دو شعر بر زبان مبارک می راندند"

اے خداوند آسمان و زمین　　زیرِ فرمان تو مکان و مکین
عزتم را اگر نگاہ داری　　نیست اندیشہ از معزالدین

عنداللہ یار خان پیش خانِ ما ظاہر ساختند کہ درویشی معزالدین نام از جناب باری بادادو فرنگیاں مقرر است او در خواب پنجہ مرا بزور فشردہ، از من بعد آورترا است فتح و نصرت در جنگ نصیب اہل فرنگ خواہد شد۔

دیوانِ حسن پر آپ کی حاشیہ نویسی کا نمونہ ہے:۔

"اے ساقی ابرار با عجاز تو نازم　　در آب نہاں ساختہ برق تجلی

ساقی ابرار یعنی خالق موجودات، اعجاز در لغت عاجز کردن و خرق عادت انبیاء و اینجا مراد از قدرت حق صنعت او کہ مصرع ثانی بیان آنست۔ آب مراد از شراب و برق تجلی رنگ و گرمی آں۔ نزد عالمان کیمیا ایں مسئلہ مسلم است کہ در آب بقدرت حق حرارت نہاں است وگرنہ آب را ایں رقت و جریان نبودے حالانکہ ظاہر آ اجتماع ضدین ناممکن، پس معنی شعر چنین باشد کہ اے خدا از قدرت تو در حیرتم کہ در شراب وحدت انوار و تجلیات خود پنہاں ساختہ شیخ فیروز دین۔

تیسرا دور

چوہدری ذکاء اللہ بسمل

اس دور کے سرخیل چوہدری ذکاء اللہ بسمل ہیں اس دور میں مضامین متنوع ہو گئے ہیں۔ غزل مثنوی اور نعت وغیرہ پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ فارسی نثر کا رواج کلیتہً اٹھ گیا۔ اس دور میں بسمل صاحب کے علاوہ پروفیسر بخشی، انور علی انور، ریاض چشتی، ڈاکٹر عرفانی اور باغ حسین کمال قابل ذکر ہیں۔

نام، ذکاءاللہ تخلص بسمل تعلیم ایم اے ایل ایل بی، پیشہ، وکالت، مولد، موضع کوٹ ترلاں ضلع جہلم مسکن چکوال، سال پیدائش، ۱۸۹۵ء

آپ ایک خوشحال گھرانہ کے مایہ ناز فرزند ہیں۔ اعلےٰ تعلیم لاہور میں حاصل کی۔ فلسفے میں ایم اے اور

اور قانون میں ایل ایل بی کی ڈگریاں لینے کے بعد چند برس تک وہیں قیام فرما رہے اور زندگی کے وسیع تر تجرباتی شعبوں سے متعلق رہ کر اپنی شخصیت اور فکر و فن کو جلا بخشی، دوران تعلیم شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کی شاگردی کا شرف بھی حاصل کیا تعلیم سے فارغ ہو کر کچھ عرصہ لاہور کے ایک کالج میں لیکچرار رہے بعد ازاں اردو کے مشہور ادیب اور شاعر خان احمد حسین خان کے ماہنامہ "شباب اردو" کے عملہ ادارت میں شرکت کی پھر انگریزی روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کے نائب مدیر رہے آخر کار صحافت سے جی بھر گیا اور وکالت کی ٹھانی۔ ابتدا میں عارضی طور پر جہلم میں پریکٹس کی پھر ۱۹۳۱ء میں مستقلاً چکوال کو اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اب چکوال کے نامی گرامی وکلا میں شمار ہوتے ہیں ادبی زندگی کے اتار چڑھاؤ بھی یہیں دیکھنا نصیب ہوئے آپ اردو، فارسی کے پر گو، کہنہ مشق اور پختہ ذوق شاعروں میں سے ہیں ان کے متعدد دیوان مرتب ہو چکے ہیں مگر افسوس کہ کوئی ایک بھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا۔ مطبوعہ تصانیف میں اردو کی ضخیم قانونی کتاب 'ذکائیہ' اور قانون ہی سے متعلق ایک اور انگریزی کتاب شامل ہے۔ قانونی حلقوں میں ذکائیہ کا بڑا چرچا ہے۔ اسلامی قانون وراثت پر یہ کتاب 'ہدایہ' سراجیہ اور ملا کے محمڈن لا کے پایہ کی تسلیم کی جاتی ہے بلکہ اسلامی قانون وراثت پر یونانی قانون وراثت کے اثرات کی بحث کے ضمن میں تو یہ کتاب مذکورہ بالا کتابوں سے کافی آگے ہے انگریزی کی ایک بلند پایہ ادبی تصنیف "رباعیات سرمد" بھی بصورت مسودہ موجود ہے اس کتاب میں حضرت سرمد کی تمام رباعیات کے انگریزی ترجمہ کے علاوہ سرمد کی سیرت، شخصیت اور فن پر سیر حاصل اور بصیرت افروز تبصرہ بھی شامل ہے ۱۹۳۰ء کے وسط میں چھ ماہ کے لئے بغرض سیر و سیاحت مشرقی افریقہ بھی گئے تھے۔ بسمل کی فارسی شاعری کا نمونہ مشتے از خروارے کے مصداق درج ذیل ہے۔

منظومات

اقبال

جہاں غلام کدہ است و اندرو اقبال — بشان مردم آزاد زندگی کرد است
بداد مردہ جہاں را پیام جاں پرور — دریں زمانہ بگویم پیمبری کرد است
قضا چو کرد ز مرگِ قلندر دانا — جہاں ز میکدۂ آتشیں تہی کرد است

غزل

چہ گویم وریں گلشن چنیں کردم چناں کردم — ز عشق گل نگارے زندگی را جاوداں کردم

بخلوت می‌روم شبہا می اندیشم کہ فیض کیست ... نگہ بے کردم و ہر ذرہ را کہکشاں کردم

پرسید از دلم یاراں چگون است و کجا باشد ... خدا آں نقد را حافظ کہ دزدش پاسباں کردم

بہ نعت مصطفےٰ اسمبل چو بکشادم زبانم را

زبانم را بحرف نطق یزداں ہم زباں کردم

قطعہ

ایکہ دہلیز شما قبلہ و آماخ من است ... در جہاں زیستم از شوق شما نغمہ سرائے

ہمچو بوئے گل صحرا بروم از صحرا ... در پسم نیست کسے کہ شود نوحہ گرائے

نام۔ انور علی بخشی، تخلص، انور تعلیم، ایم اے۔ پیشہ، معلمی، مولد، رہتاس مسکن حال راولپنڈی

سال پیدائش: ۱۹۱۵ء

بخشی صاحب رہتاس کے بخشی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں تلاش کے سلسلے میں آپ کچھ عرصہ تک لاہور میں قیام پذیر رہے وہاں ڈاکٹر اقبال کی صحبتوں میں رہ کر فیضیاب ہوتے رہے فارسی کلام تو تھوڑا سا ہے لیکن آپ اردو کے بہترین شاعروں میں شمار ہوتے ہیں ۱۹۳۵ء میں بزم ادب چکوال کے روح رواں تھے آج کل گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں فارسی کے استاد ہیں۔ فارسی غزل کے چند اشعار حاضر ہیں ؎

چہ نیرنگ اندریں گلزار بینم ... بہ رعنائی چو گل ہر خار بینم

بحسن خود چہ نازی کاندریں شہر ... لبے یوسف مصر بازار بینم

دریں منزل نمی گیرد قرارے ... کسے کو را دل بیدار بینم

چو انورؔ عاجزی اے مدعی ساز ... ترا در عاشقی ہشیار بینم

۳۔ نام، ریاض الدین۔ قلمی نام، ریاض چشتی تعلیم، میٹرک۔ مولد: کھوکھر زیر، تحصیل چکوال مسکن، چکوال۔ سال پیدائش: ۱۹۱۲ء

ریاض شیخ گڈھوک قانونگوی خاندان کا فرد ہے یہ خاندان اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں دولت اسلام سے مشرف ہوا آپ کے والد شیخ ضیاء الدین تحصیلدار تھے ریاض نے ابتدائی تعلیم راولپنڈی میں پائی

میٹرک کے بعد گارڈن کالج میں داخلہ لیا لیکن طفل گریز پا ثابت ہوتے اور یوں اعلےٰ تعلیم سے محروم رہ گئے کچھ عرصہ امداد باہمی کے محکمے میں ملازم بھی رہے لیکن طبیعت کی لاابالیت نے یہاں بھی نہ ٹکنے دیا اس لئے بہت جلد مستعفی ہو گئے کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہونے کی بدولت انہوں نے فارغ اوقات میں پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا اور یوں اپنی علمی قابلیت کو کافی ترقی دے لی۔ آپ کا اردو فارسی کلام موجود ہے فارسی کلام "شعلہ احساس" کے نام سے مرتب ہو چکا ہے۔ یار لوگ دل لگی کے لئے آپ کو "عصر حاضر کا بیدل" بھی کہتے ہیں۔ ریاض کی اردو نثر خاصے کی ہے اکثر دوستوں کا خیال ہے کہ ریاض اگر شاعری کی بجائے نثر کو اپنا فن قرار دیتا تو صاحب طرز انشاپردازوں میں سے ایک ہوتا۔ ایک ادبی ماہنامہ "ادبیات" بھی نکالتا رہا ہے لیکن یہ شعلہ مستعجل ثابت ہوا اور دو چار شمارے نکالنے کے بعد ابدی نیند سو گیا۔ نمونہ کلام کے طور پر غزل کے چند شعر درج ذیل ہیں :۔

چہ نگاہِ غم نوازے چہ بیانِ دردمندے ہمہ گریہ بہارے ہمہ برق زہر خندے

بہ جہاں تیرہ بختاں سحرے نہ سرکشیدہ تو اگر چہ جلوہ کردی بہ فراست بلندے

بہ دلم ہزار زخمے بہ لبت ہزار حرفے من و جان بلب رسیدہ تو و رسم وعظ و پندے

شبِ غم کہ سر نیاید چہ مراد دل بر آید
بجواب گفت ما ہے کہ ریاض بعد چندے

نام۔ عبدالحمید عرفانی خواجہ، تعلیم ایم اے، پی ایچ ڈی۔ مولد، گوجرانوالہ۔ مسکن، چکوال۔ سال پیدائش:
آپ نے اپنا بچپن اپنے ماموں خواجہ محمد شفیع کے ہاں چکوال ہی میں بسر کیا اور میٹرک تک تعلیم یہیں حاصل کی اس کے بعد لاہور سے ایم اے کیا اور سرکاری ملازم ہو کر ایران میں پاکستانی سفارت خانے میں تعلیمی اتاشی کے ممتاز عہدے پر فائز ہو گئے۔ تہران یونیورسٹی ہی سے پی ایچ ڈی کیا آپ پہلے پاکستانی ہیں جن کی تخلیقات تہران سے شائع ہونے کا اعزاز رکھتی ہیں آپ ڈاکٹر برق کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے ڈاکٹر غلام سرور صدر شعبہ فارسی کراچی یونیورسٹی، کرنل محمد خان ڈائرکٹر پاک آرمی ایجوکیشن کور راولپنڈی کے علاوہ ڈاکٹر برق کو جس شاگرد پر ناز ہے وہ آپ ہی ہیں۔ ڈاکٹر برق ان اصحاب ثلاثہ کو اپنی بیس سالہ تعلیمی زندگی کا ماحصل اور جیتی جاگتی تصانیف قرار دیتے ہیں آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں "رومی عصر" آپ کی وہ مایۂ ناز تصنیف ہے جو

تہران سے شائع ہوئی۔ آپ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر ہیں۔
فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے۔

سرخوش از تست جان من جانم — نشۂ دیگری نمے دانم!!
نرگس تو کشود بر رویم!! — عالم بیکراں و پایانم!!
از تو بزم خیال من رنگین — از تو جوشش و خروش ممانم!
حاصل عمر عشق تو باشد! — مرحبا طالع درخشانم!
خواجہ عبدالحمید عرفانی — عاشق خاک پاک میرانم!

۵۔ باغ حسین کمال

مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو کتاب ہذا کا حصہ اردو
غزل کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

فراق یار بر طبعم گراں شد — تمنائے ملاقاتش جوان شد
بتے کہ بود بر ما لطف فرما — عجب است گر زما او بدگمان شد
جہاں عشق را صد مرحبا است — کسے کو عشق در زد جاوداں شد
چوں رفتم از درون بزم یاراں — کمال من برویت شان عیاں شد

(ب) اردو ادب

اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں مختلف نظریئے

اردو زبان کی ابتداء کے متعلق آج تک جو مختلف قسم کے نظریات پیش کئے جا چکے ہیں۔ ان کی جھلک مختصراً ذیل میں دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۱۔ گریرسن نے اردو کو ادبی ہندوستانی کی شاخ بتاتے ہوئے اسے عہد مغلیہ کی پیداوار تسلیم کیا ہے اور اس کی ابتداء مغربی ہندوستان کے شہروں سے بتاتی ہے۔

۲۔ نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے کہ اردو دکن میں پیدا ہوئی۔

۳۔ سید سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق اردو کا اولین گہوارہ وادیٔ سندھ ہے۔

۴۔ ڈاکٹر مسعود حسین اور ڈاکٹر شوکت سبزواری بضد ہیں کہ اردو کی ابتداء دہلی کے قرب و جوار اور گنگا جمنا دوآب سے ہوئی۔

۵۔ حافظ محمود شیرانی کی رائے میں اردو کی ابتداء پنجاب سے ہوئی۔

۶۔ فارغ بخاری نے اب جدید نظریہ پیش کیا ہے کہ اردو کی ابتداء سابقہ صوبہ سرحد سے ہوئی اور اس کی ایجاد کا سہرا پٹھان گوجروں کے سر ہے جن کی آبادیاں افغانستان کے علاقہ لغمان اور دیگان میں دریائے کونٹر کے دائیں کنارے سے چاروں گار کی حدود تک پھیلی ہوتی ہیں اس علاقہ میں اس بولی کو پشتی اور

اسس قبیلے کو پشاتی کہتے ہیں یہی وہ قبیلہ ہے جسے برصغیر میں گوجر، گجر یا گرجور کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

تمام محققین اب اس بات پر تو متفق ہو چکے ہیں کہ یہ کہنا صریح غلطی ہے کہ مغلوں نے اردو کی بنیاد ڈالی وہ یوں کہ ہندو تقرب حاصل کرنے کے لئے فارسی بولتے تھے مغل شہنشاہوں نے تو فارسی اور ترکی ہی اپنی زبان رکھی لیکن پھر بھی باہمی میل جول کے ردعمل کے طور پر ایک زبان کا دوسری زبان پر اثر پڑنا ناگزیر تھا چنانچہ نظم میں استعمال ہونے والی زبان کا نام ریختہ اور عورتوں کی خاص زبان کا نام ریختی ہے اردو ہندوستانی کی وہ قسم ہے جس میں دیگر زبانوں کے الفاظ کے علاوہ فارسی، عربی لغات کی افراط ہے۔

گریرسن جیسے یورپی ماہرین لسانیات "ہندی" سے یہ جو مفہوم لیتے ہیں کہ وہ زبان جس میں سنسکرت کے الفاظ بکثرت ہوں اور عربی فارسی کے کم وہ ہندی ہے بالبداہت غلط ہے۔ ہندی سے درحقیقت ہندوستانی مسلمان مراد ہیں۔ جیسے امیر خسرو کہتے ہیں "ان مسلمانوں کی جان بخش دی گئی جو ہندی تھے"۔ یورپی نقاد۔ للو لال جی کی "پریم ساگر" کی زبان کو ہندی سمجھتے ہیں اور یہیں سے انہیں ٹھوکر لگتی ہے اور وہ اردو کو مستقل زبان نہیں سمجھتے حالانکہ وہ مختلف زبانوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

دکن میں پیدائش کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں عرب جہازران ساحل مدراس تک پہنچ چکے تھے اور کچھ وہاں آباد بھی ہو گئے۔ ان کے اختلاط سے یہ زبان وجود میں آئی لیکن یہ نظریہ بھی غلط ہے کیوں کہ سامی اور دراوڑی زبانوں کی آمیزش سے یہ زبان پیدا نہیں ہو سکتی۔

نقوش سلیمانی میں سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے چونکہ عرب پہلے پہل سندھ میں آئے اس لئے وادیٔ سندھ اردو کی جائے پیدائش ہے لیکن ممکن ہے کہ اس اختلاط سے جو زبان بنی ہو وہ موجودہ سندھی ہو جس میں عربی کے الفاظ بکثرت ہیں۔

حافظ محمود شیرانی کے مطابق اردو کا وطن پنجاب ہے چونکہ دونوں زبانوں میں الفاظ مشترک ہیں اور گرامر وغیرہ کا معمولی سا فرق ہے اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ چونکہ اردو اور پنجابی دونوں شورسینی سے متاثر ہیں اس لئے دونوں میں اشتراک ہے بقول ڈاکٹر شوکت سبزواری اندرونی مطابقت نہیں ہے۔

جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ چوں کہ شروع اسلامی سلاطین کے عہد سے دہلی پایہ تخت مقرر ہو گیا تھا۔ لوگوں کو سرکار دربار سے تو اکثر تعلق رہتا ہی ہے اور ضرورت ایجاد کی ماں ہے کے مصداق اس اختلاط سے نئی زبان کا ظہور ہو گیا ہو گا اور یہی وہ زبان تھی جسے امیر خسرو نے اپنایا اور یہی وہ زبان تھی جو دلی گیری جاتے

جاتے وقت دکنی میں تبدیل ہو گئی چونکہ دکنی میں عربی فارسی کی آمیزش کم ہے لہٰذا یہ قیاس صحیح نہیں ہو سکتا کہ اردو کی ابتداء دکن سے ہوئی۔

لے دے کے یہی بات بنتی ہے کہ ہم موجودہ زمانے کے ماہرین لسانیات پروفیسر جولس بلاک، پروفیسر ٹرنر پروفیسر بیلی، پروفیسر چٹرجی اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی تحقیقات کی رو سے اردو کا سرچشمہ اس زبان کو قرار دیں جو پنجابی اور برج بھاشا دونوں کی ماں تھی یعنی پراکرت زبان جو مسلمانوں کی آمد کے وقت پشاور سے لے کر الہ آباد تک بولی جاتی تھی ؎[1]

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمان فاتحین شمال ہی کی جانب سے ہندوستان میں داخل ہوتے اول انہوں نے سابق صوبہ سرحد اور پانچ دریاؤں کی سرزمین میں قیام کیا اس کے بعد دہلی کی جانب پیش قدمی کی مسلمانوں کے صدہا خاندان جو ترک، مغل اور افغان تھے اور جن کی زبان عام طور پر فارسی اور پشتو تھی پنجاب سے لے کر دہلی تک آباد ہو گئے اس زمانہ میں یہاں "جدید ہند و آریائی دور کی پراکرت" زبان بولی جاتی تھی اس دیسی زبان میں غیر ملکیوں کی زبان کی آمیزش ہونے لگی اور اس امتزاج سے اردو کی پیدائش ہوئی۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان اپنی کتاب مقدمہ تاریخ زبان اردو کے صـ ۲۵۴-۶ پر ایک پتے کی بات لکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

"جدید آریائی زبانوں کی تحقیق کے سلسلے میں محققین کی ایک عام غلطی یہ بھی رہی ہے کہ انہوں نے بعض بولیوں کو بعض علاقوں سے مخصوص کر دیا ہے۔ اس قسم کے لسانی مغالطوں کا پول ہم شروع سے کھولتے آئے ہیں جیسا کہ نئی تحقیق سے اب یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ مہاراشٹری پراکرت کا مہاراشٹر دیس سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ شورسینی کی ایک ترقی یافتہ شکل تھی۔ دراصل ہندوستان میں زبانیں، قبیلوں، سماج کے مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کی جماعتوں سے مخصوص رہی ہیں۔ چنانچہ معیاری زبان کی تشکیل میں ان سب نے ہاتھ بٹایا ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ گجرات کے قدیم مصنفوں کی زبان جسے انہوں نے گوجری یا گجری کے نام سے بارہا یاد کیا ہے اس کو ملک گجرات سے دور کی بھی نسبت ہے یہ گوجری یا گجری انہی گوجروں کی زبان ہے جن کے حسن کی تعریف میں امیر خسرو یوں رطب اللسان ہیں ؎

گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی — آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی
از ہر دو لبت قند و شکر می ریزد — ہر گاہ بگوئی کہ "دہی لیہو دہی"

[1] پراکرت ہی کا دوسرا نام اندر کوتھا جو درحقیقت گوجر قبیلے کی گوجری زبان ہے۔ انور

اور جو سلاطین دہلی کے لشکروں میں بڑی تعداد میں شامل تھے ان گوجروں کا تعلق ہریانہ کے علاقے سے تھا چنانچہ قدیم اردو کے گجراتی مصنفین کی زبان کا تجزیہ کیجئے تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ ان کی گجری زبان کو گجراتی سے دور کا بھی واسطہ نہیں وہی گوجر یا گجر قبائل جن کے نام پر پنجاب میں شہر گجرات اور مغربی ہند میں صوبہ گجرات کے نام پڑے گوجروں کے نام سے نواح دہلی میں آج تک بسے ہوتے ہیں گجراتی مصنفین کی گوجری انہی گوجروں کی قدیم بولی ہے جن کا تعلق قدیم ہریانہ دلیس سے تھا۔

تاریخی تحقیق جوں جوں مختلف علاقوں کی آبادیوں کی نقل و حرکت پر صحیح صحیح روشنی ڈالے گی. لسانی گتھیاں خود بخود حل ہوتی جائیں گی. جس طرح آج دوآبہ کے مختلف راجپوت گھرانوں میں راجستھانی گیت رائج ہیں ممکن ہے کہ دکن میں بھی شمالی ہند کی کوئی ایک بولی نہ گئی ہو بلکہ کئی بولیاں پہنچی ہوں جن کی آمیزش سے بعد کو وجہی اور قلی قطب شاہ کی معیاری دکنی متشکل ہوتی ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ یہ تمام بولیاں نواح دہلی ہی سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے اردو کی ابتدا اور ارتقا پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے اس راہ میں جو سنگ گراں حائل ہے وہ یہ ہے کہ دہلی کے نواح کی بولیوں (ہریانی اور ہندوستانی) کے قدیم نمونے ناپید ہیں۔

اس طویل اقتباس کے درج کرنے کی غرض یہ تھی کہ یہ بتایا جاسکے کہ اردو کی ابتدا اور ارتقا کے متعلق آخری تحقیق کہاں تک پہنچ چکی ہے اور اب وہ کونسی مشکل سے دوچار ہے نیز یہ کہ درحقیقت اردو گوجروں کی زبان کی ارتقائی صورت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ گوجر نواح دہلی کے ہیں یا کسی اور مقامات کے۔

جب یہ بات طے ہو گئی کہ اردو گوجری کی ارتقائی صورت ہے تو پھر ہمیں فارغ بخاری کی اس رائے سے متفق ہونے میں کوئی عذر مانع نہیں ہونا چاہیئے کہ اردو کی ماں سرحدی علاقہ کی "ہندکو" ہے جو خود گوجروں کی زبان کی ارتقا یافتہ صورت ہے۔

فارغ بخاری ہی کا یہ کہنا بھی بالکل درست ہے کہ محققین کو سب سے بڑا مغالطہ یہ ہوا ہے کہ وہ اردو شاعری کے آغاز کو اردو زبان کا زمانہ پیدائش سمجھ بیٹھے ہیں حالانکہ اردو کا پہلا شاعر محمد علی قطب شاہ ہو یا ولی دکنی یا شاہ مراد خانپوری اس سے اردو زبان کی تخلیق پر کوئی روشنی نہیں پڑتی اور نہ ہی یہ سند اس دعوے کو تقویت پہنچاتی ہے۔

زبانیں دنوں میں تو بنتی نہیں ان کی نشو و ارتقا کے لئے سینکڑوں برس درکار ہوتے ہیں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اردو قلعہ معلے میں پیدا ہوئی انہیں یہ بھی بتانا چاہیئے کہ کیا وہاں آسمان سے ٹپک پڑی تھی

کسی زبان کو معیاری اور ادبی درجے تک پہنچنے کے لئے پہلے بول چال کا ذریعہ بننا پڑتا ہے عوام کی آغوش میں پلنا پڑتا ہے خوشی وغمی کے جذبات میں ڈھلنا ہوتا ہے صدیوں انہی فطری سانچوں میں ڈھل ڈھلا کر اس قابل ہوتی ہے کہ اس میں نظم وضبط پیدا ہو اسکی صرف ونحو مرتب ہو، فرہنگیں لکھی جائیں اسے رسم الخط کی قید میں لایا جائے اور اس کی ترقی اور اصلاح کے طریقے سوچے جائیں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ اردو زبان کی تحقیق کے دوران سابقہ صوبہ سرحد کی زبانوں کو بالکل درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا یہ بات واقعی بڑی حیران کن ہے بقول ڈاکٹر مسعود حسین خان زبان کا قبیلوں اور مختلف معاشرتی طبقوں کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ قبیلے اور طبقے مرور ایام کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل وحرکت کرتے رہتے ہیں تو پھر کیوں اٹک کے اس پار علاقے کی طرف دھیان نہیں دیا گیا کیا یہ اکبر اعظم کی پالیسی کا غیر شعوری اثر تو نہیں؛ جس نے سیاسی وقبیلوی تعصب کی وجہ سے پٹھانوں کو چن چن کر تہ تیغ کیا اور ان کی بستیوں کو تاخت وتاراج کرنے کے علاوہ ان کے نام بھی اس طرح بدل دیئے کہ اب ان کی داستان تک بھی داستانوں میں نہیں رہی حالانکہ تاریخی حقیقت یہی ہے کہ

(۱) پشتو ہندوستان کی زبانوں میں سب سے قدیم اور افغان تہذیب سب سے قدیم تہذیب ہے اس لئے مابعد کی تمام دوسری زبانوں اور تہذیبوں پر اس کا اثر ہونا لازمی ہے۔

۲۔ ہندوستان میں اول تا آخر تمام یلغاریں شمال مغرب کی طرف سے ہوتی رہیں اور ان یلغاروں کے ہمراہ ہمیشہ لشکر افغانوں کے ہوتے تھے انہی لشکروں میں ایک نئی زبان کا ریختہ تیار ہوا جس نے لشکر کی رعایت سے اردو نام پایا۔

۳۔ افغانوں کے ملک میں اس نے جنم لیا اور انہی کی آغوش میں پلی، بڑھی۔

۴۔ افغانوں کی بنائی ہوئی سراؤں میں پروان چڑھ کر اس نے فصاحت کی سند حاصل کی۔

۵۔ افغانوں کے ساتھ یہ ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچی اور ان کی بستیاں ہی اس کا مرکز بنیں۔

۶۔ افغانوں نے ہی نظم ونثر کی تخلیق کا آغاز کیا اور ہندوستان کے بیشتر عظیم شاعر اور ادیب افغانی النسل تھے۔

۷۔ اردو کو پشتو الفاظ سے پاک کرنے کی شعوری کوششوں کے باوجود آج بھی اس میں پچاس فیصد پشتو الفاظ ملتے ہیں۔

۸ ۔ سابق صوبہ سرحد کے مرکزی شہروں میں اردو زبان کی ابتدائی شکل "ہندکو" کی صورت میں رائج ہے جو دکنی زبان سے اتنی مماثلت رکھتی ہے کہ ان کے افعال، مصادر اور بیشتر الفاظ ایک دوسرے سے ملتے ہیں ۔

سالہا سال کی تحقیق کے بعد محققین آج اس فیصلے پر پہنچے ہیں کہ تمام ہندوستانی بولیوں کا ماخذ ایک زبان ہی ہے اور اس ایک زبان کو تلاش کرنے کے لئے ہمیں لازماً آریوں کے قدیم وطن باختر کا رخ کرنا پڑتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ آریوں کے بنیادی اور سب سے بڑے قبیلے پکت (پختون) کی زبان پکتی (پختو) تھی جو انتہائی ترقی یافتہ زبان بن چکی تھی یہ زبان آریوں کی قدیم ترین زبان ژند سے ملتی جلتی ہے ادھر اس کی ساخت پہلوی سے بھی مماثلت رکھتی ہے اس لئے پشتو اور پہلوی دونوں زبانوں کا ماخذ ژند ہی معلوم ہوتی ہے ۔

تین سو سال قبل از مسیح ضلع مردان کی تحصیل صوابی کے موضع "لہور" کے ایک افغان عالم پنجانی نے سنسکرت زبان کی بنا ڈالی جو کہ پشتو، اوستا، اراٹی، [illegible] ویدک (سکھٹری) سیناتی، سباتی، فینقی، براہمی یا وانانی زبانوں کا انتخاب ہے چونکہ سنسکرت ایک منتخب بولی تھی لہذا یہ منتخب طبقے تک ہی محدود رہی اسے عوامی بولی کی حیثیت کبھی حاصل نہ ہو سکی ۔

آرین اقوام کی قدیم بولیاں "ویدک" کہلاتی تھیں رفتہ رفتہ ان بولیوں سے ایک بین القبائلی بولی پراکرت (فطری بولی) معرض ظہور میں آگئی یہ بولی ان قبائل کے راہ و رسم اور میل جول کے لئے تو بڑی کارآمد تھی مگر تحریر میں نہ لائی جا سکتی چنانچہ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے خروشتری رسم الخط ایجاد کیا گیا اور یہی رسم الخط سنسکرت کا مورث بھی ہے ۔

آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ یہی پراکرت آگے چل کر "ہندکو" کے نام سے مشہور ہوئی عرصہ دراز کے بعد باختر کی سرزمین وہاں کے باقی ماندہ آریہ قبائل پر تنگ ہو گئی تو انہوں نے جنوبی علاقے کی طرف بڑھ کر سندھ کی وادی میں بسنے والے قدیم پختون قبائل پر دھاوے بولنے شروع کر دیئے ان مسلسل حملوں کی تاب نہ لا کر قدیم پختون قبائل نے جو اب قدرے مہذب ہو گئے تھے میدانی علاقوں میں پناہ گزین ہوتے اور قلعہ بند بستیاں آباد کر کے رہنے سہنے لگے جنکو انہوں نے کوٹلہ، کوٹلہ اور کوٹ وغیرہ کا نام دیا کوٹلہ، کوٹلی پشتو کے شمالی لہجہ کے لفظ ہیں ۔

قدیم پختون قبیلے شہروں میں آباد ہو کر زراعت سے محروم ہو گئے تو انہوں نے تجارت اور صنعت کو اپنا لیا نئے قبیلوں نے دیہات پر قبضہ کر کے زراعت شروع کر دی نئے قبائل کی زبان خالص پشتو تھی یہ لوگ نسبتاً اجڈ بہادر اور شہری لوگوں سے زیادہ طاقتور تھے اس لئے شہریوں کو حقارت سے خاریان (شہری) یا خوشے خاریان

(فضول شہری) کہنے لگے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہوں ہی نے سب سے پہلے شہریوں کو کوہ ہندوکش کے قریب بسنے کی وجہ سے ہندو اور ان کی بولی کو "ہندی" یا ہندکو کا نام دیا رفتہ رفتہ وہ سب شہریوں کو ہندو ہی پکارنے لگے اور ان کے ملک کا نام بھارت کی بجائے ہندوستان اور زبان کو ہندی کہا۔ رفتہ رفتہ باہمی میل جول کے نتیجے میں ایک دوسرے کی زبان اور لہجے میں تغیر آنا شروع ہو گیا۔

جیسا کہ کہیں اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ افغانستان کا گوجر قبیلہ وہاں پر پشانی[1] اور ان کی زبان پشتی کہلاتی ہے جب یہ برصغیر میں داخل ہوتے تو ان کے قبیلے کا لفظی ترجمہ کر کے انہیں گوجر کا نام دیدیا گیا حالانکہ مؤلف کتاب شاہان گوجر اس بات سے انکاری ہے کہ گوجر گوچر سے بنا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو باب حالی قوم گوجر کتاب ہذا" افغانستان کی پشتی یعنے گوجری زبان کے اعداد سرحد کی شہری زبان "ہندکو" سے ملتے جلتے ہیں اس کا اندازہ یوں لگ سکتا ہے

ہندکو :- اک، دو، ترے، چار، پنج، چھے، ست، اٹھ، نو، دس

پشتی :- ای، دو، تریہ، چار، پانچہ، شے، ساتہ، آشت، ناوہ، دایہ

اسی طرح سوات۔ دیر۔ تیراہ۔ کاغان۔ ہزارہ۔ کشمیر، تبت اور برصغیر ہند و پاک میں یہ لوگ آباد ہیں۔ اپنی مخصوص زبان ہندکو ہی بولتے ہیں جس کو بعض محققین نے گوجری اور بعض نے ہریانی کا نام دے کر دہلوی یا کھڑی بولی کا ماخذ بتایا ہے۔

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ اردو زبان کو یہ نام تو مغلیہ عہد میں اردوئے معلے سے ملا۔ لیکن اپنی اصل کے لحاظ سے یہ "ہندکو" ہے جو مرور ایام اور مختلف علاقوں کی مقامی بولیوں کے اثر و تاثر سے موجودہ اردو کی شکل میں ترقی پا کر ادبی و معیاری بلکہ قومی زبان کا مرتبہ پا چکی ہے۔

جب یہ طے پا گیا کہ اردو کا قافلہ "ہندکو" کے نام سے سرحد کی طرف سے چل کر برصغیر کے دور دراز کونوں تک گوجروں اور افغانوں کے لشکروں کے ذریعے پہنچا۔ تو اس جدید تحقیق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان کے ارتقاء میں پنجاب عموماً اور علاقہ دکھنی کا خصوصاً اتنا ہی حصہ ہے جتنا کہ قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کا۔

---

[1] ہندی کا پشو بمعنی مویشی کہیں اس کا مادہ تو نہیں - ۱۲ انور

قلی قطب شاہ یا ولی دکنی کی شاعری کے مخاطب اس زبان کے جاننے والے ہی ہو سکتے ہیں جو کہ اولاً دکن میں موجود تھے اسی طرح ہمارے اردو کے پہلے شاعر بادشاہ مراد کے مخاطب بھی وہی لوگ تھے جو اردو کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور وہ لوگ اولاً اسی علاقے کے باشندے ہو سکتے ہیں۔ بادشاہ مراد کی زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ فوجی اردو کی طرح اس عہد میں بھی لوگ باگ پنجابی نما اردو یا اردو نما پنجابی بول چال میں استعمال کرتے تھے اور وہ بادا صاحب غالباً پہلی دفعہ اسے لکھنے پڑھنے میں استعمال کرنے کی داغ بیل ڈالی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو ہند کو زیر اثر دکنی اثرات سے بالکل علیحدہ اور الگ ارتقائی منازل علاقہ زیر بحث میں اسی طرح کر چکی ہے۔ جس طرح کہ دکن میں اور ان دونوں نہروں کا سنگم دہلی کے پایۂ تخت میں جا کر سو گیا۔

اس قسم کے سانحات دنیا میں شاذ نہیں ہیں دنیائے علم و حکمت میں اکثر ایسے اتفاقات ہو چکے ہیں مثلاً متحدہ ہندوستان میں لائلپور کے ایک مشہور انقلابی ہنس راج وائرلیس نے بھی اٹلی کے مارکونی سے بالکل الگ تھلگ انہی دنوں میں وائرلیس ایجاد کر لی تھی یہاں تک کہ وائرلیس اس کے نام کا لازمی حصہ بن چکا ہے لیکن جب اسے پیٹنٹ کرانے کے لئے غلام ہندوستان کے ہنسراج لائلپوری نے بین الاقوامی پیٹنٹ ادارہ کے پاس یہ ایجاد پیٹنٹ کرانے کے لئے بھیجی تو اسے یہ معلوم کر کے بے انتہا مایوسی ہوئی کہ آزاد اٹلی کے ایک شخص مارکونی کے نام پر یہ ایجاد پہلے ہی پیٹنٹ ہو چکی ہے۔ حالانکہ یہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں تھے اور نہ انہیں ایک دوسرے کے کام کی نوعیت کا علم ہی تھا۔ لہٰذا ولی دکنی پہلا صاحب دیوان ہونے کی حیثیت سے اگر اولیت کا مالک قرار دیا جائے۔ تو یہ دوسری بات ہے لیکن جہاں تک اردو غزل کی ایجاد کا تعلق ہے اس کا سہرا تو حضرت شاہ مراد ہی کے سر بندھتا ہے جو کہ ولی دکنی سے ۱۳ سال پہلے فوت ہو چکے تھے اور جن کی ایک اردو غزل کا حوالہ حافظ محمود شیرانی نے اپنی مستند کتاب "پنجاب میں اردو" کے صد ۱۳۳ پر بلا تعین زمان و مقام دے رکھا ہے اس کا مقطع ہے :-

کیا شعر عجب استاد سوں ہے یا دلبر حسن آباد سوں ہے
یا دیختہ شاہ مراد سوں ہے مقبول ہو یا منظور رہیا

حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ آپ کے دکنی وغیرہ کی طرف آنکھ بند کر کے اور اردو [illegible] کے عدم ثبوت کے باوجود اردو
[illegible]
[illegible]

کہ آج تک کسی محقق نے ان کا ذکر نہیں کیا شاہ مراد کے ریختہ اور اردو کلام کے جو نمونے آگے آرہے ہیں ان کی بنا پر بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ فارغ بخاری نے اردو کی پیدائش کا جو نظریہ پیش کیا ہے اور شمال مغرب میں اردو نظم کے جو عبوری نمونے خوشحال خان خٹک (۱۶۱۳-۱۶۹۸ء) ان کے ہمعصر رحمان بابا یا ان کے متاخر شاہ مراد اور شاکر اٹکی کی شاعری سے پیش کئے جارہے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ خطہ دہن کا شاہ مراد ہی وہ شخص ہے جسکی سعی سے شمالی ہند میں اردو زبان معیاری زبان بننے کے قابل بن سکی تاکہ آگے بڑھ کر اپنی مترادف دکنی زبان سے برابر کی سطح پر پایۂ تخت دہلی میں پہنچ کر پنجہ آزمائی کرسکے۔

خوشحال خان خٹک کی پشتو نما اردو نما شاعری کا نمونہ یہ ہے ؎

سور ہیروان دِ یہ زرگر نوی سنوار یا
بیا د زڑہ تو آزار آخلے یار یا یار یا
پہ خادِ دم دسوگند دے با ور و کا
چہ ہیشہ دم مم لہ خاطرتی وساریا
کلہ کلہ لہ حالہ خبر آخلہ
بیچارہ خوشحال خپل زرہ در پسے ہاریا

تم نے سرخ ہیروان (ناک کا زیور) سنار سے نیا نیا ہوایا ہے۔ اے محبوب کیا پھر لوگوں کے دلوں کی بد دعا لیتے ہو۔ خدا کی قسم تم ہر وقت مجھے یاد آتے رہتے ہو۔

بیچارے خوشحال خان نے تمہارے لئے اپنا دل ہار دیا ہے کبھی کبھی اس کی خبر لیا کرو۔

رحمان بابا کی فارسی نما غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بو جھلے تو مارا کجا ہات ہے
کہ دھلے تو خیلے بڑی بات ہے
بہ کوئے تو گفتم کہ مسکن کنم
ولے کہ مرا ایں در اجات ہے
ہے دادی دشنام دگالی مرا
بسو یم ہیں از تو سوغات ہے
ز آغوش رحمان مرو بار قیب
کر ایں سفلہ بدخو و بدذات ہے

(ماخوذ از ادبیات سرحد حصہ سوم)

خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا سولہویں صدی عیسوی میں پشتو کے عظیم شاعر ہو گزرے ہیں۔ یہ دونوں شاعر ہمعصر تھے لیکن ایک دوسرے سے ملنے کا موقع نہیں زندگی بھر نہیں مل سکا ان نمونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سابق صوبہ سرحد میں اردو [illegible] گزر چکی ہے اور اس کی مسیں بھیگنی شروع ہوگئی ہیں اور [illegible] ہوگئی [illegible] جارہا ہے

عموماً مشہور ہے کہ ولی دکنی (۱۰۷۹ھ — ۱۱۵۵ھ / ۱۶۶۸ء — ۱۷۴۲ء) اردو غزل کا مؤسس ہے اور اسے اردو کے ساتھ وہی نسبت دی جاتی ہے جو چاسر کو انگریزی اور رودکی کو فارسی شاعری کے ساتھ بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ اگرچہ غزل اردو کی ابتدا دکن سے ہوئی اور دکن کے قدیم غزل گو شعراء میں محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ — ۱۰۲۰ھ / ۱۵۸۰ — ۱۶۱۱ء) وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے لیکن ان جیسے شاعروں کے کلام کے مطالعہ ہی سے بخوبی پتہ لگ جاتا ہے کہ ان کی غزلوں میں فارسی کا انداز کم ہے برخلاف اس کے بھاشا شاعری کا انداز غالب ہے۔ سب سے پہلے غزل کی روایت کو اگر صحیح طور پر کسی نے برتا ہے تو وہ ولی ہے۔ لیکن میری تحقیق اس ضمن میں یہ ہے کہ اس صفت میں بھی شاہ مراد کو ولی دکنی پر سبقت حاصل ہے کیوں کہ بابا صاحب ولی دکنی سے کم و بیش نصف صدی پہلے اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ ولی نے تو سعد اللہ گلشن سے ملاقات (۱۱۳۵ھ) کے بعد اس طرف رخ کیا حالانکہ ہمارا شاعر اس سے بہت پہلے ریختہ اور اردو غزلوں کو فارسی روایت کے مطابق کہنے میں مہارت کا مظاہرہ کر چکا تھا اور زبان کی صفائی کے معاملے میں بھی ولی دکنی سے کوسوں آگے ہے اس دعوے کا ثبوت مہیا کرنے سے پہلے دوآبہ سندھ ساگر کے ایک اور شاعر کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو اس بات کا قوی ثبوت مہیا کرتا ہے کہ علاقہ زیر بحث اردو زبان اور اس کی شاعری کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس شاعر کا نام شاکر اٹکی ہے۔

ڈاکٹر برق کے بموجب شاکر کا ایک مختصر سا قلمی دیوان گورنمنٹ کالج کیمبلپور کی لائبریری میں موجود ہے لیکن اس کے حالات زندگی سے کوئی شخص واقف نہیں دیوان کے مطالعہ سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ پہلے اٹک (دریائے سندھ کے کنارے ایک قصبہ) میں رہتا تھا اور غالباً اپنے مرشد یحییٰ عرف جی بابا کی خدمت میں جی بابا کا روضہ دریائے اٹک کے کنارے ہے ہر سال عرس ہوتا ہے اور سال بھر زائرین وہاں آتے رہتے ہیں قیاس یہ ہے کہ جی بابا کی وفات کے کافی عرصہ بعد شاکر نوشہرہ میں جا آباد ہوا۔ جی بابا کی ولادت و وفات کے متعلق دیوان میں یہ شعر ملتا ہے ؎

ولادت — دو ہزار و سی و دو واز افقِ اوج کمال
تا شب سرور دین کرد از یں دار طلوع

یعنی ۱۰۳۲ھ مطابق ۱۶۲۳ء عہد نور الدین جہانگیر (۱۶۰۵ — ۱۶۲۷ء) کا زمانہ تھا۔

وفات — یک ہزار و صد و سی بود و دو بالا نشش
کہ وصالش شد بجو تو زہے دعا لفظ غفور

یعنے ۱۱۳۲ھ مطابق ۱۷۲۰ء اور یہ محمد شاہ رنگیلے (۱۷۱۹ء – ۱۷۴۸ء) کا عہد تھا گویا کہ آپ نے سات مغل فرمانرواؤں کا زمانہ پایا۔ مرشد کی وفات کے بعد شاکر اندازاً پچاس برس تک اٹک ہی میں مقیم رہا اور پھر نوشہرہ (سابق صوبہ سرحد) چلا گیا۔ شاکر ۱۷۷۲ء تک یقیناً بقید حیات تھا۔ شاکر فارسی اور اردو کا شاعر تھا۔ دیوان میں اردو کی صرف تین غزلیں ہیں۔ نمونہ کلام اردو یہ ہے ؎

جانی! تمن کی صورت اندر جہان نہ ہوگی — بایں جمال و خوبی کوئی دلستان نہ ہوگی
تیری نگہ گرم لتیں آتش کو عرق آوے — بے شک کہ تجھ سی صورت در انس و جان نہ ہوگی
جانی تیرے درس کوں بسمل ہوا ہے شاکر — زود آ، وگرنہ تن میں یہ ذرہ جان نہ ہوگی

اس تفصیل سے غرض یہ ثابت کرنا تھا کہ اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ – ۱۷۰۷ء) اور اس سے پہلے بادشاہوں کے عہد میں دھنی میں اردو زبان معیاری زبان بن چکی تھی اور ایسے پڑھے لکھے لوگ کافی تعداد میں موجود تھے جو اس زبان کو سمجھتے، لکھتے، پڑھتے اور شعر و شاعری کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔

اس پس منظر میں جب بادشاہ مراد کا درج ذیل کلام پڑھیں گے تو آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ میرا یہ دعوےٰ کہ شاہ مراد اردو غزل کا بانی اور موسس ہے کس قدر حقیقت پر مبنی ہے ؎

در وصف حسنت اے پیا کیا دخل ہے گفتار کا
یا تو دیا ہیں نور کا یا چاند ہے سنسار ہے
ہر بات تیری ہے شکر یا شہد شیریں ہے مگر
یا در مکنون یا گوہر یا پھول ہے گلزار کا
رفتار گر دیکھوں صنم حیراں بمانم دلبرم
تو مست ہاتھی شاہ کا یا کبک ہے کوہسار کا

اورنگ زیب عالمگیر نے مذہبی تعلیم و تبلیغ کو عام کرنے کے لئے جب علاقائی زبانوں کی سرپرستی شروع کر دی تو پھر رعیت خود بخود اسی طریقے پر چل نکلی چنانچہ اس شاہی حوصلہ افزائی سے مذہبی کاروبار کی رونق دوبالا ہو گئی مذہبی کتابوں کے ترجموں اور تالیف و تصنیف کے سلسلے میں بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا گیا پنجابی اور دوسری علاقائی زبانوں کی طرح [illegible] کے عہد سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا
[illegible]

اگرچہ کہ منقطع نہ ہوا کیوں کہ مولوی خان ملک (۱۷۹۳ - ۱۸۷۸ء) کے لیکچر نوٹس ان کے ایک پٹھان شاگرد مسمی نورخان نے "قانونچہ کھیوالی" کے نام سے شائع کر رکھے ہیں۔ یہ کتاب عربی صرف و نحو پر اردو زبان میں ایک مستند تصنیف شمار ہوتی ہے۔

ضرورت زمانہ کے مطابق یہاں کے تخلیقی صلاحیتوں کے مالک اذہان پنجابی کی آبیاری میں مصروف ہو گئے اور ملک سیلو نے پنجابی نظم میں مرزا صاحبان کا قصہ لکھا شاہ شرف، شاہ چراغ وغیرہ نے بھی پنجابی میں دوہڑے اور کافیاں وغیرہ لکھیں ان کا تفصیلی تذکرہ "پنجابی ادب" کی فصل میں کیا جائے گا۔ لیکن زمانے نے جلد کروٹ بدلی اور اس صدی کے آغاز میں جب اس علاقے میں بھی جدید تعلیم کا چرچا ہوا اور یہاں کے نوجوان جو اس سے پہلے صرف دینی مدارس اور مکاتب میں تعلیم حاصل کرتے تھے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پہنچے تو اردو علم و ادب کی جوت پھر سے جاگ اٹھی۔

جناب صدیق ساجد علوی ایم اے، بی ٹی کی تحقیق کے مطابق چکوال میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے قیام (۱۹۲۲ - ۱۹۲۶ء) کے دوران مقامی گورنمنٹ ہائی سکول میں ادبی مجلس کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس وقت ڈاکٹر برق کے زیر تعلیم نوجوانوں کی ایسی کھیپ تیار ہوئی جس نے کہ اردو ادب کی آبیاری میں قابل فخر کارنامے انجام دیئے ان میں ڈاکٹر غلام سرور، ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی اور کرنل محمد خان نسیم خاص اہمیت کے مالک ہیں۔

علاقہ دھنی میں اردو ادب کے ارتقا کو فارسی ادب کی طرح ہم تین دوروں ہی میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یعنے دور قدیم جس کے ممتاز فرد باوا شاہ مراد ہیں دور متوسط جس کے سرگروہ ڈاکٹر برق ہیں اور دور جدید جس کے رہنما بسمل ہیں۔

(۱) دور قدیم

اس دور میں صرف دو شاعروں کا پتہ چلتا ہے اول تو باوا شاہ مراد خود اور دوسرے ان کے ایک عقیدتمند عزت رائے خانپوری حضرت شاہ مراد کے تفصیلی حالات حصہ فارسی میں دے دیئے ہیں باوا صاحب کے اردو کلام کا تین مدارج میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ پہلے درجے میں ایک مصرع فارسی میں اور دوسرا اردو میں ہے مثلاً ؂

برگشت زمن یار چہ کردا ست خدایا
پھر پھر گیا میں تھیں کوئی اسباب نہ پایا

از کعبہ چو باز آمدہ آوردہ زیارا
جو گنگ پھر آیا ہے کیا کفر سوایا
آخامہ شکن شاہ مرادا ز نوشتن
کیا لکھنا کیا پڑھنا اینویں جنم گوایا

دوسرے درجے میں آدھا مصرع فارسی اور آدھا اردو میں ہے جیسے ؎

در وصف حضرت اے پیا کیا دخل ہے گفتار کا
یا تو دیا ہیں نور کا یا چاند ہیں سنسار کا
رفتار کر دیکھوں صنم حیراں بمانم دمبدم
تو مست ہاتھی شاہ کا یا کبک ہے کوہسار کا
مومن جو دیکھے ابروت محراب کر سجدہ کرے
ھندو جو دیکھے زلف تو رشتہ کرے زنار کا

اور تیسرے مرحلے میں بالکل صاف اردو آجاتی ہے جیسے ؎

اگر ہے شوق ملنے کا آپس کی رمز پاتا جا
فنا کر خود نمائی کو بھسم لے کر لگاتا جا
شراب بیخودی سے مست ہو ہر آن اور ہر دم
نشہ وحدت میں سرخوش ہو کے کثرت کو بھلاتا جا
اگر عرفان ہے تجھ کو نہ بندہ ہو خدا ہو رہو
نہیں تاں پھر کے گلیوں میں گدائی کر کے کھاتا جا

مزید مثالوں کے لئے راقم کا مرتب کردہ "کلام شاہ مراد خانپوری" ملاحظہ ہو۔

رائے زادہ عزت رائے بھی خانپور ہی کا رہنے والا تھا۔ اور باوا صاحب کا عقیدتمند اور ان کی خدمت میں حاضر رہنے والوں میں سے ایک ہے۔ اگرچہ اس کی اولاد آج تک خانپور میں موجود ہے۔ لیکن مزید حالات پتہ نہیں چل سکے۔ لیگو میر نامہ فارسی صـ ۲۱۹ سے پتہ چلتا ہے کہ رائے زادہ مذکور سلطان مقرب خان (اکرم خان) گکھڑ (۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء) کا بھی ہمعصر تھا۔ جس نے دھن کوٹ کے چوہدریوں پر حملہ کر کے انہیں تباہ و برباد کیا تھا۔ رائے زادہ عزت رائے کی ایک اور تصنیف "وار" بزبان پنجابی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ لیکن تاحال اس کا کوئی نمونہ حاصل نہیں ہو سکا

اردو کلام کا نمونہ یہ چند اشعار منقول از گلزار شاہ مراد درج ذیل ہیں ؎

سنو حقیقت میرے سجن کی نقاب مکھ سے جو کس پڑے گا۔
چھپے گا سورج پہاڑ پیچھے تمام عالم میں غل پڑے گا!
دکھے گا نرگس ہووے گا حیران گلاب پر خون ہووے دکھن سے
جو سرو بے خود دیکھے گی قمری تو تیر آنکھوں سے ڈل پڑیگا
میرے سجن کا غلام ہوا ہے چاند ماتھے ہیں داغ دے کر!
اگر سنیگی مرے گی روئے شمع کی آنکھوں میں لگ پڑے گا!
کمال صورت حسن کی خوبی سنے زلیخا تو ہوئے بردی!
ہزار خوباں مثال یوسف گلی کی مٹی میں رل پڑے گا!
تمام عالم کھڑا ہے در پر مراد حاصل ہووے گی تجھ سے!
نظر کرم کی کرو گے مجھ پر تو لاکھ عزت کا گل پڑے گا!

دور متوسط

اس دور کے میر کارواں ڈاکٹر برق ہیں۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر عرفانی۔ ڈاکٹر غلام سرور، کرنل محمد خان نسیم بطور طالب علم شاعر اور میجر الہ داد اور میجر عابد حسین دریا مالی بطور طالب علم مقالہ خواں نمایاں نظر آتے ہیں۔

نام:- غلام جیلانی ڈاکٹر | آپ چار سال ۲۷ مئی ۱۹۲۲ء تا ۲ مئی ۱۹۲۶ء

تخلص :- برقؔ

تعلیم :- ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

مولد :- بسال (ضلع کیمبل پور)

مسکن :- حال کیمبل پور شہر

تاریخ پیدائش :- ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۱ء

تک بطور مدرس علوم شرقی چکوال میں تعینات رہ چکے ہیں۔ اور اپنے اس قیام کے دوران آپ نے اردو علم و ادب کی جوت جگانے میں بھرپور حصہ لیا۔ اور آپ کے فیضِ تربیت سے علاقہ چکوال میں شعر و شاعری کا چسکا طلبائے گورنمنٹ ہائی سکول میں پیدا ہو گیا۔ آپ ہی نے اس سکول میں ایک بزم ادب کی داغ بیل ڈالی۔ جس میں مذکورہ بالا حضرات بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔

اس دور میں آپ کو انگریزی کی نظموں کو شاعرانہ نثر میں تبدیل کرنے کا شوق رہا۔ اور بقول خود آپ کے جب تک وہ چکوال میں رہے۔ اس وہم میں گرفتار رہے۔ کہ وہ شاعر بن سکتے ہیں۔ ان دنوں لاہور سے ایک مجلہ (قوس قزح) نکلتا تھا۔ جو ان کا ہر رطب و یابس چھاپ دیتا تھا۔ اس دور (جسے وہ خود بے علمی اور جہالت کا دور کہتے ہیں) کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ایک آرزو (مثلث)

دل سے مجھے یارب بیگانہ بنایا ہوتا — مجھ کو سنگ درِ جانانہ بنایا ہوتا
پھر یہ ایسا جو بنایا نہ بنایا ہوتا!

خاک سے تو نے الٰہی جو بنایا مجھ کو! — میری فطرت کو فقیرانہ بنایا ہوتا
قیصر عالم میرا کاشانہ بنایا ہوتا

دستِ گستاخ خرد اور گریباں میرا — یہی بہتر تھا نہ فرزانہ بنایا ہوتا؛
اپنے صحراؤں کا دیوانہ بنایا ہوتا؛

چند اور منتخب اشعار

میری نگاہ و رسالے جمیل افسانے — خزاں سے پوچھئے تنہا بہار کیا جانے
جبیں پہ چاندرہ قبا میں بھرا جنوں میں جنوں — تم اس لباس میں آؤ تو کون پہچانے
نہ دام ہے نہ قفس ہے نہ خطرہ گلچیں — تیرے چمن سے تو بہتر ہیں میرے ویرانے

محمد خان کرنل

نام :- محمد خان کرنل
تخلص :- نسیم
تعلیم :- ایم ۔ اے
مولد :- بلکسر تحصیل چکوال
سالِ پیدائش :- ۱۹۱۴ء

آپ مغل کسروں کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ ابتدائی تعلیم چکوال میں اور اعلیٰ تعلیم لاہور میں حاصل کی۔ کچھ عرصہ چکوال میں پڑھاتے رہے اور پھر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اور وہ ابھی تک وہیں کرنل کے عہدے پر فائز ہیں۔ آپ پاکستان آرمی ایجوکیشن کور کے ڈائریکٹر ہیں۔ مارشل لا کے دنوں میں قائم کئے گئے ایجوکیشن کمیشن کے ایک رکن آپ بھی تھے۔ آپ کی اردو نثر بڑی دلکش اور شگفتہ ہوتی ہے۔ جب آپ سے منظوم کلام کے چند منتخب نمونے طلب کئے گئے، تو آپ نے فرمایا۔ کہ میرا شعر و شاعری کا مشغلہ بالکل طفلانہ سا تھا۔ کچھ نظمیں وغیرہ لکھیں۔ جو دوستوں کی محفل میں تو سنائی جا سکتی ہیں۔ لیکن کسی کتاب یا رسالے میں چھپنے کے قابل نہیں۔ کچھ فنی خامیوں کی وجہ سے اور کچھ نفسِ مضمون کے اعتبار سے۔ نثر کبھی کبھی لکھتا ہوں۔ چند مضامین کا مجموعہ "بجنگ آمد" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ کرنل صاحب کی اردو نثر نویسی کا نمونہ یہ ہے۔

"ہم رات بھر جاگتے رہے۔ کوئی تین بجے شام کا عمل تھا۔ کہ اچانک ہمیں سڑک کے کنارے ایک ٹرک دکھائی دیا۔ اس کے قریب اوٹ میں آگ جل رہی تھی۔ جس پر چائے کی کیتلی رکھی ہوئی تھی۔ اور تین چار جوان آگ کے گرد بیٹھے تھے۔ ہم نے گاڑی ٹھہرائی۔ انجن کا شور بند ہوا۔ تو اچانک ماہیے کی ایک سریلی آواز کان میں پڑی ..... " ہنڈیوں آکی لادی۔ میں تینوں موڑ رہی آں پردیس نہ لائیں یاری " جس پردیس اور جس برگیڈ میں ہم تھے۔ اس میں یاری لگانے کے امکانات تو ایسے روشن نہ تھے۔ لیکن ماہیے کی آواز سن کر یوں محسوس ہوا۔ جیسے چکوال آ گئے ہیں۔ اور ساتھ ہی ان جوانوں کی اس بے پناہ حس پر تعجب ہوا۔ جسے انگریزی میں (...) یا حسِ ظرافت کہتے ہیں۔ جہاں دوسرے لوگ جان بچانے کے لئے اندھا دھند بھاگ رہے تھے۔ یہ من چلے پردیس کی یاری کے گیت گا رہے تھے۔ ہمیں رکتا دیکھ کر ایک نوجوان آگے بڑھا۔ اور بولا "صاحب چائے پیو گے؟" ہم رات کے بھوکے پیاسے بھاگ رہے تھے۔ اور پھر اس پیار سے پیش کی ہوئی چائے سے انکار کس کافر کو ہوتا۔ ایک

پیالی پی، تو گویا زندگی عود کر آئی۔ چلتے ہوئے خالص دکھنی کے لہجے میں خدا حافظ کہا۔ تو آواز آئی۔ کہ صاحب تو گرائیں معلوم ہوتا ہے۔ کاش میرے پاس وقت ہوتا۔ کہ ان دو عالم سے بیگانہ بہادروں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں ہوتیں۔"

(ماخوذ از بجنگ آمد)

دورِ جدید

بسمل کے مفصل حالات حصۂ فارسی میں درج

۱۔ **چوہدری ذکاء اللہ بسمل** ہیں۔ آپ چکوال کے دورِ جدید کے اکثر اردو شاعروں کے سرخیل اور استاد ہیں۔ آپ اردو کے پُرگو، کہنہ مشق اور پختہ ذوق شاعروں میں سے ہیں۔ بقول ضمیر جعفری کے آپ کا کلام ٹھوس ہے۔ آپ کے شاگردوں میں اثر چکوالی۔ طالب چکوالی۔ اور غالب چکوالی خاص شہرت کے مالک ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

قطعہ

صد حیف۔ ہم سے منزلِ غم طے نہ ہو سکی
ہم ہاتھ پاؤں مار کے اے زندگی چلے

ساقی یہ چاہتا ہے رہیں وقفِ انتظار
جی چاہتا ہے۔ دورِ صبوحی ابھی چلے

پا کر اشارہ ہو گئی۔ واں مشقِ تیغِ ناز
ہم سوئے قتل گاہ بصد خرمی چلے!

پروانہ ہائے شمع کا ہم جانتے ہیں عشق
جلتی رہی تو جلتے رہے جب بجھی چلے:

ایک نظم **ستم غریب** کے چند اشعار سے

ہو جو ہوتا ہے ستم۔ شکوۂ ستم کا نہ کریں
ہمنشیں ہمتِ مردانہ کو رسوا نہ کریں

دلِ بیمار کو ممنونِ مسیحا نہ کریں
نہ کریں دردِ محبت کا مداوا نہ کریں

مقصدِ عالی دل کے لئے کرتے ہیں سعی
حسرت انگیز نظر سے یونہی دیکھا نہ کریں

دامِ انجام بچھاتی ہے اگر عقل بچھائے!
عشق ملتا ہی ہم انجام کو سوچا نہ کریں

غزل کے چند شعر بھی ملاحظہ ہوں:۔

درد دل بھی ہے۔ دردِ سر بھی ہے — عشق کیا کیجیے چارہ گر بھی ہے۔
زندگی تنگ عشق کے ہاتھوں — زندگی اس پہ منحصر بھی ہے۔
آہ و نالہ کی داستاں ہے دراز — وہ جو سنتے تو مختصر بھی ہے۔
تم بھی کہتے تو ہو غزل بسمل — کیا غزل کہنے کا ہنر بھی ہے۔

۲۔ محمد دین ادیب

(تاریخ پیدائش ۱۹۰۵ء) ادیب صاحب فطرتاً خلوت پسند واقع ہوئے ہیں۔ ہنگاموں سے دور بھاگتے ہیں۔ شاعرانہ دل و دماغ رکھتے ہیں۔ آپ نے نعتیں اور اسلامی نظمیں زیادہ لکھی ہیں۔ غزلیں بہت کم، آپ کی نعتوں میں بلا کا سوز و گداز اور عقب کا گہرا احساس ہے۔ کسی زمانے میں آپ نے "موجِ نور" کے نام سے منتخب نعتوں کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا تھا۔ آپ ایک ماہنامہ "اصلاحِ دیہات" کی ادارت بھی کر چکے ہیں۔ آپ نے "سیر دیہات" ایک ڈرامہ بھی لکھا۔ جس کا مسٹر الیف ایل برین۔ آئی سی ایس بانی دیہات سدھار تحریک کے زمانے میں کافی چرچا تھا۔ گورنمنٹ ہائی سکول چکوال سے بطور مدرس علوم شرقیہ ریٹائر ہونے کے بعد کاروبار کا دھندا شروع کر رکھا ہے۔ آج کل فردوس بک ڈپو کے مالک اور شہر میں اخبارات و رسائل کی ایجنسی کی وجہ سے ایک جانی پہچانی شخصیت ہے۔ نمونہ کلام ؎

احتشام ملت۔ بیضا ہی رخصت ہو گیا — گر پڑی ہاتھوں سے اپنے باب نصرت کی کلید
گر ہو تازہ وہ روایات سلف تو اے ادیب — پھر منا سکتے ہیں ہم اسلامیانِ پاک عید!

تاباں ہے۔ جس کے قطرے میں کون و مکاں کا ہوش!
ہے لاکلام بادۂ پندار مصطفےؐ؟
سب خاکسار ہو گئے دنیا میں سر بلند!!
جب آئے زیر سایۂ دیوار مصطفےؐ
جس جگہ سجدہ ریز ہے فر شہنشہی؟
وہ ہے نیاز خانۂ سرکارِ مصطفےؐ

کر اے ادیب چشمِ بصیرت سے کسبِ نور!
لمعہ فشاں ہے مطلعِ انوارِ مصطفیٰؐ!

منوہر لال طالب چکوالی

پیشہ کے لحاظ سے وکیل، لیکن بڑا معرکے کا شاعر تھا۔ کل ہند مشاعرہ "شمعِ بین الاتفاق" پر بہترین نظم پڑھ کر پہلا انعام حاصل کیا۔

یہ نظم زمانہ کانپور میں چھپ چکی ہے۔ علمی و ادبی مضامین لکھ کر ادبی حلقوں میں خوب نام پیدا کیا۔ طالب ایک متعصب ہندو گھرانے کا فرد تھا۔ لیکن اس کی رندانہ باتیں سن سن کر حیرت ہوتی تھی۔ یسمل کے "پانچ پیاروں" میں سے تھا۔ ان کے ہاں گوشت کھاتا۔ قرآن کی آیات حافظہ سے پڑھتا۔ اور پھر ان کی تشریح و تفسیر اس انداز سے کرنے لگتا۔ جیسے احمد لاہوری مرحوم کا مولوی گمشیر یہی ہے۔ تقسیم ملکی (۱۹۴۷ء) کے بعد بھارت چلا گیا۔ باوجود تلاش بسیار آپ کے کلام کا کوئی نمونہ سوائے ایک قطعہ تاریخ کے دستیاب نہیں ہو سکا۔ یہ قطعہ قصہ ہیر رانجھا از میاں اللہ دتہ ملیار کی طبع اول کے موقعہ پر کہا گیا۔ جسے مقبول کتب خانہ ریلوے روڈ چکوال نے طبع کیا تھا۔ وہ قطعہ یہ ہے ؎

عشق ہے بے نیاز کرم — حسن پر فدا ہزار چشم
قصۂ ہیر کا نہیں آغاز — عشق کی داستاں ختم!
عاشقانِ خطۂ پنجاب! — کی وفا کیوں نہ کھائے قسم:
ہیر کے نام کی عزت! — تھی مقدر میں کس کے رقم!
خاک پاک سے اٹھے! — ہے وفا جن کی خاک قدم
نام سے ان کے ہی غافل! — آج باقی ہے دم میں دم!
ملک اپنا زباں ہے اپنی! — یہ نہیں کوئی داستانِ عجم!
شاندار ہے چھپا واہ واہ! — خوب قصہ ہے خوب جلی قلم
سال طبع کہہ بھی دے طالبؔ! — بے نظیر داستانِ ارم! ۱۹۲۹ء

نام :- **خواجہ محمد بشیر**
تخلص :- اثرؔ
تعلیم :- بی۔ اے
مولد :- میانوالی
مسکن :- چکوال
سال پیدائش :- ۱۹۱۷ء

خواجہ اثر صاحب کے والد خواجہ محمد گلؒ، بسلسلہ سرکاری ملازمت میانوالی میں تعینات تھے۔ جب کہ آپ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میانوالی، چکوال اور سرگودھا میں حاصل کی۔ ابتدا ہی سے آپ کو اردو سے خاص لگاؤ تھا۔ اور شاید یہ اسی لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ کہ جب آپ آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ تو مضمون نگاری شروع کر دی۔ اور آپ کے مضامین پھول، گلدستہ لاہور اور "نونہال" دہلی میں مسلسل طور پر شائع ہوتے رہے ر ایک سال "پھول لاہور" میں سب سے زیادہ مضامین لکھنے پر آپ کو اوّل انعام بھی ملا۔ ۱۹۳۲ء میں پہلے پہل شعر کہنا شروع کئے۔ آپ اس وقت دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ آپ کی سب سے پہلی کوشش ایک نثر کی کہانی کو نظم کرنا تھا۔ اس کے بعد چند چھوٹی چھوٹی قومی اور تعلیمی نظمیں کہیں۔

۱۹۳۴ء کے وسط میں گارڈن کالج راولپنڈی میں ایف اے میں داخلہ لیا۔ تو اسی زمانے میں سید عبدالحمید عدمؔ اور عبدالعزیز فطرت مرحوم سے تعارف حاصل ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں بی اے کرنے کی غرض سے لاہور آ گئے۔ تو یہاں علامہ تاجور نجیب آبادی، اختر شیرانی اور سید عابد علی عابدؔ کے مشوروں سے مستفید ہوتے رہے۔ بی اے فائنل میں کالج میگزین کے حصہ اردو کے ایڈیٹر رہے۔ نگران سید عابد علی عابدؔ تھے۔

بی اے کے بعد تقریباً دو سال راولپنڈی میں گزارے۔ فراغت کے دن تھے۔ خوب مشاعرے پڑھے۔ ۱۹۴۹ء میں سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے۔ لیکن ۱۹۵۲ء میں اس سلسلہ کو ترک کر دیا۔ آج کل کوہ نور انڈسٹری لمیٹیڈ سے منسلک ہیں۔ خواجہ اثر، میرغالب اور اقبال کی شاعری سے ایک حد تک متاثر ہیں۔ آپ کا کلام اردو کے تقریباً سبھی ممتاز جرائد میں چھپتا رہا ہے۔ بیشتر کلام اثر چکوالی کے نام سے چھپا ہے۔ لیکن بشیر اثر کے نام سے بھی شائع ہوا ہے۔ نظم اور غزل دونوں میں یکساں قدرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ نمونہ کلام سے

انتخاب از مومن

مومن ہے مہ و مہر کی تفسیر جہاں تاب
مومن سے عبارت ہیں دلِ عشق کے آداب

مومن نہیں زندانیٔ تقلید و غلامی
مومن کی حیات ایک تغیر کی پیامی!

شمشیر کی مانند ہے مومن کی خودی تیز
مومن کی نوائیں ہیں جنوں ریز و سحر خیز

پوشیدہ نہیں اس سے کوئی رازِ جہاں کا
کچھ دخل نہیں اس کی شریعت میں گماں کا!

عِشق

مہ و ستارہ کی تسخیرِ جاوداں ہے عشق
جگر کے خون سے پہنچی ہوئی اذاں ہے عشق

اسی کے نور سے روشن ہیں امتوں کے چراغ
نگاہِ قلبِ محمد سے ضو فشاں ہے عشق

غزل کے چند اشعار :-

احوالِ محبت کے ان سے جب دل کی زبانی کہتا ہوں ۔
جذبات کے رنگیں طوفاں میں تنکے کی صورت بہتا ہوں :

تم مجھ کو درد و غم بخشو، تم تازہ نہ دل کے زخم کرو !
یہ تم سے کہا تھا کب میں نے، یہ تم سے کب میں کہتا ہوں!

کہتے ہیں محبت میں لازم ہے، ضبط کی شرح روح گسل !
وہ مجھ کو دیکھتے رہتے ہیں میں ان کو دیکھتا رہتا ہوں!

محسوس یہ ہوتا ہے دل کو ہنسنے کا زمانہ بیت گیا !
جس وقت بھی دیکھو مجھ کو اشک اشکوں میں ڈوبا رہتا ہوں!

نام :- **محمد غالب**
تخلص :- اشک صحرائی
تعلیم :- بی۔ اے
مولد :- چکوال

اشک صحرائی ایک خوش مذاق شاعر ہے ۱۹۳۲ء میں جب پہلی بار ایک ادبی انجمن "بزم ادب چکوال" کے نام سے عالم وجود میں آئی۔ تو اس وقت یہ اس

مسکن :- حال راولپنڈی
سال پیدائش :- ۱۹۱۰ء

کے نوجوان و سرگرم رکن تھے۔ ۱۹۳۵ء میں جب طالب چکوالی وکالت چھوڑ کر کاروبار کے سلسلے میں راولپنڈی چلے گئے۔ تو چکوال کی ادبی سرگرمیوں میں تعطل نہ پیدا ہونے دینے کا سہرا اشک ہی کے سر ہے۔ آپ نے بزم ادب کی نظامت کو سنبھالا۔ اور یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک چلتا رہا۔ اور اس بزم کے جلسوں کی کارروائی اخبارات میں شائع کرواتے اور مشاعروں میں پڑھتے۔ غزلیات کو روزنامہ احسان لاہور کے ہفتہ وار ایڈیشن میں بڑے اہتمام سے شائع کروایا کرتے تھے۔ آپ لاہور کے رسالہ حقیقتِ اسلام، اور ہفتہ وار "افکار" میں بھی کام کرتے رہے۔ ڈاکٹر اقبال کے خاص عقیدتمندوں میں سے ہیں، اور آپ کو ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پاس ان کی زندگی میں جاکر ان کی زیارت کا بار ہا موقع ملا۔ اسی صحبت کا یہ اثر تھا کہ اشک نے ولولہ انگیز قومی نظمیں، مذہبی روایات میں ڈوب کر لکھی ہیں۔ آپ کے کلام میں مرزا غالبؔ دہلوی کا رنگ جھلکتا ہے۔ آج کل ملٹری اکاؤنٹس آفس راولپنڈی میں سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ کلام مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ نمونۂ کلام ؎

انتخاب از مسلمان بچوں کا گیت

مسلماں ہوں دنیا کی تقدیر ہوں میں ؛ علیؑ کل غالب کی تفسیر ہوں میں
نہاں شعلۂ طور ہے میرے دل میں ؛ جمالِ محمدؐ کی تنویر ہوں میں !
میرے واسطے کچھ بھی مشکل نہیں ہے ؛ دلاور ہوں مردِ جہانگیر ہوں میں
میرا نغمہ ہے نغمۂ ساز فطرت ؛ میں دنیائے فانی میں ہوں رازِ فطرت

غزل کے چند اشعار

ہجوم جوش وحشت باعثِ تشہیر ہوتا ہے ؛ یہ خواب زندگی منت کشِ تعبیر ہوتا ہے :
سوائے حسرت حاصل نہیں کچھ حاصل الفت ؛ عبث ناکامیوں میں شکوۂ تقدیر ہوتا ہے !

عشق نے وا کر دیئے مجھ پر رموز کائنات ؛ جو ملا اس راہ میں وہ عاقل و فرزانہ تھا،
یہ بھی ہے اک خامیٔ تکمیل ذوق آدمی ! ؛ ورنہ کس کو امتیاز کعبہ و بت خانہ تھا،
اب تو اکثر اشک وہ دن یاد آتے ہیں مجھے ؛ جبکہ حاصل مجھ کو قرب محفل جانانہ تھا !

انور علی تجلیؔ

بخشی صاحب اگرچہ فارسی کے استاد ہیں۔ لیکن اردو میں چند اعلیٰ پایہ کی غزلیں کہہ رکھی ہیں۔

آپ کا کلام "چاند کرن" میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کے مطالعہ سے جس ذوقِ سلیم، فنی پختگی اور منجھے ہوئے اندازِ بیان کا ثبوت ملتا ہے، وہ یقیناً اہلِ ذوق حضرات سے خراجِ تحسین حاصل کرے گا۔ آپ بھی اشک چکوالی کی طرح ڈاکٹر اقبال مرحوم کے عقیدتمندوں میں سے ہیں ادبی لحاظ سے آپ کا عقیدہ ہے۔ کہ مستقبل کے شعراء کو نظم نگاری پر زیادہ توجہ صرف کرنی چاہیے۔ کیونکہ ان کے خیال میں غزل کی نسبت نظم شاعر کی شخصیت و انفرادیت کی بہتر نمائندگی کرتی ہے۔ نمونہ کلام سے

غزل کے چند اشعار۔

اک ترا غم نہ ہو تو جانبِ دل   کتنے غم التفات کرتے ہیں
یوں جدائی کی رات کٹتی ہے   رات بھر تجھ سے بات کرتے ہیں۔

"انتخاب از آخرِ شب"؛

آخرِ شب کے ہراساں لمحات
ڈرتے ہیں فاش نہ ہو جائے کہیں
سینۂ وقت میں ہے راز کی بات

سوچ میں چاند ستارے گم ہیں۔
جانے کس راز کو سلجھاتے ہیں!
خود فراموش نظارے گم ہیں!

قاضی نواب علی

نام :۔
تخلص :۔ قلم
مولد :۔ چکوال
مدفن :۔ چکوال

چکوال کے قاضی گھرانے کے فرد تھے، کسی زمانہ میں روزنامہ شیر رنگون کے عملہ ادارت میں شامل تھے۔ انہیں علامہ عیش امروہی کا تلمذ حاصل تھا عمدہ رواں دواں شعر کہتے تھے۔ عشقیہ شاعری

سالِ وفات :- ۱۹۵۷ء

آپ کا خاص موضوع ہے۔ اختر شیرانی اور عدم سے کافی متاثر تھے۔ آپ کی ایک رومانی نظم "ایک بار آئی تھی" بہت مشہور اور زبانِ زدِ خاص و عام رہ چکی ہے۔ لیکن افسوس کہ اب دستیاب نہیں ہو سکی۔ نظم کے متعلق ایک خاص بات یہ بتائی جاتی ہے۔ کہ جب آپ شعر پڑھتے تھے۔ تو آپ پر ایک ایسی حالت طاری ہو جاتی تھی۔ گویا آپ کے انگ انگ سے وہ کیفیت ٹپک رہی ہے۔ جو شعر میں سموئی ہوئی ہے۔ کور ذوق وارثوں کی وجہ سے آپ کا کلام غالباً ضائع ہو گیا ہے۔ بعد از تلاشِ بسیار ایک غزل اور قطعہ ملا ہے۔ ملاحظہ ہو!

قطعہ

میکدے بند ہو گئے جب سے — لوگ کہتے ہیں کیسے پیتا ہوں!
ان کی آنکھوں میں ڈال کر آنکھیں — ان کی آنکھوں سے روز پیتا ہوں

غزل

نہ ولولے نہ عیش کا ساماں تیرے بغیر — دنیائے دل ہوئی ہی ویراں تیرے بغیر
کوہ بن ہیں اداس و پریشاں تیرے بغیر — آکاش بھی ہے سر بگریباں تیرے بغیر
شیرازہ حیات پریشاں تیرے بغیر! — ہر چیز ہے اداس میری جاں تیرے بغیر
دل غمزدہ و زندگی ویراں تیرے بغیر — ہر ذرہ کائنات کا حیراں تیرے بغیر

مدھم سی پڑ گئی ہے نظم نبضِ کائنات!
رک سی گئی ہے گردشِ دوراں تیرے بغیر

نام :- چوہدری محمد خان
تخلص :- محمد خان
مولد و مدفن :- جبیر پور

ہوشیار پور میں ایک حادثہ کا شکار ہو گئے۔ آپ اپنا پورا نام بطور تخلص استعمال کرتے تھے۔ آپ کا صرف ایک ہی شعر مل سکا ہے۔

سبھی گے کام میرے بے سبب کیوں محمد خان:
گدائے کوئے شہنشاہ دوسرا ہوں میں!

لالہ ہرکرنداس

نام :۔ لالہ ہرکرنداس
تخلص :۔ ہرکرن
مولد :۔ سدوال

لالہ صاحب علاقہ بلوچستان میں محکمہ پولیس کے سارجنٹ درجہ اوّل تھے۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں سے بیلہ بساکھی، تحفہ ہرکرن، تبدیل خیال اور تاریخ خاندان کپور سدوال خاص شہرت کی مالک ہیں۔ آخر الذکر کتاب ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ نمونہ کلام سے

انتخاب از "پرارتھنا بدرگاہ ایشور مہاراج"

تیرا نام ہے۔ رب عالی وقار ... تیری قدرتوں کا نہیں ہے شمار
اک ادنیٰ سی قدرت تیری آشکار ... کہ ہے سنگ کی جوف میں جاندار
ہے زیبا تجھے اکبری سروری! ... میری بار کیوں دیر اتنی کری!

فضل الرحمٰن صدیقی

نام :۔ فضل الرحمٰن صدیقی
تخلص :۔ نعیم
مولد :۔ خانپور
مسکن :۔ حال لاہور

مولانا نعیم صدیقی جماعت اسلامی کے ایک قائد کی حیثیت سے ایک معروف شخصیت ہے۔ آپ بادشاہ مراد کے خاندان سے اور مولوی سراج الدین مرحوم کے فرزند ہیں۔ آپ ادیب، شاعر، صحافی اور مفکر ہیں۔ آپ ایک قادر الکلام شاعر اور مذہبی روایات میں ڈوب کر لکھنے والے ادیب ہیں۔ آپ متعدد تصانیف، نظم و نثر کے مالک ہیں۔ تقریباً تمام اصناف سخن میں داد سخن دے رکھی ہے۔ نمونہ کلام سے

قطعہ

سیاست کچھ نہیں غیر یزیدی ... علم باطل کا اونچا ہو رہا ہے
نہیں تجھ میں لہو ابن علی کا! ... وگرنہ یہ زمانہ کربلا ہے!!

رباعی

میں حال کارواں سے باخبر ہوں! ... جگر کے سوز سے روشن بصر ہوں
ہواؤں کو سکھا شکستہ خرامی! ... الٰہی میں چراغ رہ گزر ہوں!

انتخاب از "نغمہ نو"

بنا رہے ہیں فرشتے اک آفتاب نیا
کہ خاکیوں میں نمایاں ہوا اضطراب نیا

تو اپنے دورۂ شام و سحر کو تازہ کر
جو میکدے میں ہوا دورۂ شراب نیا

نہ عیش نغمہ ہستی نہ غم ترانۂ زیست
خودی کا نغمہ سنا۔ اب اٹھا رباب نیا

دبی ہے خاک سے شعلوں کی سرکشی اکثر
نہ بولہب ہے نیا اور نہ بوتراب نیا!

خواجہ شفیع جاوید

نام :- خواجہ شفیع جاوید
مولد :- چکوال
مسکن : کراچی

خواجہ صحافی اور شاعر ہیں۔ کراچی سے اپنی زیر ادارت ایک ماہنامہ "گلفروش" نکالتے ہیں۔ بالعموم نظم معریٰ لکھتے ہیں۔ اور یہ جانتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ مغرب و مشرق میں جن شعرائے کرام نے اس صنعت شعر کو اپنایا ہے۔ وہ بھی اس سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔ آپ کی غزلوں میں ہندی کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ نمونہ کلام سے

سسکتا تبسم :

مزاج دوست کی دیرانیوں کا غم ہی نہیں
مری تو اس کی ہنسی پر بھی چشم پُرنم ہے۔
وہ ایک سسکتا تبسم جو چیخ بن جائے۔
ہنسی ہنسی میں یہ انسانیت کا ماتم ہے
دراز پلکوں کے سائے میں دلکشی کا ندیم
تری جوانی کی رفعت نے جان دے ڈالی
اڑی اڑی سی یہ رنگت کی نرگسیت نے
نچوڑی ہے گلوں سے شباب کی لالی'
رخ حیات کی بے رونقی سے گھبرا کر:
دل و دماغ نے طوائفیت کو اپنایا!
اجڑ کے پھر جو بسے گی، تو بس یہی جائیگی
ہزار بار زمانے نے اس کو دوہرایا

محمد صدیق علوی

نام :- محمد صدیق علوی
تخلص :- صاحب
تعلیم :- بی اے بی ٹی

علوی صاحب شاعر ادیب اور اُستاد ہیں۔ بڑا سلجھا ہوا مذاق شعر رکھتے ہیں۔ عموماً غزلیں کہتے ہیں۔ جن میں درد، کسک اور طنز لطیف کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے

مولد :- چکوال
مسکن :- حال راولپنڈی

آپ کی نظم "نذر شاہ مراد" خاصے کی چیز ہے۔ دھنی کے لوک گیتوں پر آپ نے ایک کتاب "من دی موج" بھی زیور طبع سے آراستہ کر رکھی ہے۔

آپ کا کلام "مشک نافہ" کے نام سے مرتب ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام :-

غزل

پھر فریب نظر کی بات چلی — رنگ حسن سحر کی بات چلی
یاد آیا چلن زمانے کا — ابروئے فتنہ گر کی بات چلی!
آ گئے دو جہاں ہونٹوں پہ — جب بھی ان کی نظر کی بات چلی!
قافلے یوں ٹھٹک گئے جیسے! — پھر کسی راہبر کی بات چلی
کچھ کمی تھی مگر فسانے ہیں! — پھر غم بیشتر کی بات چلی
پہروں خاموش رہتا ہے ساجد — پھر اسی بے خبر کی بات چلی۔

انتخاب از "نذر شاہ مراد"

فقیر مست شراب طہور شاہ مراد" — تمام عشق و محبت کا نور شاہ مراد"
تو شہر یار تصوف تو ناخدائے سخن! — رواں ہے سکہ ترا دور دور شاہ مراد"
جہان عشق و محبت میں بامراد ہوئے! — جو لوگ پہنچے ہیں تیرے حضور شاہ مراد"

غلام شاہ مدینہ جو ذات ہے تیری!
جہاں تو کیا ہے؟ کہ سب کائنات ہے تیری

نام :- افتخار حسین مخدومی
تخلص :- صفدر
تعلیم :- ایم اے
مولد و مدفن :- بھوت
سال پیدائش :- ۱۹۲۱ء

صفدر مخدومی شاعر سے زیادہ صحافی تھا۔ لیکن سخن فہمی کا جتنا شستہ مذاق قدرت نے اس شعلہ مستعجل کو عطا کیا تھا۔ اس عمر میں بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ بلا کا حافظہ پایا تھا۔ اچھا شعر جب ایک دفعہ سن

لیتا۔ تو پھر ہمیشہ کے لئے یادر کھتے افسوس کہ مجلسِ احرار کے آرگن روزنامہ آزاد لاہور کو اپنے خونِ جگر سے پروان چڑھاتے چڑھاتے بڑی خوبیوں اور صلاحیتوں کا مالک یہ نوجوان عین عالم شباب میں ہی داغِ مفارقت دے گیا۔ غزل میں رچے ہوئے اندازِ بیان کا مالک تھا جوش و جذبہ کو وارفتگی کی حد تک پہنچا سکتا اس کا خاص اور بے تکلفانہ انداز تھا۔ نمونہ کلام سے

غزل کے چند اشعار

اٹھتے ہیں نئے فتنے مخمور نگاہوں سے : !
وحشت کو پیام آئے بھولی ہوئی راہوں سے !
دیکھنے کا نہیں صاحب طوفانِ جوانی ہے !
غدار نقابوں سے مجبور حیاؤں سے : !
آئینِ وفا کیا ہے، آنکھیں تو اٹھا پوچھ !
اس سینۂ لرزاں سے پھیلی ہوئی باہوں سے !
اپنا بھی ہے نام اب تو عشاق کے دفتر میں !
ساقی کی نوازش سے مستوں کی دعاؤں سے !
سادہ سی محبت کا سادہ ہے بیان صفدرؔ !
کیا مجھ کو بھلا نسبت رنگین نواؤں سے : !!

نام :- سید افتخار حسین

تخلص :- ناطق

تعلیم :- ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)

مولد :- گوالیار

مسکن :- چکوال

سال پیدائش :- ۱۹۲۲ء

سید صاحب ایک ممتاز گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ والد محترم سید عاشق حسین گوالیار کے نامور وکلاء میں سے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان میں آ گئے۔ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران اردو کے ممتاز شعراء جان نثار اختر اور مجاز مرحوم کی ہمعصرانہ شناسائی سے شعر و سخن کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوئے۔ اور بھارت کے کثیر الاشاعت ماہنامہ

ثاقی دہلی" وغیرہ میں آپ کا کلام چھپتا رہا ہے۔ پاکستان آکر پہلے کراچی اور لاہور میں سرکار سے ملازمت سے وابستہ رہے۔ لیکن یہ پابندی راس نہ آئی۔ ملازمت ترک کرکے پریکٹس شروع کردی: اسی اثناء میں پھرتے پھراتے چکوال آ گئے۔ اور یہاں کی خاک کچھ ایسی دامنگیر ہوئی کہ بس یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ اب ضلع جہلم کے چوٹی کے وکلاء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کی ہمت قابلِ داد ہے۔ کہ اپنے پیشے کی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ذوقِ شعر و سخن کی تسکین کے لئے وقت نکال لیتے ہیں بڑے سلجھے اور منجھے ہوئے شاعر ہیں۔ غزل یا نظم جو کچھ بھی لکھیں رکھ رکھاؤ اور سلیقے سے لکھتے ہیں نام و نمود سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ اس لئے کلام کبھی کبھار رسائل و جرائد کی زینت بنتا ہے ورنہ بالعموم اس کی گونج نجی صحبتوں تک ہی محدود رہتی ہے۔ ان کی ہندی آمیز اردو غزلیں اور قطعات خاصے کی چیزیں ہیں۔ سوز و گداز اور فصاحت و بلاغت ان کے کلام کو خاص دلکشی اور رعنائی عطا کرتے ہیں۔ سادہ طبیعت، یار پرور اور ملنسار آدمی ہیں۔ ستائش کی تمنا سے بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی سامع ان کے شعروں پر زیادہ داد دینے لگے، تو آپ اکتانے لگتے ہیں۔ آپ کا چیدہ چیدہ کلام "چاندکرن" اور "سبزۂ بیگانہ" میں چھپ چکا ہے۔ آپ "رباعیات قدسی" کے مرتب بھی ہیں۔ آج کل بزمِ ثقافت چکوال کے صدر ہیں نمونہ کلام بہ:

غزل کے چند اشعار

میں اور جنوں کا نام نہ لوں لالہ زار میں — ایسا کبھی قصور نہ ہوگا بہار میں
یوں ہے تمہاری یاد دلِ داغدار میں — جیسے ہو ایک پھول کسی خار زار میں
مجبوریٔ حیات کا عالم تو دیکھئے! — دل اختیار میں نہ زباں اختیار میں
جلتا ہے کون وقت کے صحرا کی دھوپ میں — ناطق چلے ہیں سایۂ گیسوئے یار میں!

رہنے دو تکلیف تبسم دل کو ہیں آزار بہت — پھولوں سے کیا جی بہلائیں پھولوں سے ہیں خار بہت

تم تو ناحق بھاگ رہے ہو، دور ہمارے سائے سے:
ہم نے تو تصویر تمہاری پوجی ہے سرکار بہت!

دل کا سودا کرنے والے! سوچ سمجھ کر سودا کر!!

اس نگری کے رہنے والے کرتے ہیں بیوپار بہت ! !!

یوں تو غزلیں، نظمیں کہنا اتنا مشکل کام نہیں۔

شہر سخن میں لیکن دیکھے شاعر کم فنکار بہت

نام :- **محمد رفیق ہاشمی**

تخلص :- جمیل

مولد :- کھنوال تحصیل چکوال

مسکن :- چکوال

سال پیدائش :- ۱۹۲۹ء

ہاشمی صاحب نے میٹرک کے بعد گارڈن کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن خرابی صحت کے باعث تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ شاعری کا ملکہ فطری ہے۔ بچپن سے شعر لکھ رہے ہیں، غزل اچھی کہہ لیتے ہیں۔ آج کل کوہستان راولپنڈی اور پاکستان ٹائمز راولپنڈی کے مقامی نامہ نگار ہیں۔ آپ کا منتخب کلام "چاند کرن" اور "سبزۂ بیگانہ" میں چھپ چکا ہے۔ نمونہ کلام ؎

غزل کے چند اشعار

خوابوں کو آگ لگ گئی۔ تعبیر جل گئی
لمحات کے الاؤ میں تصویر جل گئی۔

بام و در امید پہ رقصاں ہیں درد و غم
اک زندگی کی حسرت تعمیر جل گئی!

جبریل آرزو کے پر و بال کیا جلے!
سدرہ نشین شوق کی تقدیر جل گئی

حیراں ہوں جمیلؔ تمنا کے باب میں
کیوں کر نہ لوح کاتب تقدیر جل گئی

نام :- **خان بیگ**

قلمی نام :- شورش ملک

مولد :- بھون

مسکن :- حال راولپنڈی

سال پیدائش :- ۱۹۳۱ء

روزنامہ "جنگ" کے نیوز ایڈیٹر ہیں ساتن دھرم ہائی سکول بھون سے میٹرک پاس کیا۔ پھر گورنمنٹ کالج چکوال میں زیر تعلیم رہے۔ یہ صحافی و شاعر کالج کے دنوں ہی میں سرتاپا شورش تھا۔ جہاں کا ایک ہنگامہ کھڑا کئے رکھا۔ جو بات اس کے منہ سے نکلی، شہر کے ورد زبان ہو گئی۔ اردو اور پنجابی

دونوں زبانوں میں شعر کہتا ہے۔ غزل، نظم اور گیت لکھتا ہے۔ اس کے گیتوں کا لہجہ تو طبیت سے پُر ہے۔ اس کی شاعری میں مقامی عنصر پایا جاتا ہے۔ اس کا ایک قومی ترانہ ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے اکثر نشر کیا جاتا ہے۔ جو کہ ستمبر ۶۵ء کی جنگ کے شہیدوں کے حضور نذرانۂ عقیدت کی حیثیت رکھتا ہے۔ نمونہ کلام ہے

"زخمی مجاہد"

زمانہ میری گذرہ گاہ میرا وجود کتاب!!
کہ میں نے اپنے لہو سے لکھا ہے اپنا نصاب!!
تو میرے زخم نہ گن میری بے بسی پہ نہ جا!!
کہ میرے چہرے سے ظاہر ہے روز و شب کا حساب

تیرے گلاب سے چہرے کی روشنی کے طفیل
اندھیری رات میں بڑھتے رہے قدم اپنے
ہر ایک موجِ بلا پاس سے گذرتی رہی:
صبا کے دوش پہ کھلتے رہے علم اپنے!

سروں پہ آگ برستی رہی مگر پھر بھی!
تمہاری یاد کا دامن کہیں نہیں چھوٹا!
ہزار کوہ الم ٹوٹتے رہے جان پر!
تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ سے نہیں چھوٹا!

نہ رو کہ اشک ہی درمانِ غم نہیں ہوتے
یہ جاں لیوا بھی ہیں گرچہ بم نہیں ہوتے!

ریاض چشتی

"مفصل حالات حصہ فارسی میں درج ہو چکے ہیں۔ اردو کلام کا انتخاب "چاند گہن" اور "سبزۂ بیگانہ" میں شائع ہو چکا ہے نمونہ کلام!

غزل کے چند اشعار ؟

بڑے حسین ہیں ہمنشیں عقیدتوں کے پیچ و خم
کہ راہبر بھی محترم ہے ۔ راہزن بھی محترم ! ! !

الجھ پڑی ہیں رات سے سیاہیاں فراق کی !
لٹی ہے رات رات سے ہوئی ہے زلفِ شب بہم

ملے تو ایک سی ملے ہر ایک رند مست کو !
یہ کس جہاں کی ریت ہے شراب اور بیش و کم !

نام :- **شجاع الدین**
تخلص :- انجم
مولد و مسکن :- چکوال
سال پیدائش :- ۱۹۲۰ء

لاکھوں کے بنجارے کا یہ بیٹا تاریخی نوعیت کے مشاعرے کرانے کی شہرت کا مالک آج کل بے وفائی روزگار کا شکار ہے ۔ لیکن جب انجم جوان تھا تو کہا کرتا تھا ۔

خرد کے ہاتھوں حیات میری عذاب پیہم سے کم نہیں ہے !
جنوں کا کلمہ خرد کو گر تم پڑھا سکو تو ضرور آؤ !

غزل کے چند اشعار بطورِ نمونہ کلام درج ذیل ہیں ۔

آپ کی معصوم نظروں کی پشیمانی مجھے ۔ یاد آتی ہے بعنوان پریشانی مجھے ! !
دولتِ احساس سے پہلے نوازا آپ نے ۔ اور بخشی آپ ہی پھر غم کی ارزانی مجھے !
کل یہاں کا ذرہ ذرہ مجھ پہ ہوتا تھا نثار ۔ اب یہی دنیا نظر آتی ہے انجانی مجھے !
دل میں جانے جل رہے ہیں کتنی یادوں کے چراغ ۔ انجمن سے کم نہیں ہے دل کی ویرانی مجھے !

مطمئن ایسا ہوں انجم دل کی بربادی پہ میں
راس جیسے آگئی ہو دل کی ویرانی مجھے !

نام :- **جمیل احمد شیخ**

جمیل احمد ایک رنگین نوا شاعر ہے کالج کے ایام

تخلص :- جمیلؔ اور ہمدمؔ
تعلیم :- ایم - اے ،
مولد و مسکن :- چکوال

ہیں نظموں پہ انعامی مقابلے جیت چکا ہے۔ "چاند کرن" کا مرتب "بابر سے ظفر تک" کا مؤلف ہے اگر اس نے ریاضت جاری رکھا تو اس کا کلام فن کی انتہائی بلندیوں کو چھو سکنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ آج کل درجہ اوّل کا گزیٹڈ افسر ہے۔ نمونہ کلام ؎

رباعی

تیرے ہی نقشِ قدم تھے جدھر سے گزرے ہیں ۔ ہزار بار تیری رہگزر سے گذرے ہیں
کہاں یہ جا کے رکیں جانے قافلے غم کے ۔ حریم دل سے چلے چشم تر سے گزرے ہیں ،

غزل کے چند اشعار

یہ شب تار تیری زلف کا سایہ ہوگا ۔ چاند تاروں نے تیرا روپ چرایا ہوگا!
چرخ نے روزِ ازل گردشِ بیباک کا بھید ۔ تیری رفتارِ جنوں خیز سے پایا ہوگا!
لالہ و گل پہ یہ شبنم کے چمکتے موتی ! ۔ یہ خزانہ تیری مژگاں نے لٹایا ہوگا
تیرے عارض کے شیار بادۂ تجلی کی قسم ۔ پھر کوئی چاند سرِ بام نہ آیا ہوگا !

نام :- باقی حسین

تخلص :- باقیؔ اور کمالؔ
تعلیم :- ایم اے - بی ایڈ
مولد و مسکن :- بنوال تحصیل چکوال
سال پیدائش :- ۱۹۳۷ء

اردو، پنجابی اور فارسی کا شاعر، معتنامہ "امروز" لاہور کا مقامی نامہ نگار ہے۔ سلاست، صفائی روانی اور پر تاثیری ان کے کلام کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ افسانہ نویسی میں بھی خاص مقام کے حامل ہیں۔ آپ کی نگارشات درج ذیل اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

روزنامہ امروز لاہور۔ ماہنامہ استقلال لاہور۔ ماہنامہ ادب لطیف لاہور۔ ہفت روزہ ہلال راولپنڈی۔ روزنامہ تعمیر راولپنڈی۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی۔ روزنامہ کوہستان راولپنڈی۔ ماہنامہ پنج دریا لاہور۔ پنجابی ادب لاہور۔ ماہنامہ ... لاہور۔

ان کا منتخب کلام نظم و نثر "سبزۂ بیگانہ" میں شائع ہو چکا ہے۔ پنجابی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "رنگلے راہ" اور کہانیوں کا مجموعہ "مُڑی دے وین" عنقریب زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ نمونہ کلام ؎

غزل کے چند اشعار

طے ہو سکیں گے کیسے یہ دشوار مرحلے — خوش فہمیوں کے قصر میں آئے ہیں زلزلے
محرومیوں کو دیکھ کر آتا ہے یہ خیال — اب دل کے خون سے نہ کوئی آرزو پلے!
رانجھے کی پیروی بھی تو اے دوستو کرو — دھونی رما کے بیٹھ رہو پیڑ کے تلے!
تیرے کمالِ حسن کی تصویر کھنچ گئی! — الفاظ جب کبھی میرے احساس میں ڈھلے

فنکار

میں ہوں اک فنکار!
میری دولت میرا قلم ہے۔۔ اوروں کا غم میرا غم ہے۔
میرے پاس نہیں پاؤ گے۔ پیسے کی جھنکار!!
میں ہوں اک فن کار!
فن کی راہ پہ چلتا ہے تو۔ غم کی آگ میں جلتا ہے تو
میری الفت کا دم بھر لے۔ کر لے مجھ سے پیار
میں ہوں ایک فن کار!

نام:۔ **غلام رضا شاہ**
تخلص:۔ ضیا رضوی
مولد:۔ مرید تحصیل چکوال
مسکن:۔ کوئٹہ
سال پیدائش:۔ ۱۹۳۵ء

ضیا رضوی شاہ شرف فریدی کی نسل سے ایک خوش فکر اور خوش گو شاعر ہے۔ بسلسلہ ملازمت کوئٹہ بلوچستان میں سکونت پذیر ہے۔ مڈل تک تعلیم پائی ہے۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا مشغلہ اختیار کر رکھا ہے۔ آپ کا کلام ماہنامہ استقلال لاہور، ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور، پنجابی ادب لاہور، پنج دریا

لاہور میں اکثر شایع ہوتا رہتا ہے۔ عموماً پنجابی اور اردو میں غزلیں لکھتے ہیں۔ بطورِ نمونہ کلام غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

دور تک طوفان میں ساحل کا نشاں ملتا نہیں
کارواں کیسا، غبار کارواں ملتا نہیں!

زندگی شاہدؔ ہی دشتِ وفا کا نام ہے!
چند لمحے سایۂ ابرِ رواں ملتا نہیں!

چاند تاروں کی چمک ہو یا شراروں کی لپک
وہ ستمگر انجمن آرا کہاں ملتا نہیں!

ہم ضیا شعروں میں رنگ آگہی بھرتے رہے
ورنہ اس محفل میں کوئی نغمہ خواں ملتا نہیں۔

نام :- محمد خالد

تخلص :- خالدؔ

تعلیم :- بی اے ایل ایل بی۔

مسکن :- چکوال

آپ کے والد شیخ محمد سرور ڈی ایس پی ریٹائرڈ ہیں۔ قومیت کے لحاظ سے گڈ ہوک تا فوکو اور پیشہ کے لحاظ سے اے ڈی ایم۔ سرکاری ملازمتوں کی مصروفیتوں کے باوجود آپ علم وادب کی خدمت کے لئے کچھ نہ کچھ وقت نکال ہی لیتے ہیں۔ آپ زیادہ تر غزلیں ہی لکھتے ہیں۔ آپ کا اندازِ بیان دلکش، شگفتہ اور جذبہ و فکر کی ہم آہنگی سے بھرپور رہا ہے۔ غزل کے چند شعر بطورِ نمونہ کلام یہ ہیں ؎

ورائے زیست بسر کی ہے زندگی میں نے
کبھی ہے تلخیٔ دوراں ہنسی خوشی میں نے

میری حیات کا حاصل کمال محرومی!
بہجوم یاس میں کاٹی ہے زندگی میں نے

تمہاری بخشش عصیاں سے تھک کے ہار گئی
وگرنہ ذوقِ گنہ پر نہ کی کمی میں نے!

کسی کی یاد کا عکس جمیل ہے ہمدم!
کہ جس کو پیار کیا ہے کبھی کبھی میں نے

میرا نیاز بھی ہے ناز آفریں خالدؔ!!
عطا کئے انہیں اندازِ دلبری میں نے!!

محمد نسیم

نام :- محمد نسیم
تخلص :- اخگر
تعلیم :- بی اے، ایل ایل بی
مولد :- چکوال
مسکن :- حال لائل پور

آپ محمد خالد کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اِن دنوں، لائل پور میں سرکاری وکیل ہیں۔ بڑے حساس اور رنگین نواشاعر ہیں۔ غزل کے چند شعر پیش ہیں۔

تم شہر یار نگاراں تھے ان دنوں!
ہم فخر بزم بادہ گساراں تھے ان دنوں!

تھی تیرے دم قدم سے ہر اک گل کی آب و تاب
تم آبروئے فصل بہاراں تھے ان دنوں!

کس حسرت ناز کا اہنیں رہتا تھا انتظار
کیوں؟ فرش راہ چشم و دل و جاں تھے ان دنوں

اک اک مژہ تھی خونِ جگر سے سجی ہوئی!
کیا اہتمام جشن چراغاں تھے ان دنوں!

کس فصلِ گل کا ذکر ہے کس گلستاں کی بات
اخگر سنا ہے تم بھی غزل خواں تھے ان دنوں

ماجد صدیقی :- مفصل حالات کے لیئے ملاحظہ ہو فصل پنجابی ادب!

غزل کے چند اشعار سے

اشک چمکے تھے تو سمجھے تھے سویرا ہو گا
کس کو معلوم تھا یوں اور اندھیرا ہو گا۔

اس کو کیا آئے گا ناوک لب و عارض کا خیال
جس کو نیرنگیٔ حالات نے گھیرا ہو گا۔

کٹ گئی عمر مگر طول شب غم نہ کٹا!
جانے کس رنگ میں اس شب کا سویرا ہو گا!

ہم نے تو درد سے بھی آنکھ لڑائی یارو!
پھر بھی امید کی آغوش ہے خالی یارو!!

شکر ہے تم نے یہ راہیں نہیں دیکھیں اب تک
ہم تو در در پہ گئے بن کے سوالی یارو!!

جانے کس دور کا رہ رہ کے سناتی ہے پیام
زرد پتوں سے یہ بخشی ہوئی تالی یارو!

ان کے علاوہ نسیم لودھی، شوکت خواجہ۔ عابد جعفری۔ الطاف قمر۔ رفیع یوسفی۔ اسلم حزوی انجم ستر الوی۔ احسان تستر الوی، ضمیر احمد ضمیر۔ وغیرہ بھی اردو ہی میں داد سخن دیتے ہیں۔ ان میں سے

بعض کا کلام ملک کے مشہور و معروف اخبارات و رسائل میں چھپتا رہتا ہے۔ قلتِ گنجائش کی وجہ سے، ان کے مفصل تذکرہ سے صرف نظر کرتا ہوا اس دور کے نثر نگار کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

نثر نویس

نام:۔	میجر جنرل محمد اکبر خان
قلمی نام:۔	رنگروٹ
مولد:۔	چکوال
مسکن:۔	حال کراچی
سال پیدائش:۔	۱۸۹۷ء

آپ چکوال کے نامور قبیلہ ماثر منہاس کے فرد ہیں۔ آپ کی تمام زندگی میدانِ کارزار میں گزری۔ اور اپنی قابلِ قدر جنگی خدمات کے بدلے ہی آپ سکھ وار سے ترقی کرکے میجر جنرل کے معزز عہدے پر فائز ہوئے۔ آپ کے والد کا نام آنریری میجر خان بہادر راجہ فضل داد خان تھا۔ آپ کے دوسرے پانچوں بھائی بھی پاکستانی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ جنرل محمد افتخار خان مرحوم، اور میجر جنرل محمد انور خان آپ کے چھوٹے بھائی ہیں۔

جنرل موصوف دو بڑی جنگوں میں شاندار کارنامے انجام دے چکے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم میں اعلیٰ فوجی خدمات کے صلے میں آپ کو کنگ کمیشن ملا۔ یہ وہ اعزاز تھا جو اس وقت تک کسی ہندوستانی افسر کو نہیں ملا تھا۔ آپ کی جرأت مندانہ خدمات کا اعتراف اس طرح بھی کیا گیا۔ کہ دفتر جنگ نے آپ کی تصویر برطانوی نشستی گیلری میں آویزاں کردی جو ایک برطانوی مصور کے موقلم کا شاہکار ہے۔

یہ اعزاز بھی صرف آپ ہی کو ملا۔ کہ آپ ترقی کرکے بھی اپنے یونٹ ہی میں رہے۔ حالانکہ آئینی طور پر یہ درست نہیں۔

جنرل صاحب ایک سچے نڈر اور بہادر سپاہی ہونے کے علاوہ ایک اچھے کھلاڑی بھی ہیں۔ تمام مردانہ کھیلوں میں آپ کو ایک خاص فوقیت حاصل ہے۔ آپ کا محبوب مشغلہ عوام کی معاشرتی خدمت انجام دینا ہے۔

آپ اپنے چالیس سالہ جنگی تجربات کو اردو اور انگریزی میں بیان کرتے رہتے ہیں۔ آپ غالباً پہلے فوجی مفکر ہیں، جو افواجِ پاکستان کو اسلامی نظریۂ جنگ کے مطابق منظم کرنے کے داعی ہیں۔ آپ نے مشرق و مغرب

نے مختلف ممالک کی خوب سیر و سیاحت بھی کی ہے۔ آپ کی ملاقاتیں اور تبادلۂ خیالات چینی۔ انڈونیشی مصری۔ سوڈانی۔ فرانسیسی، انگریز اور امریکن جرنیلوں اور ریاستوں کے سربراہوں سے اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ عصر حاضر کے مایہ ناز لیڈر، مفکر، دانشور، مصنف اور جرنیل ماؤزے تنگ کے ساتھ دو دو بار فوجی جنگی چالوں کے بارے میں بھی تبادلۂ خیالات کا موقعہ آپ کو مل چکا ہے۔ آپ متعدد اردو اور انگریزی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں :-

اسلامی طریق جنگ۔ اسلحہ جنگ۔ جہاد صدیق۔ حدیث دفاع۔ خالد بن ولید۔ محمد بن قاسم
ہمارا دفاع۔ احکام جنگ۔ گوریلا وار فیئر وغیرہ

آپ کی تحریر کا نمونہ یہ ہے۔

" سیاسی پالیسی کی پیروی کرتے وقت اور دشمن کو اپنی پالیسی منوانے کے لئے جنگ لڑی جاتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ جنگ سیاسی پالیسی کی پشت پناہ ہوتی ہے۔ زمانہ قدیم سے آج تک کوئی ایسی لڑائی نہیں لڑی گئی جس کی تہ میں سیاسی نظریہ نہ ہو۔ بالفاظ صحیح تر سیاست کو جنگ سے الگ تھلگ نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن یہ کہنا بھی گمراہ کن ہے کہ مقصد براری کی انتہا ہی جنگ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ چونکہ جنگ میں کئی قسم کی خاصیتیں ہوتی ہیں۔ لہٰذا مقاصدِ جنگ اور سیاسی نظریہ کو یک جان و دو قالب نہیں کہہ سکتے۔"

(اسلامی طریق جنگ صفحہ ۶۹)

(ج) پنجابی ادب

پنجاب کی وجہ تسمیہ اور اس کی وسعت کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ جنوچی (ایک اطالوی سیاح و مورخ) کے بموجب پانچ دریاؤں کی سرزمین ہونے کی وجہ سے مغل شہنشاہ اکبر اعظم (۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) نے صوبہ ملتان اور صوبہ لاہور کا مجموعی نام "پنج آب (پنجاب)" رکھا۔ ایک دوسری رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام شیر شاہ سوری (۱۵۴۰-۱۵۴۵ء) کے عہد سے مروج ہے۔ ڈاکٹر (پی۔ سرن) اپنی انگریزی کتاب "دی پرونشل گورنمنٹ آف دی مغلز" ص ۵۸ پر لکھتا ہے کہ "شیر شاہ نے ہر ایک کو طلب کیا اور پنجاب کی حکومت پر ہیبت خان نیازی کو مستقل کر دیا"۔ اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ پانچ دریاؤں کی کل سرزمین یعنی صوبہ لاہور معہ صوبہ ملتان کو اس عہد میں پنجاب کہا گیا۔ ایک اور غیر ملکی مورخ رو (ROE) کے مطابق پنجاب لاہور کا مترادف ہے۔ وہ بڑے سے بڑے صوبوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ملتان، کابل، کشمیر اور پنجاب بڑے بڑے صوبوں میں سے ہیں۔ لیکن حافظ محمود شیرانی اپنی مستند کتاب "پنجاب میں اردو" کے صفحہ ۸ پر لکھتے ہیں کہ "انہوں (ایرانیوں) نے اپنے وطن کے پانچ دریاؤں کی یاد میں پانچ دریاؤں کے درمیانی علاقہ کا نام بھی پنجاب رکھ دیا"

یہی محقق آگے چل کر اسی کتاب کے ص ۴۸ پر لکھتا ہے کہ غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶-۱۲۸۶ء) نے اپنے ولیعہد سلطان محمد شہید کو ریاست ملتان اور لاہور دی چنانچہ مغلوں کے ہاتھوں سے یہ شہزادہ جنگ میں مارا گیا ......

جلال الدین فیروز شاہ خلجی (۱۲۹۰-۱۲۹۶ء) نے اپنے رشتہ دار کلی خان کو علاقہ لاہور و ملتان کا ناظم مقرر کیا۔ اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ سیاسی اور انتظامی نقطہ نظر سے اگرچہ پانچ دریاؤں کی سرزمین کبھی دو مختلف صوبیداروں کے ماتحت اور کبھی ایک ہی حاکم کے تحت چلی آئی ہے۔ لیکن صوبہ ملتان اور صوبہ لاہور کا مجموعی نام پنجاب ہی تھا۔

اب ایک اور ایسا بیان ہمارے سامنے آ رہا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابن بطوطہ (مشہور عالمی سیاح جو کہ سلطان محمد تغلق ۱۳۲۵-۱۳۵۱ء کا ہمعصر تھا) کے زمانہ سیاحت ہند میں بھی وہی صورت

ہک لکھن نال زباناں عربی فارسی — ہک موڑ ترجمن کو رکے جاتن آرسی

سن آکھاں نال زبانے ہندی سہل تر — الفاظ سو کھالے معنے چنگے چوں درر

(۴) مولوی محمد مسلم "گلزار آدم" ۱۲۵۰ھ میں لکھتے ہیں ؎

اک دن دل وچ گذریا میرے اہ خیال — ہندی وچہ پیغمبراں دا لکھ آکھاں میں حال

(۵) امام دین ۱۲۹۵ھ قصہ ہرنی میں لکھتا ہے ؎

معجزہ پاک رسول دا ہندی آکھ سنایا،

(۶) میاں محمد بخش مصنف قصہ سیف ملوک ص۲۱ میں (۱۲۷۹ھ) اپنی زبان کو ہندی قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ملکاں تھیں منگوا کتاباں بات ممتاحی وڈی
چوہاں کتاباں دی تک شاہدی ہک ہندی کر جوڑی
اس ہندی وچ مطلب بہتے جیہا جیہا کوئی چاہے
پاوے رب قبول محمد مرداں دی در گاہے

(۷) مولوی محمد اللہ جو ایا مشہور بہ جھاوریاں والا اپنے کتابچے رسالہ نوری کے خاتمہ پر لکھتے ہیں ؎

شکر خداد اپورا ہویا الیہ رسالہ نوری، — طالب آکھ سنائے اس وچ مسئلے غور ضروری

بلکہ ان سے تھاویں سن وچ پنیا الہ رسالہ — ارلی ہندی مطلب آتھیں نکلے بہت سکھالہ

۱۲۸۰ھ لیکن بایں ہمہ اس زبان کو لفظ پنجابی سے موسوم کرنا بھی شاعروں کو بھولا ہوا نہیں تھا۔ چنانچہ حافظ برخوردار اپنی کتاب مفتاح الفقہ (۱۰۸۰ھ) میں لکھتے ہیں۔

حضرت نعماں دا فرمایا اس وچہ اوہ مسائل — ترت پنجابی آکھ سنا دیئے کر ہووے مائل

پس ثابت ہوا کہ مختلف اوقات میں جس زبان کو لاہوری، ملتانی یا ہندی کے ناموں سے موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ وہ پنجابی اور صرف پنجابی تھی جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی دیوناگری حروف میں لکھی جانے والی سنسکرت نما ہندوستانی پر لفظ ہندی کا اطلاق صرف انگریزی عہد کا شاخسانہ ہے۔

اندرونی تقسیم کی رو سے موجودہ پنجابی زبان کو درج ذیل علاقائی لہجوں یا بولیوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ا۔

کا نام پنجاب تھا۔ وہ اپنے سفر نامہ (اردو) کے صفحہ ۵۶ پر "پنجاب کا عبور" کے زیر عنوان لکھتا ہے کہ

"بعد ازاں میں اور میرے رفیق خدا کا شکر ہے کہ پنجاب صحیح و سالم پہنچے یہ دریائے سندھ ہے۔ پنج کے معنی پانچ کے اور آب کے معنی دریا کے اس لئے اس کے معنی پانچ ندیاں، جو میٹھے ہیں ایک بڑی نہر میں گرتی ہیں اسی شب ہم نے محرم کا چاند ۷۳۴ھ (مطابق ۱۲ ستمبر ۱۳۳۳ء) دیکھا۔"

پھر یہی سیاح صفحہ ۱۸۹ پر "حدود سندھ میں داخلہ" کے زیر عنوان لکھتا ہے کہ "ماہ محرم ۷۳۴ھ کی یکم تاریخ کو ہم لوگ دریائے سندھ پر گزرا ہوا اس دریا کو پنجاب بھی کہتے ہیں۔" گویا محمد تغلق (۱۳۲۵ء — ۱۳۵۱ء) کے عہد تک پنجاب اور سندھ مترادف تھے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ رئیس احمد جعفری مترجم سفرنامہ ابن بطوطہ اسی صفحہ کے حاشیہ نمبر ۱ میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "سندھ کا پرانا نام جو آریوں نے یہاں آتے ہی رکھا تھا "سندھو" تھا جس کے معنی دریا کے ہیں" ۱۲ — اور حاشیہ نمبر ۲ میں لکھا ہے۔ "پنجاب سے مراد بھی دریائے سندھ ہے کیونکہ اس میں پانچوں دریا آکر ملتے ہیں۔ چنانچہ مغل حکومت سے پہلے "پنجاب" سے دریائے سندھ مراد لیتے تھے" اگر پنجاب سے دریائے سندھ مراد لیتے تھے تو گویا مغلوں سے پہلے وادی سندھ اور پنجاب مترادف ٹھہرے۔

جہاں تک پنجاب کی زبان کا تعلق ہے۔ امیر خسرو (۶۵۱ — ۷۲۵ھ) اس زبان کو لاہوری کہتے ہیں۔ اور آئین اکبری کا مؤلف ابوالفضل علامی اس زبان کا نام ملتانی بتاتا ہے اور ان دونوں سے پہلے مسعود سعد سلمان لاہوری (۴۳۸ — ۵۱۵ھ / ۱۰۴۶ — ۱۱۲۱ء) کے متعلق تذکروں میں آیا ہے کہ ان کے تین زبانوں یعنی عربی، فارسی، اور ہندی کے دیوان تھے جن میں سے عربی، ہندی کے دیوان دستبرد زمانہ کی نذر ہو چکے ہیں۔

ان شہادتوں سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ زبان جو غزنوی عہد میں ہندی کہلاتی تھی وہ امیر خسرو کے زمانے میں لاہوری اور اکبر اعظم کے عہد میں ملتانی کے نام سے مشہور ہوئی ماہیت کے لحاظ سے غالباً ان میں کوئی خاص فرق نہ ہوگا۔ لیکن اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ — ۱۷۰۷ء) کی تعلیمی پالیسی کے تحت جب علاقائی اور مادری زبانوں میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر محمد شاہ (۱۷۱۹ — ۱۷۴۸ء) کے عہد میں جب خان دوران کے بعد نواب ذکریا خان (۱۷۳۷ء) کو ملتان اور صوبہ لاہور کا مشترکہ گورنر مقرر کیا گیا اور صوبہ ملتان و صوبہ لاہور کی سیاسی تقسیم ختم کر کے ان دونوں صوبوں کی حدود میں محدود خطے کو پنجاب قرار دیدیا گیا تو اسی پنجاب کی رعایت سے اس نئے متحدہ صوبہ کی زبان کا نام پنجابی ہی مشہور خاص و عام ہو گیا اور درست

لکھی بھی تھا۔

بطورِ جملہ معترضہ کے اگر اس موقعہ پر ہندی زبان سے مسلمان شعراء و ادباء کی کیا مراد رہی ہے۔ پہ تھوڑی سی تحقیقی روشنی ڈالتی جاوے تو اردو کی پیدائش کے نظریئے اور وادیٔ سندھ (مغربی پاکستان) کی زبان کیا ہونی چاہیئے کے ضمن میں کسی معنی خیز نتیجہ تک پہنچنے میں بڑی سہولت رہے گی۔

اس ضمن میں گذارش ہے کہ حافظ محمود شیرانی مرحوم اپنی معرکۃ الآرا اور مستند کتاب "پنجاب میں اردو" صـ۲ پہ فرماتے ہیں کہ۔

"فارسی لغات کی شہادت سے، جو نویں صدی ہجری میں ہندوستان میں لکھی جاتی ہیں۔ صاف واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان ان ایام میں تمام اسلامی ہندوستان میں سمجھی جاتی تھی۔ یہ لغات نگار اس کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ لغات نگار صرف ایسی زبان ہی کو ہندی کہتے تھے جو اردو نما پنجابی، یا پنجابی نما اردو ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اور کسی زبان کو ہندی ہرگز نہیں کہا جاتا ہوگا۔ اور تمام اسلامی ہندوستان میں اسی زبان کا سمجھا جانا محض اسی وجہ سے تھا کہ اسلامی لشکروں میں غالب تعداد ان لوگوں کی تھی جو پنجاب سے بھرتی شدہ تھے یا مدت دراز تک پنجاب میں سکونت پذیر رہ چکے تھے۔ مسعود سعد سلمان لاہوری سے لے کر ۱۲۸۹ھ تک ہمارے ادبا و شعراء جس زبان کو ہندی کے نام سے موسوم کرتے رہے ہیں وہ پنجابی کے سوا اور کوئی نہیں اور چونکہ اردو پنجابی سے نکلی اس لئے ضمناً اگر اردو پر بھی ہندی کا اطلاق ہوتا رہا ہے تو یہ بات ہمارے موقف کے خلاف نہیں جاتی۔ اس دعوے کی تائید میں درج ذیل شواہد قابل غور ہیں۔

(۱) عبدالکریم مصنف نجات المومنین تحریر ۱۰۸۶ھ رقمطراز ہے ؎

فرض مسائل فقہ دے ہندی کر تعلیم   کارن مرداں امیاں جوڑے عبدالکریم

(۲) شاہ جہاں (۱۶۲۷-۱۶۵۸ء) کا ہمعصر حافظ معز الدین ۱۰۸۹ھ میں عربی قصیدہ امالی کی شرح کرتے ہوئے لکھتا ہے ؎

اس عربی [illegible]یں ہندی کیجے   سبھے خلق سو کھلی لیجے

(۳) حضرت شاہ مراد جو کہ اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) کے معاصر تھے اور جن کی وفات ۱۱۱۴ھ میں ہوئی فرماتے ہیں ؎

(۱) ملوئی : یہ مالوے کی بولی ہے۔ لدھیانہ، فیروزپور، پٹیالہ، فرید کوٹ، جیند اور نابھہ میں بولی جاتی ہے، اس کی پہچان یہ ہے، کہ کئی دفعہ ٹکسالی یا ماجھی کے الفاظ کو چھوڑ دیا جاتا ہے، مثلاً کیھو، جیہ، اصل میں اکھو اور وچ کا دوسرا روپ ہے، دوسرے اس میں واؤ کی جگہ ب اور م زیادہ بولا جاتا ہے، جیسے لیا ما اس علاقے میں پرانی انگریزی کی طرح (AMETHINK) کھے رہیں اکھیا اتھوں ہیں، کش بھی بولا جاتا ہے :۔

(۲) دوآبی : جالندھر، ہوشیار پور، کپور تھلے کے علاقے میں بولی جاتی ہے، یہ ماجھی اور ملوئی کا میل ہے :۔

(۳) پوادھی : یہ پوادھ کی بولی ہے۔ روپڑ سے لے کر ستلج کے نزدیک کے علاقے کو پوادھ کہتے ہیں، اس بولی پر باگڑی اور ہندی (موجودہ دور کی) کا اثر ہے،

(۴) ماجھی یا ٹکسالی : لاہور، امرتسر اور گورداسپور کی بولی ہے۔ اس کا اپنا رنگ ہے، کتابی زبان کے طور پر بھی پرچلت ہے۔ اس میں سنگوں کا لفظ بہت استعمال ہوتا ہے،

(۵) ڈوگری : یہ پہاڑی علاقے کی بولی ہے، جموں، سیالکوٹ اور کانگڑے کے علاقے میں زیادہ بولی جاتی ہے، اس پر کشمیری بولی کا اثر ہے :

(۶) پوٹھوہاری : یہ پوٹھوہار کے علاقے میں بولی جاتی ہے، پوٹھوہار کی حد دریائے جہلم سے درہ مارگلہ تک ہے، اس میں گھتی تگھی، اچھنا گچھنا وغیرہ الفاظ زیادہ بولے جاتے ہیں، اب اس میں دیدہ دانستہ دا، دے، دی کی بجائے نا، نے، نی کا استعمال زیادہ کیا جا رہا ہے، "جمہوری آواز" کے بجائے "جمہوری واز" یہ ایک گنوار بولی ہے، اس میں کوئی ادبی چیز موجود نہیں ہے :

(۷) ملتانی : یہ جھنگ، ملتان، ساہیوال اور علاقہ بار کے جانگلی قبیلوں کی بولی ہے، مظفر گڑھ اور بہاولپور کی بھی یہی بولی ہے، حسینی ڈوہڑوں اور مرثیوں کے لئے یہ زبان لازوال شہرت کی مالک ہے :

(۸) لہندی : یہ ضلع جہلم کا سوا علاقہ پوٹھوار، تحصیل تلہ گنگ، تحصیل خوشاب مغربی تحصیل بھیرہ، ضلع سرگودھا میں بولی جاتی ہے، اسے ہی دھنی روپ بھی کہا گیا ہے۔ یہ پوٹھوہاری کی نسبت ملتانی سے

زیادہ قریب ہے، اس کا قدیم نام کیکٹہ تھا۔

۷۔ ہندکو: یہ دریائے سندھ کے ارد گرد، ضلع ہزارہ، ریاست دیر، سوات، بنیر کی گوجر آبادیوں اور پنڈی گھیب، تحصیل خالصہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اس کا تلفظ پشتو سے زیادہ متاثر ہے، اس لہجہ کی نمایاں خصوصیت ویگا، یعنی انہیں ہے گا کا استعمال ہے۔

پنجابی زبان کی قدامت اور ماہیت پر گفتگو بھی خلاف محل نہ ہو گی، اس ضمن میں عرض ہے کہ ہڑپہ، موہنجو دارو، کوٹ ڈیجی وغیرہ میں جو کھدائیاں ہوئی ہیں، ان سے یہ بات بخوبی ثابت ہو رہی ہے کہ آریاؤں کی آمد سے پہلے یہاں کچھ اور قومیں بھی آباد تھیں، جو تہذیب و تمدن کے ایک اعلیٰ مقام پر فائز تھیں، اس تہذیب کے بانی دراوڑ یا ان کے پیشرو تھے، برصغیر کے مختلف مقامات سے جو انسانی کھوپڑیاں برآمد ہو کر زیر تحقیق و مطالعہ آ چکی ہیں، ان کے متعلق ڈاکٹر رادھا کمود مکرجی کی رائے ہے کہ ہمارے ملک میں سب سے پہلے حبشی نسل کے لوگ وارد ہوئے تھے، انہی لوگوں نے یہاں کمان ایجاد کی تھی، اس کے بعد پروٹو آسٹرلائڈ نسل کے لوگ آئے، یہ منڈا خاندان کی زبانیں بولتے تھے، ان کے بعد شمالی مغربی دروں کے راستے دراوڑ نسل کے لوگ برصغیر ہند و پاکستان میں وارد ہوئے، اور اپنے ہمراہ عراق، عرب، ایشیائے کوچک وغیرہ علاقوں کی تہذیب و تمدن لائے، ان کی آمد کا زمانہ تا حال متعین نہیں کیا گیا، البتہ ان کے بعد آنے والی قوم یعنی آریوں کی آمد کا زمانہ آج سے تقریباً چار ہزار سال پیشتر متعین کیا گیا ہے، انہوں نے جب برصغیر میں قدم رکھا، تو ان کا مقابلہ جس قوم سے ہوا، وہ مغلوب ہو گئی، اور انہوں نے ان کا نام داس، راکشس وغیرہ رکھ دیا، آریوں کی زبان ویدی سنسکرت کہلاتی ہے۔

عبدالحلیم اثر الافغانی کی تحقیق کے مطابق سنسکرت (شمس کرت) سے مشہور زبان، پنجابی د ستھق م) کے عہد میں ایک مخلوط زبان تھی، جو اپنی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے عبرانی تھی، لیکن صوتی لحاظ سے سریانی اور آرامی جہاں تک لغات کا تعلق ہے، اس میں بابلی، سبائی، اور سینائی زبانوں کے لغات شامل تھے، کیونکہ اس عالم کے عہد میں پشتو، اوستا، آرامی، عبرانی، ویدک، سینائی، فنیقی، براہمی، یا یونانی زبانیں بولی جاتی تھیں۔

بایں ہمہ رگوید کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وید کو معرض وجود میں لانے سے پہلے آریہ

لوگ کبھہ (کابل)، سعاستو (سوات)، کرمو (کرم)، گومتی (گومل)، سندھو (سندھ)، سوساد (سوان)، وتستا (جہلم)، اسکنی (چناب)، پرشنی (راوی)، وپاش (بیاس)، شتندری (ستلج)، اور گنگا جمنا کی وادیوں میں پوری طرح متمکن ہو چکے تھے،

اس کے بعد ایران کے ہخامنشی خاندان کے بادشاہ سیرس (۵۵۸-۵۳۰ ق م) نے برصغیر ہند پاکستان کا رخ کیا، اور بہت سا علاقہ زیر تصرف کر لیا، بعدہٗ دارا اوّل (۵۲۲-۴۸۶ ق م) نے اپنے مقبوضات کو مزید وسعت دی، اب ایرانی سلطنت کی سرحد سرہند تک پہنچ گئی، اور موجودہ مغربی پاکستان کو ایرانی سلطنت کا ۲۰واں صوبہ بنا لیا۔

دارا اول کے بیٹے کیخسرو (۴۸۶-۴۶۵ ق م) کے زمانے میں یہاں غیر ملکی تسلط کے خلاف ایک بڑی شورش ہوئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کیخسرو نے اس شورش کو دبا لیا، کیخسرو کے بعد ایرانی بادشاہ کمزور ہوتے چلے گئے، اس لئے دور دراز علاقوں پر ان کی گرفت بھی ڈھیلی پڑتی گئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دریائے سندھ کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں، چنانچہ دریائے کابل اور سوات سے سیراب ہونے والے علاقے میں اسواکوں کی حکومت قائم ہوئی جس کا دار الخلافہ پشکلاوتی تھا، اور دوسری ریاست ٹیکسلا تھی، ٹیکسلا کے مشرق میں پورو قبیلہ برسر حکومت تھا جس کے بادشاہ کا نام تاریخ کے اوراق میں راجہ پورس لکھا جاتا ہے، اگرچہ اس کا اصلی نام پورو پال بن پچھی پال تھا،

ایرانیوں کے بعد سکندر اعظم مقدونی (۳۲۶ ق م) نے حملہ کر کے راجہ پورس کو شکست دی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر پر بیاس تک یونانیوں کا اثر کم و بیش ۲۰۰ء تک کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا، اس زمانہ میں یہاں کے باشندوں نے آرامی، کھروشتی اور یونانی رسم الخط سے آگاہی حاصل کی،

یونانیوں کے بعد ساکا، پارتھین اور کشن قومیں ادھر کا رخ کرتی رہیں، سمدر گپت (۳۴۰ء) نے جب آنکھیں بند کی تھیں، تو تمام غیر ملکی قومیں اپنے اقتدار سے محروم ہو چکی تھیں، گپتی خاندان کے بادشاہ سکندر گپت کی موت پر ایک دفعہ پھر ایک غیر ملکی قوم ہمارے ملک پر چڑھ آئی، اور اس نے ہن سرداروں تورمان اور مہرگل کی زیر سرکردگی بعض علاقوں پر قبضہ کر لیا،

اس علاقہ میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے جب کہ حبیب بن ابی صفرہ کی سرکردگی میں مسلمان کابل سے ملتان تک پہنچ گئے، دوسری بار محمد بن قاسم

(۷۱۲ء) کے ساتھ کراچی کی طرف سے شمال کی طرف سندھ کو فتح کرتی ہوئی آگے بڑھی، پھر کچھ عرصے کے بعد سلطان محمود غزنوی (۹۹۷ ۔ ۱۰۳۰ء) نے فتوحات کا ایسا سلسلہ شروع کیا، کہ برصغیر پر کشمیر سے راس کماری اور خیبر سے چاٹگانگ تک اسلامی پرچم کسی نہ کسی صورت میں ۱۸۵۷ء تک لہراتا رہا، تاآنکہ انگریزوں کی حکومت نے اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔

موجودہ صورتحال میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا، کہ آریوں کی آمد سے پہلے ہمارے علاقے کی زبان کون سی تھی، ؟ کیونکہ ہڑپہ اور موہنجوداڑو سے دریافت شدہ تحریریں ابھی تک پڑھی نہیں جا سکیں، لیکن مندرجہ بالا تاریخ کی روشنی میں ہم یہ نظریہ ضرور قائم کر سکتے ہیں، کہ جو بھی زبان یہاں بولی جاتی تھی، اس پر علی الترتیب منڈا، دراوڑ، سنسکرت، سیتھین، پہلوی، یونانی، پراکرتیں، عربی، فارسی، پشتو، اور انگریزی زبانیں اثر انداز ہوئیں، پہلی دو زبانیں بذاتِ خود علاحدہ خاندانوں کی سرچشمہ ہیں، ان کی تحتی زبانوں کا مطالعہ عین الحق فرید کوٹی کے حوالہ سے کیا جا سکتا ہے، عین الحق اپنے ایک مضمون "ماوی سندھ میں دراوڑی زبانوں کی باقیات" میں لکھتے ہیں، کہ

"بشپ کالڈویل کا بیان ہے، کہ شمالی ہند کی زبانوں کا تقریباً دسواں حصہ غیر آریائی عناصر سے تعلق رکھتا ہے اور مرہٹی میں یہ عنصر پانچویں حصہ پر مشتمل ہے، پنجابی زبان کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے، تو اس میں بھی دراوڑی اور منڈا زبان کا اتنا عنصر موجود ہے، کہ اُسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاتا، اس عنصر کا ٹھیک ٹھیک تناسب کیا ہے، فی الحال یہ بتانا مشکل ہے، برصغیر ہند و پاک کی موجودہ زبانوں کے تجزیہ سے ثابت ہوتا ہے، کہ آریاؤں سے قبل اس ملک میں تین مختلف زبانیں مروج تھیں، اول پہاڑی جسے عام طور پر تبتی برمی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہ لداخ سے شروع ہو کر برصغیر کے شمالی سلسلہ ہائے کوہ کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی برما، سیام، آسام اور ہند چینی وغیرہ ممالک تک جا پہنچتی ہے، اس میں برصغیر کے لداخ، کماؤں، نیپال، بھوٹان، سکم اور ناگا قبائل کے علاقے شامل ہیں۔ زبانوں کے اس گروہ نے شمالی ہند کی زیر غور زبانوں پہ کوئی خاص اثر نہیں ڈالا، گو ہمارے لغوی سرمایہ میں کوئی کوئی لفظ اس ذخیرے کا بھی آ جاتا ہے، لیکن ہمارے لسانیاتی مطالعہ میں اس زمرہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی، دوسری زبان منڈا گروہ سے تعلق

رکھتی ہے۔ یہ وسطی ہند کے جنگلات میں بسنے والے بھیل، کول، سنتھال وغیرہ قبائل کی زبان ہے۔ شمالی ہند کی زبانوں پر اس کے اثرات گو اتنے وسیع نہیں لیکن پھر بھی ان زبانوں کے مطالعہ کے دوران اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد دراوڑی زمرہ سے تعلق رکھنے والی زبانیں ہیں جو کہ موجودہ دور میں زیادہ تر جنوبی ہند کے علاقہ میں بولی جاتی ہیں۔ بلوچستانی، براہوی زبان بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ تامل۔ تیلگو۔ ملیالم۔ کناری۔ گونڈی وغیرہ اس کی بڑی بڑی شاخیں ہیں۔ ابھی تک شمالی ہند کے لسانیاتی مطالعہ کے لئے دراوڑی زبانوں کو قابل التفات تصور نہیں کیا گیا۔ گو ان زبانوں پر اس زمرہ کے اثرات اتنے گہرے اور وسیع ہیں کہ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو اس سلسلہ میں دراوڑی زبانوں کی نسبت سنسکرت کو محض ایک ثانوی حیثیت حاصل ہے۔

پنجابی زبان ہی کی مثال لیجئے۔ یہ نہ صرف پھیلاؤ کے لحاظ سے وسیع ہے بلکہ اس کی لغت بھی اپنے دامن میں بے شمار زبانوں کا سرمایہ سمیٹے ہوئے ہے۔ مثال کے طور پر مصدر مارنا بمعنی زدوکوب کرنا کو ہی لیجئے مارنا خود سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ انہی معنوں میں پٹنا کا لفظ گو آریائی الاصل ہے لیکن سنسکرت میں نہیں ملتا شاید یہ انگریزی لفظ Beat کا ہم اصل ہے۔ انہی معنوں میں مندرجہ ذیل دراوڑی الفاظ معمولی تبدیلی کے ساتھ عام بول چال میں ملتے ہیں۔

تیلگو	پنجابی	اردو	گونڈی	پنجابی
کوٹو	کٹنا	کوٹنا	جم	جمنا

براہوی	پنجابی	تامل۔ ملیالم	پنجابی
کھالا	کھلن	اڈی	اڈونا جیسے مار مار کر اڈا دینا

اسی طرح منڈا گروہ کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔

سنتھالی، منڈاری	پنجابی
دل	دلنا

اس مطالعہ کے دوران ہمیں دراوڑی اور منڈا گروہوں کے کئی الفاظ روزمرہ کی پنجابی زبان میں ملیں گے۔ مثال کے طور پر پنجاب کے دیہاتوں میں جب ماں ذرا نا راضگی سے بچوں کو کھانا کھانے کے لئے کہے گی تو "کھا تن لا" یا صرف "تن لا" کے الفاظ استعمال کرے گی۔ تنا بمعنی کھانا، تامل، ملیالم، کناری، تیلگو وغیرہ زبانوں میں کھانے کو "تنو" کہتے ہیں سندھی میں کھانا کھانے کو جم کہتے ہیں جو کہ منڈا حلقہ کی زبانوں سا ودرا، سنتھالی، منڈاری وغیرہ میں انہی معنوں میں استعمال ہونے والے لفظ جاَم یا جومے کی ایک شکل ہے۔

ایسے ہی اگر بچے ماں کو کھانے کے لئے تنگ کر رہے ہوں تو وہ پنجابی میں کہے گی "جوا ساہ لئو ہنے توسا پکاوندی آں"، یعنی تھوڑا سا صبر کرو ابھی توسا پکاتی ہوں۔ اب "توسا" روٹی کے معنوں میں تامل، ملیالم زبانوں میں "دوسا" بمعنی پسے ہوئے چاولوں کی روٹی ہی کی ایک شکل ہے۔ پنجابی اور دراوڑی میں گھر کے لئے بھی مشترک الفاظ ملتے ہیں مثلاً

تامل	کناری	پنجابی
کھولی	کھولی	کھولی بمعنی کوٹھڑی، کھولا بمعنی مکان
تیلگو		پنجابی
الو بمعنی گھر		آلہ بمعنی گھروندہ، آلنا بمعنی کبوتروں اور مرغیوں کا ڈربہ

اسی طرح پنجابی زندگی کے ہر شعبہ میں ہمیں دراوڑی زبان کا عنصر نظر آتا ہے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ پنجابی میں دراوڑی عنصر کی بھرمار ہے ہاں جو حصہ ملتا ہے اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یاد رہے کہ کئی دراوڑی الاصل الفاظ بظاہر سنسکرت سے مشتق نظر آئیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر ایسے الفاظ جو سنسکرت نے مقامی زبانوں سے مستعار لے رکھے ہیں، کیونکہ یہ الفاظ آریائی کنبہ کی دیگر زبانوں میں نہیں ملتے۔

منڈا حلقہ کی زبانیں اگرچہ دراوڑی زمرہ سے بالکل علیحدہ گروہ سے تعلق رکھتی ہیں لیکن قارئین کی دلچسپی کے لئے بعض مثالیں منڈا زبانوں کی بھی درج کی جاتی ہیں

منڈا	پنجابی	اردو
کنڈ، کناپ	کنڈ	کمر

منڈھی	منڈی	سر اور گردن
کھری	کھر، کھری	ایڑی
لوڈو	لوڈا	لڑکا، لونڈا
ڈنگر	ڈانگر، ڈنگر	بیل
چندو	چن، چند	چاند
پانی	پانی	پانی
چاندی	چاندی	چاندی

ان چند الفاظ کے تقابلی مطالعہ سے بخوبی واضح ہو رہا ہے کہ منڈا گروہ کی زبانوں کا کافی ذخیرہ پنجابی لغات میں موجود ہے۔ اب آئیے ذرا سنسکرت زبان اور پنجابی کا بھی باہم تقابلی مطالعہ کرتے جائیں کیونکہ علمائے لسانیات کے ایک گروہ کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ پنجابی زبان سنسکرت سے بہت زیادہ متاثر ہے۔

ڈاکٹر سینی کمار چیٹرجی نے سنسکرت زبان کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ۱۵۰۰ ق م تا ۶۰۰ ق م ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسی دور میں چاروں وید لکھے جا چکے ہیں اور سنسکرت زبان بولنے والے مقامی الفاظ کو اپنا چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ویدوں میں — پھل، نیلا، کل (خوبصورت)، شام، پوجنا وغیرہ الفاظ ملتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ تمام الفاظ تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ دراوڑ خاندانوں کی زبان میں بھی ملتے ہیں۔

دوسرا دور ۴۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ء ہے۔ اس دور کی سنسکرت میں متعدد ہندوستان کی مقامی زبانوں کے الفاظ کی کثرت سے آمیزش پائی جاتی ہے۔ اس لئے پانینی اور ورروچی وغیرہ کو سنسکرت کی صرف و نحو مرتب کرنے کا خیال آیا۔ تیسرے دور میں سنسکرت بالکل نابود ہو گئی۔

مسٹر گراؤز نے "انڈین انٹی کواٹری" کے اپریل ۱۸۷۲ء کے شمارہ میں ہندی کے متعلق ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مذکورہ بالا سنسکرت کے گرامر نویسوں

نے اس زبان میں غیر سنسکرتی الفاظ میں تین حصوں میں تقسیم کیا تھا

۱۔ تدبھو: یعنی جن کا اشتقاق سنسکرت سے ہو مثلاً

سنسکرت	اردو	پنجابی	نیپالی	بنگالی	سندھی
ایکل	اکیلا	اکلا	اکیلا	ایکلا	×
کہپس	کپاس	کپاہ	کپاس	کاپاس	کپاہ
کاپتے	کانپنا	کمبنا	کامن	کانپا	کمبنا
چرم	چمڑا	چم	چمڑا	چامڑا	چم

۲۔ تت سم: یعنی سنسکرت کے ایسے الفاظ جو دوسری زبانوں میں بھی ملتے ہیں لیکن ان کا سنسکرت سے کوئی تعلق نہیں۔

۳۔ دیسی۔ یعنی وہ مقامی الفاظ جو سنسکرت میں شامل ہو گئے۔ جیسے پھل نیلا شام، پوچھنا وغیرہ۔

جان جیمز کا خیال ہے کہ یہ زبانیں (پنجابی، ہندی وغیرہ) بہت قدیم ہیں اور ان میں وہ عناصر بھی شامل ہیں جو کلاسیکی سنسکرت میں نہیں ملتے۔ جے میئو نے اپنی کتاب "اوریجنل سنسکرت ٹیکسٹ" میں بہت سی مثالیں دی ہیں جن میں سے چند ایک معہ پنجابی مترادفات کے یہ ہیں۔

سنسکرت	اردو	پنجابی
پتر، سمندھی	باپ	پیو
اُدر	پیٹ	ڈھڈ
مجبتی	ڈوبنا	ڈبنا
پڑھتیا	ڈھانپنا	ڈھکنا

اسی طرح ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ نے اپنی کتاب "سندھی زبان کی گرامر" میں اس بات کو دہرایا ہے کہ اس میں غیر آریائی عناصر بہت ہیں۔ ان کے خیال میں تین چوتھائی سندھی الفاظ جو ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ سے شروع ہوتے ہیں وہ دراوڑوں کی یادگار ہیں۔

پروفیسر بہن ایک جگہ لکھتے ہیں کہ یہ زبانیں (پنجابی وغیرہ) سنسکرتی عہد میں بھی موجود حالت میں قائم تھیں۔ ان کا خیال ہے کہ مسخ شدہ سنسکرت کے دو خاندان ہیں۔ ایک بہت قدیم یعنی پالی اور سنسکرت ڈراموں کی پراکرت اور دوسرا وہ خاندان جو ہمارے دیکھتے دیکھتے ہندی۔ پنجابی۔ سندھی وغیرہ میں بٹ گیا اور اپنے منبع سے اس کا تعلق بالکل منقطع ہو گیا۔ پالی وغیرہ سنسکرت کی بیٹیاں ہیں اور پنجابی وغیرہ نواسیاں۔

عبدالغفور قریشی نے اپنی کتاب "پنجابی دا ادب تے تاریخ" میں مندرجہ ذیل مثالیں دے کر یہ واضح کیا ہے کہ پالی اور پنجابی آپس میں بہت قریب ہیں۔

پالی	پنجابی	اردو	پالی	پنجابی	اردو
سینگ	سنگ	سینگ	دُدھ	دُدھ	دودھ
سٹھ	سٹھ	ساٹھ	ڈٹھا	ڈٹھا	دیکھا
سپی	سپی	سیپ	آگے	اگے	آگے

مندرجہ بالا طویل بحث سے یہ دو واضح نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں:۔

۱۔ ابھی تک حتمی طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ پنجاب کی قدیم ترین زبان کون سی ہے کیونکہ ہڑپہ وغیرہ سے برآمد ہونے والی تحریریں ابھی تک گونگی ہیں۔

۲۔ پنجابی ہند آریائی زبان ہے اور ہندی سندھی وغیرہ اس کی بہنیں ہیں۔

ایسے الفاظ جن کا تعلق ہند آریائی خاندان سے نہیں ہے لیکن وہ پنجابی میں ملتے ہیں۔ ان کی فہرست اوپر دے دی گئی ہے۔ تاریخی اعتبار سے کول، بھیل، سنتھال اقوام کو یہاں کے قدیمی باشندے سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبانوں کو جیسا کہ اوپر مذکور ہوا منڈا خاندان کی زبانیں کہا جاتا ہے۔ ان کا تقابلی جائزہ بھی اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ ان کے بعد دراوڑ خاندان یعنی تامل۔ تیلگو۔ ملیالم وغیرہ کی باری آتی ہے۔ ان زبانوں میں بکثرت ایسے الفاظ ملتے ہیں جو لہجہ کی خفیف سی تبدیلی کے ساتھ پنجابی میں مستعمل ہیں۔ یہاں پر چند ایسے الفاظ کی فہرست دی جاتی ہے جن کے متعلق ڈاکٹر کالڈویل نے اپنی کتاب "دراوڑ زبانوں کی گرامر" میں لکھا ہے کہ یہ اصل دراوڑ الفاظ ہیں اور ان کا سنسکرت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

مثلاً پنچ (ونپا، سونا)، ولا (ولا۔ گھیرنا) ڈنگ (دل خوبصورت)، کُڈ (کھنڈ۔ سوراخ)، کُو (کونا، بولنا)، پیٹی (صندوق)، کر (گھر۔ ہاتھ)، آکھ (آہنا، کہنا)، کالا (چیر)، سر ڈنگو (سو گھڑنا، سکڑنا)، سگلا (گھرلا، پچھلا)، آلا (والا)، پتر (بوڑھا)، جیسے پنجابی میں بولتے ہیں۔ اہ کپڑا پڑپا ہویا اے۔ یعنی یہ کپڑا پرانا (بوڑھا) ہوگیا ہے۔

اس کے بعد دراوڑ خاندان کی ایک دوسری زبان براہوئی کے الفاظ گنواتا ہوں جو پنجابی زبان میں بھی انہی معانی میں مستعمل ہیں۔

مثلاً کچھ (بغل)، پنی (پنڈلی)، لتر (جوتا)، لوڑ (ضرورت)، لدھ (مویشی کی غلاظت)، چھلا (انگوٹھی)، ہتوم (لہسن)، جوار (غلہ)، وغیرہ

ان مثالوں سے واضح ہوگیا کہ آریوں کی آمد سے پہلے یہاں دراوڑ قومیں آباد تھیں۔ ان میں سے کچھ لوگ تو طاقتور حریف سے جان بچا کر جنوبی ہند کی طرف چلے گئے جو باقی بچے وہ آریوں میں گھل مل گئے اور حملہ آوروں کی زبان اختیار کر لی۔ لیکن اپنی زبان کو بھی نہ بھلا سکے اور انہی کے نشانات اب الفاظ کی صورت میں ہم تک پہنچے ہیں۔

عابد علی عابد نے اپنے ایک مضمون میں پہلوی زبان کے چند الفاظ گنوائے ہیں جو پنجابی میں بھی مستعمل ہیں، مثلاً اِچ (واچک، آواز)، دت (دات، داتہ۔ تحفہ)، واو (وات، ہوا)۔ ان کے علاوہ موری اور موچنا بھی بعینہ پہلوی میں مستعمل تھے۔

یونانی زبان کا لفظ کُڑی بالکل انہی معنوں میں لڑکی کے لئے مستعمل ہے۔

پشتو کے اثر کا اندازہ درج ذیل مثالوں سے لگ سکتا ہے۔ مثلاً ماڑی (بالائی منزل)، پوڑی (سیڑھی)، جندرا (قفل)، لدھن (سالن)، گواہنڈی (پڑوسی)، رمبی، پیڑھا وغیرہ وغیرہ

مرکزی پنجاب میں جو گلاب کو غلاب، نکتا کو نختا بولتے ہیں۔ یہ بھی افغان فارسی کے لہجہ ہی کا اثر ہے۔

اس ساری بحث کا یہ نتیجہ نکلا کہ پنجابی زبان بڑی قدیم ہے۔ اس میں بلا کی لچک اور قوت آخذہ موجود ہے اور تمام مغربی پاکستان میں بین العلاقائی زبان کی حیثیت کی مالک ہے۔ اس کی حدود پشاور سے کراچی تک اور راولپنڈی سے کوئٹہ تک وسیع ہیں۔ سندھ اور

بہاولپور کی سرائیکی تو مسٹر بیمبرک لہندی زبان ہی کا دوسرا نام ہے اور لہندی کا اب اصل منبع و مرکز چکوال، پنڈ دادنخان اور اعوان قاری کا علاقہ ہے۔ لہندی ہی کا دوسرا نام دھنی والی ہے۔

یہاں پر ایک اور غلطی کا ازالہ بھی ضروری ہے اور وہ غلطی یہ ہے کہ عموماً پنجابی کو سکھوں کی بولی قرار دی دیا جاتا ہے حالانکہ پنجابی کو سکھوں کی بولی کہنے والے اگر تواریخ کے اوراق دیکھیں تو انہیں پتہ لگ جائے گا کہ پنجابی سکھوں کے وجود سے کافی عرصہ پہلے سے موجود ہے۔ سکھ مذہب کے بانی بابا نانک دیوجی ۱۴۶۹ء ــ ۱۵۳۸ء) میں ہوئے۔ گورکھی الفاظ ان کے دوسرے گورو انگد دیوجی نے وضع کئے۔ پنجابی کا پہلا شاعر بابا فرید جی (۱۱۷۳ ــ ۱۲۶۶ء) کو متفقہ طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ بھاشا زبان کے پہلے شاعر حضرت امیر خسرو (۶۵۲ ــ ۷۲۵ء) تھے۔ ان سے بھی دو سو سال پہلے سلطنت غزنویہ (۱۱۷۵ ــ ۱۱۹۶ء) کے شاعر مسعود سعد سلمان لاہوری ہو گزرے ہیں۔ جنہوں نے ہندی دیوان بھی مرتب کیا تھا جس کے بارے میں مجمع الفصحا میں لکھا ہے کہ "الحاصل وے راسہ دیوان بود تازی ہندی و پارسی" یہ بھاشا اور ہندی، جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے، بلاشبہ پنجابی ہی تھی۔ اس بات کا ثبوت ایک "باراں ماہ" سے بھی ملتا ہے جو بشہات دیو ندر ستیارتھی آٹھویں صدی ہجری کا ملتانی میں لکھا ہوا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس سے بھی کافی پہلے پنجابی زبان کا اور اس کا ادب موجود تھا جو کہ ہمارے مسلمان حاکموں اور ہندوؤں سے اس وقت کی سیاسی افراتفری اور ملک میں نت نئے حملوں کی بھاگم بھاگ میں سنبھالا نہ جا سکا۔ بابا فرید کا پنجابی کلام بھی سکھوں کی مذہبی کتاب گورو گرنتھ صاحب میں درج ہونے کی وجہ سے ہم تک پہنچا ہے۔ اگر سکھ گورو صاحبان اسے اپنی مذہبی کتاب میں درج نہ کر لیتے تو اس کا بھی ہم تک پہنچنا مشکل ہی تھا۔

ہیر رانجھا کی پنجابی لوک کہانی سلطان بہلول لودھی (۱۴۵۱ ــ ۱۴۸۸ء) کے زمانے کا سچا واقعہ ہے سے

الو الفتح آکھے حضرت کت نوں انہاں مریندے

پکڑ سیال دیو وعلی نوں شرمندہ کت کریندے (مودو)

یہ ابو الفتح لودھی خاندان کے عہد میں کوٹ قبولے کا حاکم تھا جس کی بغاوت کو دبانے

کے لئے شیر شاہ سوری نے ۱۵۴۵ء میں مہابت خاں کو بھیجا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغلوں کے عہد حکومت میں پنجابی خوب پھلی پھولی، دفتری زبان اگرچہ فارسی تھی۔ لیکن پنجابی کو عوامی بول چال کے لئے اپنا لیا گیا تھا۔ شاہ حسین کی کافیاں، اکبری عہد کی پیداوار ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کی مذہبی اور تعلیمی پالیسی کی وجہ سے اس زبان نے بڑی ترقی کی کیونکہ عالمگیر کے عہد میں ابتدائی تعلیم دینے کا ذریعہ ہی پنجابی تھی۔ عربی فارسی کی کئی کتابوں کے پنجابی میں ترجمے بھی کئے گئے۔

اس تحریک کا اثر علاقہ دھنی پر بھی پڑنا قدرتی امر تھا اور یہاں بھی مذہبی حلقوں میں پنجابی زبان کو ترقی دینے پر کمر ہمت باندھ لی گئی۔ اس زبان میں قابل قدر اضافے کئے گئے۔ اس علاقہ میں پنجابی ادب کو بھی ہم تین ہی دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں (۱) ابتدائی دور، ۲۔ وسطی دور اور ۳۔ جدید دور۔

ابتدائی دور شاہ مراد کا

اس دور کی ابتداء جلال الدین اکبر (۱۵۵۶ء۔ ۱۶۰۵ء) کے عہد سے ہوتی ہے۔ کیونکہ میری تحقیق کی رو سے شاہ حسینؒ داماد مولال حسین، جو اپنی کافیوں کی وجہ سے مشہور ہیں اور جن کی زبان لہندی ہے وہ تحصیل پنڈدادنخان ضلع جہلم کے باشندے تھے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون "شاہ حسین دے وسیں اتے زبان تے تحقیقی نظر" مطبوعہ پنجدریا لاہور اور ضمیمہ نمبر ۲ کتاب ہذا) لیکن اگر یہ نہ بھی ہو تب بھی اس دور کا آغاز شاہجہان (۱۶۲۷ء۔ ۱۶۵۸ء) کے عہد سے تسلیم کرنا تو یقینی ہے۔ اس دور کی قیادت کا سہرا بھی حضرت شاہ مراد کے سر ہے۔ جن

کے متعلق سیف الملوک کے خالق میاں محمد بخش صاحب نے یوں فرما رکھا ہے۔

شاہ مراد جنہے دے کہتے سخن مراداں والے   محبوباں دے جنڈ لہاون واہ مثاں دے چالے

باوا صاحب کا پنجابی کلام بھی گلزار شاہ مراد میں موجود تھا جسے اب بزم ثقافت چکوال نے "کلام شاہ مراد خانپوری" کے نام سے جدید ترتیب سے شائع کر دیا ہے اور عام ملتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ مراد صاحب ایک ہمہ گیر قسم کی شخصیت کے مالک تھے ان کے کلام سے تقریباً تمام اصناف سخن کی نشاندہی ہو سکتی ہے مثلاً کبت۔ بینت، دوہڑے بھگوارے۔ بارہ ماہ، مثنوی، چوپہگے۔ مدح۔ مناجات، حشر نامہ، چوہرڑی، چرخہ اور غزلیں۔ ان کے کلام پہ حسن نادیدے سے بھی نظر دوڑائی جائے۔ ع

کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جاں اینجاست

۲۔ **پیلو** (وفات ۱۶۷۵-۶ء) چکوال کے ایک گاؤں مہر و پیلو کا رہنے والا تھا۔ پیلو گاؤں کی بنیاد رکھنے والا وہ خود ہی تھا۔ اس لئے، اسی کے نام سے گاؤں مشہور ہوا۔ اپنے گاؤں کی تعریف میں کہتا ہے ؎

مہر و پیلو رانگی تے بادشاہاں دی جا   گھیو بہتا دودھ تھوڑا تے پانی شاہو دریا

وہ ایک درویش منش انسان تھا۔ اکثر سیر و سیاحت میں مصروف رہتا جس کی وجہ سے اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ پیلو کے کلام کی داخلی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ پیلو شمال میں دریائے ہرڑہ سے جنوب میں بھیرہ تک پھرتا پھراتا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

۱۔ ہٹّی ویکھ بلوچ دی پیلو بھل گیا
چلاں رنگ برنگیاں دا راچوڑ پیا

۲۔ پیلو چڑھیا ڈھک تے مارے نظر کھلو
اوو وگے سندھ دریا اوو وگے ہرو
پچھوں بنا سمندر دی جو بیچے سو ہو

۳۔ نہ اساں بھیرے گھتا نہ آون دی نیت
تون نرٹن کیٹریاں اتوں جو سے میت

نہ کھنڈ نہ دہڑی نہ دھنو دی ریت
پیلو پا کوئی سُست امام ہے یا سر دار پیت

اسی طرح پیلو کی حاضر جوابی اور جگت بازی کے بھی کئی قصے مشہور ہیں، جن کا ذکر علامہ راقم اپنی پنجابی کتاب "اچھلاں دی کھاری" میں کر رہا ہے، پیلو پہلا شخص ہے، جس نے پنجابی کی مشہور لوک کہانی مرزا صاحباں کو پہلی بار نظم کا جامہ پہنایا اس کے علاوہ مقامی طور پر ایک سی حرفی بھی پیلو سے منسوب ہے، پیلو کا قصہ مرزا صاحباں وار طرز میں ہے، جس کا یہ بند بڑا مشہور ہے۔ ؎

چڑھدے مرزا خان نوں جٹ ڈھبل دیندا مت
بھٹھ رناں دی دوستی کھری جنہاندی مت
ہس کے لاندیاں یاریاں رو کے دیندیاں دس
پئے پٹاون یار دے سینے وسے کے لت
جس گھر لایئے دوستی ہول نہ گھتیے لت
ٹپیں بھتہ نہ آوندی دانش منداں دی پت

یہ قصہ پنجابی ادبی اکادمی لاہور کے اہتمام سے اب چھپ چکا ہے، علاقہ زیر بحث میں پیلو کے اشعار زبان زد خاص و عام ہیں، اور آج تک دیہات کے لوگ انہیں اپنی محفلوں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، ان اشعار میں جذب و مستی کی بھرپور کیفیت ہے، حسن و عشق کے رموز و اسرار ہیں، اور روز مرہ کی دانش مندانہ باتیں بھی :

ج - جس رکھ دا پھل کھایئے سک جائے تے اس نوں ساڑیئے نہیں
جنہوں یار کہیے اس دے نال رہیے اڑ جائے تے متوں ساریئے نہیں
جہڑا قول زبان توں کہہ دیئے مر جایئے تے اس نوں ہاریئے نہیں
پیلو غم کھانا کم اے عاشقاں دا نیئں تے عاشقاں وچ دم ماریئے نہیں

قصہ مرزا صاحباں اور اس سی حرفی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے، کہ اگرچہ پیلو ایک نیم خواندہ شاعر تھا، لیکن تحقیقی ذہن کا اور طبع رسا کا مالک تھا، اپنی فطری جوہروں کی بنا پر اس نے اپنے شاعرانہ کمالات کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجایا، اور بڑے بڑے عالم اور صوفی شعراء نے اس کی شاعرانہ عظمت

کو خراج تحسین پیش کرتا ہے، حافظ برخوردار (وفات ۱۷۲۷ء) پیلو کا شاگرد خاص یوں کہتا ہے ؎

یارو پیلو نال برابر ہی شاعر بھل کرین ۔۔۔ جنہوں پنجاں پیراں وی تھاپنا کنڈیں دست دھرین

مولوی احمد یار مرالوی (۱۷۶۸ء - ۱۸۴۸ء) کی رائے یہ ہے ؎

پیلو نال نہ دلیں کسے دی اسو چ سوز علیحدی

مست نگاہ کیتی اُس پاسے کسے فقیر ولی دی

موجودہ صدی کے نامور شاعر میاں محمد بخش (وفات ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء) مصنف سیف الملوک بھی فرماتے ہیں ؎

پھر دی پھری گل اکھی لیکن جو اکھی سو سچی

ستھرا پیلو پہلے ہویا ہٹ نہ ہین جس کچی

(مزید حالات کے لئے دیکھئے راقم کا مضمون پیلو، مطبوعہ ماہنامہ پنج دریا لاہور ساٹھ بابت ماہ جنوری ۱۹۶۵ء)

۳- شاہ چراغ چوہانوی رح (وفات تقریباً ۱۸۰۵ء)

کے متعلق سیف الملوک میں یوں آیا ہے ؎

شاہ چراغ ہوئے اک سید دیوا دین دنی دا

دھنی ملک مکان انہاندا وچ چہان سنیدا

آپ گیلانی سید ہیں، آپ حضرت غوث الاعظم بغدادی کی نسل سے ہیں۔ آپ سلسلہ حانی مسلک کے لحاظ سے قادری اور حضرت حافظ امام دین صاحب ساکنہ ڈھونگ نترال کے فیض یافتہ ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد موضع سوک تحصیل و ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد کا نام سید شاہ مراد اور دادا کا نام شاہ اسماعیل تھا جن کی قبر موضع سوک میں موجود ہے۔ وہاں کے لوگوں کی بدعہدی کی وجہ سے آپ ترک سکونت کر کے موضع کنڈ جنگل واقع علاقہ پوٹھوہار میں چلے آئے۔ بعدہٗ علاقہ دھنی کے موضع چوہان (چہان) کو مستقل رہائش کے لئے اختیار کر کے یہیں پہ دفن ہوئے۔ آپ کی کثیر اولاد موجود ہے۔ آپ پنجابی کے بڑے عمدہ شاعر تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ نے ایک مخیم

دار بھی لکھی تھی، جو کہ اب ناپید ہے:

زبانی روایت سے آپ کے کلام کے چند نمونے دستیاب ہوئے ہیں، جنہیں راقم نے شائع کر دیا ہے:

نمونہ کلام ؎

اوفسیاں پائیں کاگ اُڈائیں تھک گئیاں نتڑی دیاں بائیں
رہ چکی ہیں حال حوالاں کھاون چینوں خواب خیالوں
تتی نوں بر سعل سوہن نیئں و بندانت اُٹھ کردا شور کہائیں
پیاریا مے مڑ آ کدائیں تد مدہ باجھوں جی رہندا نائیں

چشم چراغ جہاندے دیدے ادہ کیوں بالن من وچ ویدے
سید چراغا عشق جہاندی ہڈیں رسیا ادہ بن شرابوں کیوے

۴- شاہ میر غلام ؒ

آپ حضرت شاہ چراغ کے بیٹے تھے، آپ بھی شاعر تھے، لیکن کافی جستجو کے باوجود سوائے ایک کافی کے آپ کے کلام کا کوئی اور نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا:

ہو آئی بانسری سیندی آکڑیاں بجدی   رانجھڑ دی محبت کارن سدھ نہ رہی میںوں لجدی
سئیاں وچوں چھڈ چرکھڑا باہر آئی بھجدی   میر غلاماں میںوں رانجھڑ ملیا گھڑدی لوڑ دھی جدی

۵- شاہ شرف مریدوی

علاقہ دمنی اور دہنار میں اپنے پرسوز دوہڑوں کی وجہ سے شہرت عام کے مالک ہیں، آپ کی پیدائش بہادر شاہ ظفر آخری مغل تاجدار (۱۸۵۷ء) کے زمانے میں ہوئی، آپ کا مولد قوطعہ پور سہتی (علاقہ دہنار) ہے، لیکن آپ نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اپنے جدی گاؤں موضع مرید میں

گزارا اور یہیں پر سپرد خاک ہوئے آپ کے باپ کا نام سید سلطان علی شاہ تھا،

آپ فطری شاعر تھے، اور طبیعت میں بلا کا زور تھا آپ نے اپنے کلام کے کئی مجموعے مرتب کئے مثلاً مناظرہ جھنجن و بیر بل، مناظرہ بوچھا اور سانگ، نیز ایک قصہ ہیر رانجھا بھی لکھا تھا، جس کے بندوں کے ہر چوتھے مصرعے میں قرآن شریف کی کوئی آیت یا حدیث نبوی کا کوئی ٹکڑہ باندھا ہوئے تھا، افسوس کہ کچھ ان کی اولاد و اخلاف کی لاپرواہی اور کچھ مذہبی تعصب کی بدولت سوائے چند دوہڑوں اور مناظرہ بوچھا و سانگ کے سب ضائع ہو چکا ہے،

شاہ صاحب کے دوہڑوں سے پتہ چلتا ہے، کہ آپ کی طبیعت میں سوز و گداز صوفیانہ حقائق و معارف، مبتذل قسم کی حزنیت، اہل دنیا کی بے وفائی، دنیا کی بے ثباتی اور نامساعدت حالات کے باوجود امید پرستی اور ذوقِ جمال کا عنصر وافر مقدار میں موجود تھا، دوہڑوں کی زبان خالص وصنی لیہ کی نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ دو ہار کی رعایت سے کسی قدر ٹھوچی کے رنگ میں رنگین ہے، بالفاظ دیگر خالص لہندی بولی ہے نمونہ کلام ہے

ڈیہاں سر پہنچ تے ڈیکھ پلے وچ تاں کس ملی کریساں

چارے پلے بیرے چکڑ بھرے ہن تاں کہڑا مل وصاں

صاحب تھوڑالے نہیں ملگ منیری ہتھ وچ کھیاں تے بھوساں

شاہ شرفا حلیم ماہی بن تاں پانڑیاں گل روساں

"مناظرہ بوچھا تے سانگ"سے ایک بند ہے

اول صفت خدا دی پہلے جس نے جگ آپایا

بوچھے نوں اس زور دی سانگاں طعنے مار اٹھایا

ویسے طعنے بہتر وڈی بوچھا ساڑ پکایا

بوچھے وڈی لوریتہ اٹھائی آسانگے تماشہ جگایا

شیخ نور دین

شیخ نور دین کا مفصل تذکرہ فارسی باب میں ہو چکا ہے، آپ پنجابی کے بھی شاعر تھے، آپ نے

اپنے مرشد میاں نیک محمد صاحبؒ کی مدح پنجابی میں لکھی ہے، جس کا ایک بند بطور نمونہ کلام پیش ہے:

قربان ہوواں صدقے جانیاں میں اپنے پیر دے نام توں لکھ واری
میرے پیر جیا کوئی پیر ناہیں جس تے گھول گھتاں اپنی جان پیاری
جیہدے شان مراتب غوث والے اوتاد تے قطب تکیں ہین بھاری
تھیوین ڈھیوڈی شالا وسدا رہے جتھے نور نبی دی لئے لہر جاری

اس عہد کے ایک اور شخص کا حوالہ احمد حسین احمد قریشی صاحب کی تصنیف پنجابی ادب کی مختصر تاریخ کے صفحہ ۶۲ پہ ملتا ہے۔ ان کا نام محمد سعید تھا، آنکھوں سے نابینا تھے، چک ملوک علاقہ دھنی نزد چکوال، اپنا وطن بتاتے ہیں، شرعیات میں علم قرأت کا رسالہ آپ کی تصنیف ہے:

وسطیٰ دور قاضی عبدالحلیم کا

۱- قاضی عبدالحلیمؒ! آپ وسطی دور کے سرخیل بن قاضی صاحب ڈھاب کلاں تحصیل چکوال کے رہنے والے تھے۔ آپ کا تخلص قاضی اور حافظ ہے۔ آپ ایک ہمہ صفت موصوف اور جامع جمیع علوم شخصیت تھے، آپ اپنے زمانے کے نہ صرف ولی اللہ حکیم حاذق اور عالم بے بدل تھے، بلکہ آپ پنجابی زبان کے بہترین شاعر بھی تھے، فی البدیہہ کہتے ہیں آپ کا ثانی مشکل سے ملے گا، آپ عربی میں بھی شعر کہہ لیا کرتے تھے، قاضی صاحب کے والد کا نام حافظ فتح نور تھا، معہ آپ خانوادہ کہوٹ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ حافظ صاحب ۱۰۵ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ قاضی صاحب بھی اپنے والد کی طرح طویل العمر ہو گزرے ہیں، آپ کی وفات ۱۲۴۳ھ میں ہوئی اور ڈھاب کلاں میں ہی مدفون ہیں، آپ حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ (۱۷۹۹ء - ۱۸۸۲ء) کے مرید و خلیفہ تھے، آپ کے ایک طویل منظوم خط کا ایک حصہ یہ ہے:

واہ واہ مرشد کامل اکمل عزت حرمت والا — شمس الدین مبارک جس دے وچ سیال اجالا
ککھے چم کرے بلہاری نظر کرے جان بھر کے — ڈبی بیڑی غفلت والی بنے لائے پھڑ کے
ایڈ علاج نہیں ڈٹھا کوئی وانجھو ہادے پچھے — غفلت دے گرداباں وچوں کڈھ گھنے جان بچے
مرشد جنید الناس جنہاں دی وطن جنہاں ذات قریشی — وچ تہ ہین اساناں مارے وحدت والا جھولنا

قاضی صاحب کا کلام اکثر چار بتیوں پر مشتمل ہے، لیکن ان شعروں اور چار بتیوں کا تعلق کسی خاص واقعہ سے نہیں ہے، جو کہ شان نزول کی حیثیت رکھتا ہے، کلام کی غایت پند و موعظت اور اصلاح عامہ ہے، نمونہ کلام ہے

قلعہ رھتاس دیکھ کر

کدھر گئے اُو راول جوگی نادھنگ سناسی ۔۔۔ دعوے تنہ فرعونے والا چلے ہو اداسی
سدا نہ چنبے وچ گلزاراں سدا نہیں گل باسی ۔۔۔ جے اعتبار نہ آوے قاضی قلعہ ویکھ رہتاسی

ایک مرید کے نافرمان بیٹے کے نام رقعہ

کشمیرے ہمیں بی منگایا ست برگے گل لائے ۔۔۔ گل پھول کیارے کیتے نیئے ہتھاں نوں چھالے
دل وچ اِہ تمنا ہیسی جے رب گل وکھالے ۔۔۔ گلاں اگوں پھل وکھائے گر گنڈے والے

(وفات ٢-١٩٠١ء) آپ موضع بھالہ (نزد ڈھڈیال)

٢- میاں نواب بخش کشمیری! تحصیل چکوال کے رہنے والے تھے، ابتدائی تعلیم مسجد ہی میں مکمل کی، کہا جاتا ہے، کہ آپ بڑے خوش خط تھے، قاضی عبد الحلیم سکنہ ڈھاب کلاں کے مرید و معتقد تھے، قاضی صاحب کی وفات پر آپ پہ آپ کا کہا ہوا، ایک بند درج ذیل ہے ؎

ش۔ شمع روشن ڈھابے وچ جہڑی جا موت والی پھونک مار گئی آ
جہڑی کشتی سی پار نوں کھڑن والی اَہ تے ٹھگو اٹر سی پار گئی آ
جہڑا باغ بہار وچ ڈھاب کھڑ یا پئی خزاں تے چمن اُجاڑ گئی آ
میاں نواب بخشا قاضی صاحب باہجوں اج دھن ساری مہنے بھار پئی آ

(پیدائش ١٩١٥ء شہادت ١٩٢٧ء) شمع رسالت کا پروانہ

٣- غازی مرید حسین موضع بھلہ (نزد چکوال)، کے چوہدری عبد اللہ خان قوم کھوٹ قریش کا فرزند تھا، میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول چکوال سے پاس کیا، چونکہ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا، اس لئے خانگی ذمہ داریوں اور نمبرداری کے جنجال کے پیش نظر آپ کو مزید تعلیم

کا سلسلہ ختم کر دینا پڑا، آپ طبع موزوں کے مالک اور پنجابی میں خاصے اچھے شعر نکال لیتے تھے، ہایم اپنا تخلص کیا کرتے تھے،

"پھولوں کے گدھے" کے بدنام ڈاکٹر رام گوپال کو قتل کر کے آپ نے ۱۹۳۰ء میں جام شہادت نوش کیا، آپ کا کلام سی حرفی کی شکل میں ہے، جس میں عشق حقیقی کے اسرار و رموز شناخت مرشد و بیعت مرشد وغیرہ کے لوازمات کو بڑے موثر اور دلکش انداز میں شعر کی زبان میں بیان کیا ہے:

نمونہ کلام۔

۱۔ آ ماہی گل لا ماہی کر دے رحم نہ جی ترسا ماہی

پا یا غماں دی فوج نے آن گھیرا جلدی پہنچ تے آن بچا ماہی

تیرے ہجر کٹاری ماری وچ سینے وار و درد جگر دی پلا ماہی

ایہم ایہو وادم آخیر والا پھیری پا تے مکھ وکھا ماہی

۴۔ سید رنگ علی شاہ گیلانی ! آپ (۱۸۹۴ء) شاہ چن چراغ چوہان کی اولاد سے ہیں، آپ مدرس رہ چکے ہیں، بڑے خوش شکل اور خوش خط رنگ ہیں، آپ کی نظر جواب دے چکی ہے، لیکن بلا کا حافظہ ہے شعر و شاعری کا ملکہ فطری و موروثی ہے، آپ کا لکھا ہوا ایک مختصر ترین بارہ ماہ بطور نمونہ کلام درج کیا جاتا ہے

چیتر چاہ بلیا کھ بہار گزرے جیٹھ جالیاں گم پنسالیاں وسے

ہاڑھ کراں ہاڑے ساون باجھ پیارے بھادروں بھا فراق دی جالیاں ئے

اسی آس کتک اداس ہو کے مگھر ہاں کو ماں چادرے بھالیاں وسے

گئیاں گزر ہے روندیاں رنگن بھیرا پوہ ماہ پھگن دانتیں کالیاں ئے

۵۔ سید جلال شاہ ہمدانی ! نقشبندی قادری موضع جلبوال تحصیل چکوال میں پیدا ہوئے، آج کل آپ ہمن آبالی تحصیل پنڈ دادنخان میں مقیم ہیں، آپ بھی پنجابی کے اچھے شاعر ہیں، کلام صوفیانہ رنگ کا ہے، آپ کا شتر نامہ مطبوعہ شکل میں ملتا ہے،

نمونہ کلام ے

حمد ہزاراں باجھ شماراں خالق پاک جو عزوجل

واحد لا شریک کہاوے جس دی جان نہ ہور مثل

اول آخر ظاہر باطن حاضر ناظر ہر محل

خالق مخلوقاں دا مالک بہت غریب نواز عادل

رازق رزق پہنچاوے ہر نوں دن تے رات تمام سنبھل

کیڑی فیل سمیر خاں تائیں ہر نوں یاد رکھے پل پل

نفس امارہ شتر آوارہ پھر دا وچ تھل مارو تھل

حرص ہوا دیاں جنگلاں اندر ہر دم پھرے چرینداچل

بے پرواہ محبوب پیارا جھوے چڑھ کر وچ محمل

پر سید جلال نہ ہمت ہاریں اوڑک ہوسی مشکل حل

میاں صاحب نے اللہ دتہ بلا بلیکہ مکہ میانی کی ہیر رانجھا کی منظوم

۶ - میاں غلام قادر جبیر پوری ! داستان کی تصحیح کر کے اسے شائع کیا ہے، یہ قصہ ہیر رانجھا بڑی آسان اور رواں زبان میں لکھا گیا ہے، جسے عوام اور خصوصاً دیہاتی نیم خواندہ اور ان پڑھ لوگ بڑے شوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں، زبان پر وحنی والی کا اثر غالب ہے، ضرب الامثال اور دنیاوی دانشمندانہ باتوں کی بھرمار ہے، نمونہ کلام ہے

جواب ہیر

پکے گئیاں گل مکدی ناہیں جے دل توں نہ مکایئے وے

گئے گئیاں گت ہوندی ناہیں توڑے داڑھی مچھ منایئے وے

گنگا گئیاں وت پاپ نہ لہوندے توڑے سے سے ٹبیاں لائیے وے

موئے جہانوں مڑ نہیں آوندے توڑے رو رو حال ونجایئے وے

کانواں تھیں وت ہنس نہیں ہوندے توڑے موتی چوگ چگایئے وے

سپاں دے پتر متر نہیں ہوندے توڑے چلیاں دودھ پلایئے وے

کمیاں تھیں وت ذاتھ نہ ہوندے توڑے کرسی چا بہایئے وے

قاضی رن وگڑے وت نہیں وسدی توڑے سنگلاں نال بنھایئے وے

جدید دَورِ عبدالرحمٰن درؔد کا

اس دور میں مولانا ممتاز علی، شورش ملک، ماجد صدیقی، عابد جعفری، باغ حسین کمال، انجم ضیائی قاضی محمد اکرم لعسعید فتح یوسفی وغیرہ شامل ہیں:

۱۔ محمد عبدالرحمٰن درؔد بمقام سوال ڈاک خانہ ڈھڈیال تحصیل چکوال میں ہوئی آپ آج کل راولپنڈی المعروف بہ درد علی شاہ قلندر قادری آپ کی پیدائش ۱۹۱۰ء میں میں مقیم ہیں، ۱۳ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا آپ کا خاندان حاجی کہلاتا ہے، لیکن اب دو پشتوں سے قاضی کہلاتا ہے، آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔

قصص المحسنین، چمن بادشاہزادی، شیریں فرہاد، گھگھو کاں لطیفہ، منظوم علمیات، اسرار خفی، دفائف، پیران پیر، مصر کا جادو، ارح تسخیر ہمزاد، رب کی پہچان، ذبح المغرب، رموز عشق، کشف الانوار وغیرہ،

ان میں سے بعض سیٹھ آدم جی عبداللہ اینڈ کمپنی بمبئی والے نولکھا بازار لاہور اور بعض شوکت بکڈپو مسلم بازار گجرات سے مل سکتی ہیں، نمونہ کلام ؎

انتخاب از رموزِ عشق

آساقی بھر دے اسانوں جام بھرے جمشیدوں
پیواں نخیواں مستی اندر عید کراں اس عیدوں

حال عشق دا لکھن دیلے چا اک جام پلا دیں
آب زلال کمال پلا کے کر کے مست نچا دیں

پر جاں بت من دی نگری بہ کے خلوتخانہ تے
جیں تن لگیاں اسنوں پیڑاں جیسے لوک بگانے

مستاں دی جو حالت مسلم کی اغیاراں تائیں
یا او ہ جانن یا او ہ جانن یا او ہ جانن سائیں

بن خفیاں دے ساری تیاں کہن سیانے دردؔا
سیتاں دے گھر کیڑے جھڑے لوک کہاوت کردا

انتخاب از مسدس

جو آیا اس دنیا اندر اوس نے خاک سدایا
کر کر اکڑ تے مغرور دی دوری حسے در آیا

رتی رہی نہ اکڑ ہر گز آجد موت نوایا
عبدالرحمٰن جیہاں بھی ہکدن ہونا خاک حوالے

رہ جا سن اس دنیا اندر شعر ساڈے متوالے
سدھ گھلسی جد موت اسانوں ہوساں گور حوالے

۲- **مولانا ممتاز علی!** ایم اے، بی ٹی، آپ ۱۹۰۶ء میں موضع بھوں میں پیدا ہوئے، آج کل گورنمنٹ ہائی سکول چکوال میں پڑھاتے ہیں، صوفیانہ مذاق رکھتے ہیں روحانی مسلک کے لحاظ سے چشتی ہیں، عمر خیام اور سرمد شہید کی فارسی رباعیات کا پنجابی نظم میں کامیاب ترجمہ کیا ہے، آپ کے یہ منظوم ترجمے ماہنامہ پنج دریا لاہور، میں شائع ہوتے رہتے ہیں، نمونہ کلام ہے

رباعی عمر خیام

رندے دیدم نشستہ بر روئے زمین — نے کفر نہ اسلام نہ دنیا و دین
نے حق نہ حقیقت نہ شریعت نہ یقین — در ہر دو جہان کرا بود زہرہ این

منظوم ترجمہ

ہک جائی سی بیٹھا ہویا ایساست قلندر
دین دنی تھیں فارغ ہویا نا سے مسجد مندر
حق حقیقت شرع شریعت اسنوں دور دوراڈے
دو ہیں جہانیں جگرا ایڈا یارو کس دے اندر

۳- **شورش ملک!** مفصل حالات حصہ اردو ادب میں درج ہیں۔ نمونہ کلام ہے

نی سیئے، میرے سوہنے میٹھے منہ وچ پا پو کھنڈ
نی میں ست اسمانوں ویکھیا میٹھے وں لوں پے گئی ٹھنڈ
میں جھنگ گجرات نوں ویکھیا میں ڈٹھا شہر بھنبور ہے
نی اوہ سبھے کیدوں نس گئے اوہ حسن عشق دے چور
جنہاں بھنے چرخے رانگلے تے لئے پکے گھڑے چرا
جہڑے راتیں پنوں دے گئے بھجڑے ویر شہیر بھرا
جنہاں ساڈیاں ہڑیاں جوڑ کے لئے اپنے محل اسار
اوہ اج پئے نظریں آوندے میں نوں ست سمندروں پار۔

یاد

جد لوک خیالیں وچ جاسن — آساں دے دیوے بجھ جاسن
جد ہجر دے گھپ ہنیرے وچ — دل روسی اکھیاں سیج جاسن
تیری یاد جنہاں وچ چھل بن کے — ساڈے پیار نوں بنے لا جاسی
تیری یاد عیدی دا چن بن کے — ساڈی راتاں نوں چمکا جاسی

۴- عابد جعفری! آپ کا اصل نام اللہ داد خان ہے، تاریخ پیدائش ۲۴ اپریل ۱۹۲۴ء ہے، مولد و مسکن منگو وال تحصیل چکوال ہے، گاؤں کے مدرسہ ہی میں پڑھاتے ہیں، شاعری ورثہ میں پائی ہے، بڑے عمدہ ترنم کے مالک ہیں، آزاد نظم خوب لکھتے ہیں، نمونہ کلام ؎

انتخاب از خوابِ خیال

تیرے عشق دے طوبے دی چھاں تلے نیندر رجی اکھاں اندر آئی ہوئی سی
نیندر اک مشوم ولاسڑا سی اصلوں شوق دی اکھ متاثی ہوئی سی
تیریاں راہواں دا اک اک ذرہ روشن کہکشاں دی جیویں شرمائی ہوئی سی
میرے گھر دیاں کالیاں کدھاں تے وی چن چانن دی لیپ چڑھائی ہوئی سی
جیویں دیلے دی کلو تیرا سنے میریاں سدھراں دی سیج سہائی ہوئی سی
میرے دل دیاں یخ سمندراں دی ہر ہر لہر جیویں گرمائی ہوئی سی
تری جنت تیں سے میرے گھر تکیں عجب نور دی جلوہ نمائی ہوئی سی
میرے قبر ورگے تنگ ویہڑے اندر گل دی کل خدائی سمائی ہوئی سی
ستیاں سفنیاں دی جدوں اکھ کھلی اکھیاں ساون دی واچھڑ وسائی ہوئی سی
میرے ہتھ تحریر تقدیر دی سی جیہڑی ازل توں لکھت لکھائی ہوئی سی

۵- انجم ضیائی! ہ اصل نام غلام محمد، باپ کا نام امام بخش، تاریخ پیدائش ۱۵ اپریل ۱۹۴۰ء مستقل رہائش منگو وال تحصیل چکوال میں ہے، پنجابی نظم خوب لکھتے ہیں ؎

نمونہ کلام ہے

تیرا اسد سنہیڑا سے کے — آوندی نیئں کوئی رات
حسن تیرے دے ویہڑے اندر — کیکن پاواں جھات
ہائے شوہ وچ ٹھیل کے بیڑی — پار کنارے جاواں
یا اس کنڈے بہہ کے — اپنا سر گوڈیاں وچ پاواں

۶- عبدالحمید! شیخ گڈ ہوک خاندان کا یہ فرد اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان بحری جہاز کے ذریعے جا رہا تھا، لیکن راستہ ہی میں بیمار پڑ گئے اور انگلستان پہنچتے ہی راہی ملک عدم ہو گئے، آپ نے عدن سے ایک منظوم خط اپنے بھائی کے نام لکھا تھا، جس کا اقتباس درج ذیل ہے ہے

سینہڑا

پہلاں آکھیئے حمد خدا نائیں، جس نے قدرتاں عجب بنائیاں او
فیر لکھ درود رسول تائیں جس دے باہجھ نہ پشت پناہیاں او
رہیا دے نوں دکھ ایہہ وارثہ دی باہاں گلے دے وچ نہ پائیاں او
لیا کدھ نہ مول بخار دل دا چکیاں درد دے نال نہ لائیاں او
کھڑیا باغ پیاریاں ساریاں دا مالی چھڈ ٹریا واباں لائیاں او
پانی شوق دا دیئں توں بوٹیاں نوں کلیاں مول نہ رہن کملائیاں او
میرے جگر دا سوز نہیں گھاٹ ہوندا نیئں ہوندیاں ختم لکھایاں او
بس کر حمید ہن شام ہوئی وایئں عدن دیاں اگوں آئیاں او

۷- بابا حسین کمال! مفصل حالات صعہ اردو ادب میں درج ہیں، پنجابی کلام کا نمونہ یہ ہے ہے

ٹوٹہ	چھلے
نہ منصور تے نہ میں رانجھا	کی تیکر تے دیکھ کے اسنوں
بانہہ تھوڑی ہن نہ بساں	چھینے وانگوں کھڑ جاندا ساں

کیہ آں میں ؟
ڈوریاں مجبوریاں
مڑ مڑ اپنے آپ نوں
تکاں

پر آج سے کیویں کہواں
چاوندا آں اوہ نظر نہ آوے
لبھیا اوہدے کولوں اپنوں میں
اشنائی دا اچھل
ایہہ سی میری بھل

غزل کے چند اشعار

میں تاں لیکھیں ہر یار دروانویں حال ونجاواں — چن جیہی اوہ حسن دی مورت اپنے آپ سجاواں
اکھیاں دے وچ ترِدے اتھرو سبھ کجھ دس دیندے نے — میں تے یار دے دل اپنے دا بھیت لکاواں
اپنا درد تے اک پاسے وے میں اوہنوں گما لاں — لوکاں جیہے دکھاں نوں وی ہس ہس نال لگاواں

۸۔ نام ۔ عاشق حسین

قلمی نام ـــــ ماجد صدیقی
مولد ـــــ نور پور سیٹھی
تعلیم ـــــ ایم اے
سال پیدائش ـــــ ۱۹۳۸ء

ماجد علاقہ ونہار میں پیدا ہوا، میٹرک کے بعد اس نے گورنمنٹ کالج چکوال میں داخلہ لیا، یہاں کے ادبی ماحول نے اس کے فطری ذوق سخن کو نکھار بخشا۔ اس نے ابتدا اردو سے کی، مگر جلد ہی اس نے اپنی مادری زبان کو اپنے محسوسات وخیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اس نے پنجابی میں بے ڈکاں لکھا، اور بہت جلد ملک کے پنجابی زبان کے صف اول کے شعراء میں شامل ہو گیا، اس کے گہرے مشاہدے، باریک بین نظر، سوچ کے تیکھے پن، زبان کی مٹھاس اور لہجے کی کھنک نے اسے ایک خاص قسم کی انفرادیت بخش دی ہے۔

اس کی پنجابی غزلوں اور نظموں کے دو مجموعے "وتھاں ناپدے ہتھ" اور "سوہناں لیندی اکھ" زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں، ماجد کی اردو و پنجابی نظمیں، کہانیاں اور مضامین، ماہ نو، استقلال، لیل ونہار، نصرت، سویرا، ہلال، امروز، جنگ، تعمیر پنجابی ادب، پنج دریا اور لہراں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

نمونہ کلام ے

اوہلا

دل دے بوہے نوں کھڑکا دے — دکھ دا لیٹے وار
آس دیاں سب جیباں خالی — اپنے ہون نوکراں
ماج بدل کے آکھاں اونوں — ہ گئے نہیں کدھرے باہر"

باب (۵)

دھنی کی لوک کہانیاں

۱۔ شمس رانی اور ڈھول بادشاہ :۔ یہ دھنی کی زبان پر ورسر زمین کی ایک طربیہ کہانی ہے۔ جس میں ہیرو اور ہیروئن بہت زیادہ دکھ تکلیف برداشت کرنے کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے دکھائے گئے ہیں۔ اس کہانی میں بہت سے سیاسی۔ سماجی۔ اخلاقی نفسیاتی اور مابعد الطبیعیاتی نکتے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے۔ کہ ظالم اور خود غرض حاکم ملک کی تباہی و بربادی کا سبب ہوتا ہے۔ اور رحم دل و رعیت پرور حکمران مملکت کی خوشحالی اور آبادانی کا باعث۔ دنیا پرستی انسان کو اس قدر کانا اور اندھا کر دیتی ہے۔ کہ بسا اوقات انسان قطع رحمی پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کے برعکس سچی محبت کرنے والا انسان بڑے سے بڑے دشمن کو دوست کے حوالے سے دوست سمجھ کر اس کے ساتھ باہم شیر و شکر ہو جانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتا۔

علاوہ ازیں اس کہانی سے خطہ دھن کے فرزندوں کی چند عمومی خصوصیات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ کہ یہ لوگ بڑے فراخ دل بلند حوصلہ، بامروّت اور مہمان نواز واقع ہوئے ہیں ان کی دوستی اور دشمنی، محبت اور نفرت شدید نوعیت کی ہوتی ہے۔ محبت کو نباہنے اور دوستی کو پالنے کے لئے یہ لوگ بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ان کے کردار کا ایک سلبی پہلو یہ بھی ہے۔ کہ یہ لوگ بڑے ضعیف الاعتقاد اور ماورائی قوتوں کے پرستار ہوتے ہیں۔ عام پنجابیوں کی طرح اہلیان دھنی بھی سفر یا کسی اور اہم کام پر جاتے وقت نائی کے سامنے کو بدشگونی سمجھتے ہیں۔ اس کہانی میں فارسی روایت۔ کے برعکس عشق کا اظہار

عورت کی طرف سے کیا گیا ہے۔ جو کہ ہندی اور مقامی شاعری کی خاص روایت ہے۔ خطہ دھنی کی یہ ایک ایسی زبردست کہانی ہے۔ کہ اس نے لوک گیتوں میں ڈھولے کی صنف اور لوک ناچوں میں سمی کو جنم دیا ہے۔ جو کہ آج سارے سابق پنجاب کی ثقافتی زندگی کے اہم اجزا تصوّر ہوتے ہیں۔

تاریخی طور پر اس کہانی کی تخلیق امیر تیمور کے حملہ ہند (۱۳۹۸ء) کے وقت ہوئی جب کہ وہ تلمبہ نزد ملتان کے مقام پر قیام پذیر تھا۔

اگرچہ راجہ ڈھول یا ڈھول بادشاہ کو ہمیشہ راجا نل کا بیٹا بتایا جاتا ہے۔ لیکن یہاں پر اسے ٹمنی شاہ کا بیٹا قرار دیا گیا ہے۔ ڈھول سنسکرت زبان کا لفظ نہیں، ڈھول نرور گڑھ یا نل کوٹ (موجودہ نرور ریاست گوالیار) کا رہنے والا تھا۔ نرور پر صدیوں تک کچھواہا راجپوت حکمران رہے۔ ڈھول کی (ایک) بیوی سمی کچھواہی بتائی گئی ہے۔ (بحوالہ حکایات پنجاب حصہ دوم صد ۲۳۵ حکایت نمبر ۳۱، از آر سی ٹمپل)" الوز

یہ کہانی بروایت غلام حسین کیبلا لوالہ یوں ہے۔ کہ ریاست گوالیار میں نرور کوٹ ایک مشہور جگہ تھی۔ یہاں کے بادشاہ کا نام ٹمنی تھا۔ یہ ریاست بڑی سرسبز و شاداب تھی۔ لیکن ایک دفعہ بڑا زبردست قحط پڑا۔ اور قحط سالی کا یہ دور بارہ سال تک طویل رہا۔ رعیت کی تباہ حالی پر بادشاہ بڑا فکرمند رہنے لگا۔ ایک دن اس نے شاہی نجومی سے پوچھا۔ کہ اس مصیبت کی وجہ کیا ہے۔؟ نجومی نے بتایا کہ اس ساری مصیبت کا باعث خود بادشاہ کی ذات ہے۔ بادشاہ نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا۔ کہ ہمارا لڑکا لڑکی تو ہے نہیں۔ کیوں نہ ہم تخت و تاج کو چھوڑ کر کہیں دور چلے جائیں۔ تاکہ ہماری رعیت سکھی اور خوشحال ہو جائے۔ ملکہ یہ بات مان گئی۔ چنانچہ وہ پھرتے پھراتے کھر کہار آ نکلے۔ اس وقت کھر کہار کے تخت پر راجہ اللہ داد خان بیٹھا ہوا تھا وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ اور اپنی آپ بیتی عین بن سنا دی۔ بادشاہ نے جب ان کی بپتا سنی۔ تو اسے ان کے حال پر رحم آ گیا۔ اس نے پوری پوری فراخدلی اور مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں شاہی محلوں میں بطور مہمان رہنے کی اجازت دے دی۔

ایک دن بھرے دربار میں راز و نیاز کی باتیں شروع کر دیں۔ راجہ اللہ داد خان نے

مٹنی شاہ سے کہا۔ کہ کیا اچھا ہو خدا تمہیں لڑکا دے ۔اور مجھے لڑکی تاکہ ہم ان دونوں کی آپس میں شادی کر دیں۔ دونوں نے بڑے خشوع خضوع سے دعا مانگی ۔جو بارگاہِ الٰہی میں منظور ہوگئی ۔چنانچہ کچھ عرصے بعد مٹنی شاہ کے ہاں لڑکا اور راجہ اللہ داد خان کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ۔لڑکے کا نام ڈھول ،اور لڑکی کا نام شمس رکھا گیا ۔پیدائش کے ساتویں دن قاضی بلایا گیا۔ اور دونوں کا عقد باندھ دیا گیا۔

جب ڈھول کی عمر ایک مہینہ اور پانچ دن کی ہوئی ۔تو مٹنی شاہ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ مجھے اپنا وطن چھوڑے تیرہ برس ہو گئے ہیں پتہ نہیں ملک و رعیت کا کیا حال ہوگا ۔مٹنی شاہ نے راجہ اللہ داد سے اس کا تذکرہ کیا۔ اور وطن واپس لوٹنے کی اجازت چاہی ۔جو بادلِ ناخواستہ دیدی گئی ۔مٹنی شاہ کلرکہار سے روانہ ہو کر اپنی ریاست میں پہنچا ۔تو اس کی آمد کی خبر سن کر اس کی رعیت بڑی خوش ہوئی ۔خاص کر جب انہیں یہ پتہ چلا کہ بادشاہ کے گھر شہزادہ ڈھول کی پیدائش بھی ہو چکی ہے۔

مٹنی شاہ کے رخصت ہونے پر راجہ اللہ داد خان چند دن تو بڑا اداس رہا۔ لیکن آخر غم غلط ہو گیا۔ اس اثناء میں شمس رانی بھی پروان چڑھتے چڑھتے جوانی کی بہاریں لوٹنے کے قابل ہو گئی ۔اور جذبۂ عشق دل میں چٹکیاں لینے لگا ۔ایک دن وہ سہیلیوں میں گھری بیٹھی تھی ۔جن میں سے کسی کی منگنی ہو چکی تھی ۔اور کوئی بیاہی جانے والی تھی۔ شمس رانی نے دل میں سوچا کہ اگرچہ میری عمر چودہ سال کی ہو چکی ہے ۔لیکن میرے والدین نے کبھی میری منگنی بیاہ کا ذکر تک نہیں کیا ۔آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے ۔یہ بات اس کے دل میں ایسی بیٹھی ۔کہ وہ ہر روز اداس اور دلگیر رہنے لگی ۔آخر ایک دن اس کی ایک رازدار سہیلی نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ شمس کی دلگیری کا باعث کیا ہے ۔جب شمس نے اسے رازدرونی سے آگاہ کیا ۔تو اس نے شمس کو بتایا ۔کہ پیدا ہوتے ہی تمہارا نکاح سندر کوٹ کے شہزادہ ڈھول سے ہو چکا ہے ۔جو کہ حسن و جمال کے لحاظ سے یوسف ثانی ہے ۔جب یہ بات شمس نے سنی تو اس کے دل میں آتشِ عشق بھڑک اٹھی ۔اور وہ ڈھول سے ملنے کے لئے بے چین ہو گئی۔

ایک دن شمس نے پنڈت سے فال نکلوائی ۔کہ اس کی ملاقات ڈھول سے کب ہو گی؟

پنڈت نے اسے بتایا کہ تمہاری قسمت میں ایک ہرن کے ذریعے ملاقات لکھی ہے۔ ہرن کا نام ہیرا ہونا چاہیے۔ چنانچہ شمس نے باپ سے کہا کہ وہ اکیلی محلوں میں بیچارہ گرا اداسی محسوس کرتی ہے۔ کھیلنے اور دل بہلانے کے لئے ایک ہرن کا بچہ ہونا چاہیے۔ بادشاہ نے شکاریوں کو حکم دیا۔ اور دوسرے ہی دن شکاری ایک ہرنوٹہ پکڑ کر لے آگئے۔ بادشاہ نے وہ شمس کے حوالے کر دیا۔ جس نے بڑے چاؤ سے اسے پالنا شروع کر دیا۔ اور اس کا نام ہیرا رکھ دیا۔ جب ہرنوٹہ جوان ہو گیا۔ تو شمس نے ایک خط لکھ کر اس کے حوالے کیا۔ کہ جاؤ نرور کوٹ سے ڈھول کو بلا لاؤ۔

ہیرا ہرن خط لے کر نرور کوٹ کی طرف دوڑ پڑا۔ کالے کوسوں کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک دن شام کے وقت ہیرا شاہی باغ کی دیوار پھاند کر اندر گھس گیا۔ اور ایک جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ صبح سویرے شہزادہ ڈھول اپنے طوطے جس کا نام موہنا تھا۔ کے ہمراہ باغ میں آیا۔ اس نے ادھر اُدھر ہرن کے کھروں کے نشانات دیکھے۔ وہ بڑا حیران ہوا۔ کہ ہرن کہاں سے آگیا۔ چنانچہ اس نے پھر گھوم کر تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اور آخر ایک جھاڑی میں اسے ہرن بیٹھا نظر آ ہی گیا۔ ڈھول نے اسے پکڑنا چاہا۔ لیکن ہرن بھاگ کھڑا ہوا۔ شہزادے نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ ہرن چوکڑے بھر بھر کر ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ لیکن ڈھول نے بھی ہمت نہ ہاری۔ اور اس نے بھی اسے زندہ پکڑنے پر کمر ہمت باندھ لی۔ ہر چند شہزادے نے کوشش کی۔ کہ اس کا گھوڑا ہرن تک پہنچ سکے۔ لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اسی تگ و دو میں سات دن گزر گئے۔ ساتویں روز ہیرا ہرن کلر کہار کی حدود میں پہنچ گیا۔ اب ڈھول نے محسوس کیا۔ کہ ہرن ہاتھوں سے جا رہا ہے۔ اس نے ایک تیر چلا دیا۔ اور اسے زخمی کر دیا۔ تیر لگتے ہی ہرن بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ جب ڈھول ہرن کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ہرن تو دم توڑ چکا ہے۔ لیکن اس کے سینگوں کے ساتھ ایک خط بندھا ہے۔ شہزادہ نے جب خط کھول کر پڑھا تو وہ اسی کے نام تھا۔

ہرن کی موت کا شہزادے کو بڑا افسوس ہوا۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت۔ سامنے کلر کہار نظر آ رہا تھا۔ ستانے اور آرام کرنے کے لئے ڈھول اپنے طوطے کے ہمراہ کلر کہار میں داخل ہو گیا۔ اور شمس کے باغ میں درخت کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے شہزادی کے ... گیا منہ دوپٹے سے ڈھانپ لیا۔ موہنا درخت کی ٹہنی پر

بیٹھ رہا۔ اور گھوڑا باغ میں چرنے لگا۔ گھوڑا کئی دنوں سے بھوکا تھا۔ اس نے باغ میں تباہی مچادی باغ کے مالی نے جب یہ حالت دیکھی۔ تو وہ روتا ہوا شمس رانی کے پاس پہنچا۔ اور فریاد کی۔ شمس نے جب یہ سنا۔ تو ساٹھ سہیلیوں کی معیت میں باغ میں آئی۔ موہنے نے جب اس لاؤ لشکر سمیت شمس کو آتے دیکھا تو آگے بڑھ کر رانی کو سلام کیا۔ اور اپنی آمد کا سارا قصہ کہہ سنایا۔ کہ کس طرح ہیرا ہرن انہیں نرورکوٹ سے لگاکر یہاں لایا ہے۔ شمس ڈھول کو دیکھ کر بڑی خوش ہوئی اور اسے اپنے محل میں لے گئی۔ عیش و عشرت سے دن گزرنے لگے۔ عیش و وصل کی گھڑیاں گزرتے دیر نہیں لگتی۔ آنکھ جھپکنے میں بارہ برس کا عرصہ گزر گیا۔

اِدھر ڈھول شمس رانی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ اُدھر ڈھول کے چچا حامد نے جو ایک آنکھ سے کانا تھا۔ اس کے باپ ہٹنی شاہ کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ اس ظالم اور غاصب نے ڈھول کی بہن، والدہ اور دوسری بیویوں کو قید میں ڈال دیا۔ اور ان پر طرح طرح کے ظلم توڑنے لگا۔ اسی اثنا میں ڈھول کے دل میں والدین کی محبت نے جوش مارا۔ چنانچہ موہنا کو حال احوال معلوم کرنے کے لئے نرورکوٹ بھیجا گیا۔ چار دنوں کی اڑان کے بعد موہنا نرورکوٹ کی حدود میں جا پہنچا۔ اور کانگ لرائیں کے کنوئیں پر ڈیرا لگایا۔ وہاں کیا دیکھتا ہے کہ دو آدمی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ مظلوم حامد شاہ کی دہائی دے رہا تھا۔ موہنا ملکی انقلاب کو سمجھ گیا۔ اور اس نے کانگ لرائیں سے پوچھا۔ تو کانگ نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ ڈھول کے عزیزوں پر جو کچھ بیت رہی تھی۔ موہنا نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ صورتحال دگرگوں دیکھ کر بے تاب ہو گیا۔ حامد شاہ کے دربار میں جا دھمکا۔ اور لعن طعن کرنے لگا۔ حامد شاہ نے تاڑ لیا۔ کہ یہ ڈھول کے گن گاکر ملک میں بغاوت پھیلائے گا۔ اس نے اس کی گرفتاری کا حکم دیدیا۔ لوگوں نے اسے پکڑنے کے لاکھ جتن کئے لیکن ناکام رہے۔ موہنا وہاں سے بھاگ کر کلر کہار آ گیا۔ اور ڈھول کو تمام کہانی کہہ سنائی۔ اس پر ڈھول نے وطن جانے کی ٹھان لی۔ لیکن شمس رانی اس کے راستے میں دیوار بن کر حائل ہو گئی۔ وہ ایک پل کے لئے بھی اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔

بمشکل تمام آخر ایک رات شمس کو سوتا چھوڑ کر ڈھول موہنے کے ساتھ چل دیا۔ لیکن رات کی تاریکی اور موسلا دھار بارش کی بے پناہ بوچھاڑ سے راستہ بھول گیا۔ اور نرورکوٹ کی بجائے ملتان کے راستے پر جا پڑا۔ ۱۳۹۰ء کا سن تھا۔ امیر تیمور گورگانی نے برصغیر پر حملہ کر رکھا تھا۔ اور اس کی فوجیں دریائے جہلم اور چناب کے سنگم پر واقع موضع تلمبہ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ ڈھول کو تیموری لشکر

نے گرفتار کر لیا تھا۔ اس کی گرفتاری میں آتماد وزیر کا ہاتھ تھا۔ جو اس کے باپ ہٹنی شاہ سے غداری کر کے تیمور بادشاہ کی ملازمت میں آ چکا تھا۔

قید خانے میں رات کو ڈھول نے اپنے ماں باپ کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے اسے ہدایت کی کہ کلر کہار سے شمس رانی کو بلا بھیجو۔ تمہیں رہائی مل جائے گی۔ چنانچہ صبح موہنے کو شمس کے پاس بھیجا جس نے سارا ماجرا بیان کیا۔ شمس نے مردانہ بھیس بدلا۔ اور امیر تیمور کے دربار میں حاضر ہو گئی۔ اور اب ایک حاجن کا بھیس بدل کر امیر تیمور سے درخواست کی کہ وہ تمہارے قیدیوں کو کھانا کھلانا چاہتی ہے۔ کیونکہ اس نے نذر مان رکھی تھی۔ موہنے نے اسے یہ سمجھایا کہ بادشاہ سے یہ بھی کہنا کہ میں نے ایک غلام بھی خریدنا ہے۔ اور اس طرح ڈھول کو خرید لینا۔

چنانچہ شمس رانی نے ستر لعل کے عوض میں ڈھول کو خرید لیا۔ اور وہاں سے چل پڑے۔ راستے میں ایک نائی ملا۔ اس نے دربار میں جا کر مخبری کر دی۔ کہ وہ حاجن دراصل کلر کہار کے بادشاہ اللہ داد کی بیٹی شمس رانی ہے۔ اور اس کا زر خرید غلام شرور کوٹ کا شہزادہ ڈھول ہے۔ بادشاہ کو پہلے ہی شک تو تھا۔ لیکن آتماد وزیر کی تصدیق پر اسے پختہ یقین ہو گیا۔ بادشاہ نے فوجوں کو حکم دیا۔ کہ انہیں گھیر لیں۔ لیکن کوئی آدمی ڈھول کو تیر یا بندوق سے ہلاک نہ کرے۔ زندہ پکڑنے کی کوشش کی جائے۔

اس دوران تائید غیبی ڈھول کے شامل حال ہو گئی۔ موہنا سیم غوں کی فوج لے آیا۔ انہوں نے آتے ہی تیمور کے لشکریوں کو کھانا شروع کر دیا۔ تیمور ڈر گیا۔ اور ڈھول سے صلح کر لی۔ نذر نیاز گذار کر جان چھڑائی۔ تیمور نے ہیرے جواہرات سے جڑی ایک کمان بطور تحفہ ڈھول کو دی۔

وہاں سے چلے تو شرور کوٹ کے قریب جا پہنچے۔ پہلے حالات معلوم کرنے کے لئے انہوں نے موہنا کو بھیجا۔ اس نے ایک مٹی والے سے پوچھا۔ تو پتہ چلا کہ وہاں تو کایا ہی پلٹ چکی ہے۔ ڈھول کا نام لینے والا تہ تیغ کر دیا جاتا ہے۔ آخر تینوں ایک مراسی کے گھر پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ مراسی کی بیوی نے لالچ میں آ کر راز افشا کر دیا۔ ڈھول کا ایک خیر خواہ دوڑا دوڑا آیا۔ اور انہیں مراسیوں کے گھر سے نکال کر اپنے گھر لے گیا۔ حامد شاہ کی فوج تلاشی لینے کی خاطر مراسی کے گھر آئی۔ لیکن ڈھول اور اس کے ساتھیوں کو وہاں نہ پا کر بڑے غصے سے واپس لوٹ گئی۔ اور مراسن کو جھوٹا قرار دے کر اس کی بڑی بے عزتی کی گئی۔ اتنے میں رات ہو گئی۔ اور اس خیر خواہ نے انہیں پچھلی دیوار سے دروازہ نکال کر باہر

جانے کی سہولت مہیا کر دی ۔

وہ بھوک پیاسے گرتے پڑتے ایک سنسان جنگل میں جا نکلے۔ اور ایک ویران کنویں پر ڈیرا لگا دیا۔ آخر کب تک بھوک پیاس کا مقابلہ کرتے۔ شمس رانی نے محنت مزدوری کرنے کی ٹھانی وہ موہنے طوطے کو لے کر کمہاروں کے گھر جا نکلی۔ اور التجا کی کہ اس طوطے کے عوض اسے مٹی کا ایک گھڑا دے دیا جائے۔ کمہاروں نے مان لیا۔ اور یہ گھڑا لے کر شاہی اصطبل میں پانی بھرنے لگی۔ لیکن تین دن تک اسے مزدوری کا کوئی پیسہ نہ ملا۔ بیچاروں کا برا حال ہو گیا۔

ادھر وہ مراسن جو جھوٹی قرار دی گئی تھی۔ وہ ڈھول اور شمس کی تلاش میں رات دن ایک کئے ہوئے تھی۔ آخر اس نے ڈھول کو ویران کنویں پر دیکھ لیا۔ وہ دوڑی دوڑی حامد کا ناگی کچہری میں جا پہنچی اور رپورٹ کر دی کہ اس نے ڈھول کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ اگر ابھی بادشاہ اس کے ساتھ چلے۔ تو وہ اسے پکڑوا سکتی ہے۔ اس عرصہ میں اس نے یہ پتہ بھی لگا لیا تھا کہ شمس مزدور بن کر شاہی اصطبل میں کام کر رہی ہے۔ چنانچہ اس مراسن کی مخبری اور نشاندہی پر ان دونوں کو گرفتار اور سخت عذاب میں مبتلا کر دیا گیا۔ بعد میں طے یہ پایا کہ ڈھول کو کسی اندھے کنویں میں پھینک دیا جائے۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ جب غاصب حامد شاہ کے آدمی ڈھول کو کنویں میں پھینکنے کے لئے لائے تو الوہر کا بادشاہ عبداللہ شاہ کا گذر ادھر سے ہوا۔ عبداللہ شاہ اور بہنی شاہ آپس میں گہرے دوست اور دستار بدل بھائی تھے۔ حلیف بھی تھے۔ اس کی آمد سے حامد شاہ بڑا خوفزدہ ہوا۔ اور وزیر کے مشورہ پر اس نے ڈھول کو رہا کر دیا۔ اور اپنی جان بخشی کے لئے ڈھول ہی کو سفیر بنا کر عبداللہ شاہ کے پاس بھیج دیا۔ عبداللہ شاہ نے خیر خیریت پوچھی تو اسے بتایا گیا کہ بہنی شاہ عرصہ ہوا فوت ہو چکا ہے۔ اب صرف شہزادہ ڈھول ہی اس کی نشانی باقی رہ گیا ہے۔ وہ ڈھول سے مل کر بڑا خوش ہوا۔ اور اسے اپنے ہمراہ الوہر لے چلنے پر تیار ہو گیا۔ شمس رانی کو کچھ عرصہ کے لئے واپس کلر کہار بھیج دیا گیا۔

کچھ مدت کے بعد عبداللہ شاہ لاولد فوت ہو گیا۔ اور حسب وصیت ڈھول ہی کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ جب حالات سدھر گئے۔ تو ڈھول بادشاہ نے شمس رانی کو کلر کہار سے بلا بھیجا۔ قاصد اونٹ پر سوار ہو کر کلر کہار آیا۔ اور شمس کو ڈھول کا لکھا ہوا خط دیا۔ رانی چلنے پہ تیار ہو گئی رات ہوتے ہی رانی اونٹ پر سوار ہو کر چل پڑی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ راستے میں اونٹ کسی چیز سے بدک

گیا۔ اور بے مہار ہو کر بھاگ اٹھا۔ رانی شمس بڑی گھبرائی۔ اس نے اونٹ کو قابو میں لانے کی لاکھ تدبیریں کیں۔ لیکن تمام بے سود۔ آخر بعد از خرابی بسیار اونٹ کی مہار کسی درخت کی ٹہنی سے الجھ کر اٹک گئی۔ اونٹ کھڑا ہو گیا۔ اور شمس نے ہمت کر کے مہار سنبھال لی۔ اور اونٹ کو قابو میں کر لیا

جب چاند نکل آیا۔ تو شمس نے اونٹ کو صحیح راستے پر ڈال دیا۔ راستے میں چوروں سے واسطہ پڑا۔ انہوں نے اسے اکیلے دیکھ کر لوٹنا چاہا۔ لیکن لالچ بری بلا ہے۔ وہ مال کی تقسیم کے سلسلے میں باہم جھگڑ پڑے۔ اور آپس میں لڑ بھڑ کر ختم ہو گئے۔ شمس نے انہیں وہیں مردہ چھوڑا۔ اور اپنی راہ لی۔

راستے میں کیا دیکھتی ہے کہ دو فقیر عورتیں ایک جگہ بیٹھی رونے دھونے میں مصروف ہیں۔ اور وہ ہمہ تن زبان بن کر ڈھول کے گلے شکوے کر رہی تھیں۔ جب شمس نے ان کی باتیں سنیں تو اُسے تجسس پیدا ہوا۔ جب اس نے ذرا زیادہ ٹوہ لگائی تو پتہ چلا کہ وہ لعلاں اور مہراں ہیں جو کہ ڈھول کی پہلی بیویاں ہیں۔ انہوں نے از راہِ شکایت یہ بھی کہا۔ کہ کلر کہار کی شمس رانی نے ہمارا ڈھول چھین لیا ہے۔ یہ سن کر اس سے نہ رہا گیا۔ اور اس نے ان پر اپنا آپ ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ میں ہی شمس رانی ہوں۔ اور تمہاری طرح اس کے ہجر و فراق میں دکھ تکلیف برداشت کر رہی ہوں۔ اس پر وہ دونوں اس کے گلے سے لپٹ گئیں اور زار زار روئیں۔ جب جی کچھ ہلکا ہوا۔ تو تینوں اونٹ پر سوار ہو کر ڈھول کی طرف روانہ ہو پڑیں۔ آخر وہ ڈھول کی مملکت کی سرحد تک جا پہنچیں۔ اور ایک درخت کے نیچے ڈیرہ لگا دیا۔ وہاں سے ایک لڑکا گزرا۔ اس سے انہوں نے پوچھا کہ یہاں کا والی کون ہے۔ لڑکے نے بتایا کہ نرور کوٹ کا راجہ یہاں کا حاکم ہے۔ انہیں بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ کہ اب ہماری مصیبتیں شاید ختم ہو جائیں گی۔

سہ پہر کو ڈھول بادشاہ شکار کھیلنے کے لئے شہر سے باہر نکلا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ شاہی اونٹ جو شمس کو لینے گیا تھا وہ ایک درخت کے ساتھ بندھا ہے۔ اور ساتھ ہی اس کی نظر درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تین عورتوں پر بھی پڑی۔ فوراً گھوڑے سے اترا اور حکم دیا۔ کہ کوئی دوسرا اس طرف نہ آئے۔ خود ان کے پاس گیا۔ فریقین نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ فوراً محلات میں آئے۔ سب کے غم غلط ہو گئے۔ لیکن حامد کا ناکا ظلم و ستم ایک ایسا کانٹا تھا۔ جو ابھی تک گلے میں اٹکا ہوا۔

تھا۔ بدلہ لینے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ حامد پہ حملہ کیا گیا۔ اور اسے شکست ہوئی۔ ڈھول نے نمرود کوٹ پر قبضہ کرکے اپنی حکومت کا سکہ چلا لیا۔ اور اپنے عزیزوں کو جیل کی کوٹھڑیوں سے نکال کر اپنی خوشیوں میں اضافہ کر لیا۔

کہا جاتا ہے کہ کچھ مدت حکومت کرنے کے بعد شمس اور ڈھول حکومت چھوڑ کر فقیر بن گئے۔ اور کلر کہار کے علاقہ میں چلے آئے۔ اور یہیں فوت ہوگئے۔ شمس کلر کہار میں دفن ہے۔ اور ڈھول کا مقبرہ ونہار کے موضع گفانوالہ کے شمال مغرب میں ایک بلند ٹیلے پہ مشہور خاص و عام ہے

ایک دوسری روایت کے موجب شمس رانی کی قبر موضع پہاڑ خان علاقہ ونہار میں چھنبے والی خانقاہ بتائی جاتی ہے۔ کاغذات مال ضلع جہلم کی رو سے سارے علاقہ ونہار کی حد بست "کہار" ہے۔"

۲۔ شیریں فرہاد

"شیریں فرہاد کا المیہ اگرچہ ملک ایران سے تعلق رکھتا ہے۔ جس میں شیریں شہنشاہ ایران خسرو پرویز کی عیسائی محبوبہ اور بیوی ہے۔ اور فرہاد ایک مزدور جو کہ شیریں کا عاشق صادق تھا۔ بڑا مشہور قصہ ہے۔ سب سے پہلے نظامی گنجوی نے اسے نظم کا جامہ پہنایا۔ قصر شیریں کوہ بیستون اور جوئے شیر وغیرہ آج بھی ایران میں بطور آثار قدیمہ سیاحوں کو دعوت نظارہ دے رہے ہیں۔ لیکن جدید محققین میں ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو چکا ہے۔ جو اس کہانی کا محل وقوع خاص ایران کی بجائے مکران علاقہ بلوچستان (پاکستان) کو قرار دیتا ہے ماسوا اس کی حقیقت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اب اس ڈرامہ کی سٹیج تبدیل ہو چکی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مکران کا علاقہ کسی زمانے میں سلطنت ایران ہی کا حصہ تھا۔ لہٰذا شیریں فرہاد کے کردار خواہ ایرانی ہوں یا مکرانی دوسرے ممالک میں اس قصہ کو ایران ہی کا سمجھا جائے گا۔ بعینہ علاقہ دھنی بھی ایرانی بادشاہ داریوش اول کے عہد سلطنت (۵۱۰ ق م) میں حکومت ایران کا ایک حصہ رہ چکا ہے۔ کیونکہ ان دنوں وادی سندھ ایران کا ۲۰ واں صوبہ تھا۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ ایرانی حکومت سرہند شریف تک پھیلی ہوئی تھی۔

گگھڑ قبیلہ آج بھی اپنے آپ کو ایران کے کیانی نسل کے بادشاہوں سے منسلک ہونے کا دعویدار ہے۔ لہٰذا اگر دھنی میں ایرانیوں کے عشقیہ قصوں کی یادگاریں موجود ہوں تو کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ اس قصہ میں ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کی جگہ راجہ نیل والے نیلہ دلہہ ہے۔ شیریں بادشاہ کی بیوی کی بجائے بیٹی ہے۔ کوہ بیستون کی بجائے کشمیر کے پہاڑ ہیں۔ اور جوئے شیر کی بجائے دریائے سواں ہے۔ اور محلِ وقوع ایران کی بجائے دھنی ہے" انور

کہتے ہیں کسی زمانے میں موضع نیلہ تحصیل چکوال میں ایک راجہ حکومت کرتا تھا۔ جس کا نام نیل تھا۔ اس نے دریائے سواں کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر (جہاں کہ اب تھانے اور ڈاک بنگلے کی عمارتیں واقع ہیں) اپنا محل تعمیر کروانا چاہا۔ فرہاد نامی ایک ترکھان نے جب محل کو مکمل کر دیا۔ تو بادشاہ اس کے کام سے اس قدر خوش ہوا کہ اسی خوشی کے عالم میں بادشاہ نے معمار سے کہا کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ معمار نے کہا کہ جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ کہ مجھے اپنی لڑکی کا رشتہ دے کر نواز جائے۔ یہ جواب سن کر بادشاہ سٹپٹا سا گیا۔ لیکن اب کیا کرتا اپنے قول کی وجہ سے مجبور ہو کر ہاں تو کر بیٹھا۔ اور کچھ دنوں کا وقفہ ڈال کر دن بھی مقرر کر دیا۔ لیکن اندر اندر سے اسے یہ بات گھن کی طرح کھانے لگی۔ کہ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ کہاں بادشاہ کی لڑکی اور کہاں اگھا ذنے ذات کا ترکھان، امیروں، وزیروں نے جب بادشاہ کو اس حال میں دیکھا۔ تو انہوں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ حضور وعدہ سے مکر جائیے۔ کون جواب طلبی کرنیوالا ہے۔ لیکن شاہی غیرت نے وعدہ خلافی کو گوارہ نہ کیا۔ اس پر مصاحبوں نے کہا حضور فرہاد کے سامنے ایک ایسی کڑی شرط رکھی جائے۔ جسے وہ پورا ہی نہ کر سکے۔ اس طرح سے امید ہے کہ آپ بدنامی سے بچ جائیں گے۔

چنانچہ بادشاہ اس پر رضامند ہو گیا۔ اور فرہاد کو کہلا بھیجا کہ ہم دلہن کو ہرنیوں کے نو من دودھ میں نہلانا چاہتے ہیں۔ اگر تم ہرنیوں کا ۹ من دودھ اکٹھا کر کے لے آؤ۔ تو ...... شہزادی آپ کے حوالے کر دی جائے گی۔ فرہاد نے بخوشی یہ شرط قبول کر لی۔ وہ دریائے سواں کے کنارے گھنے جنگلوں میں چلا گیا۔ اور وہاں پر گیان دھیان میں مصروف ہو گیا۔ بڑی عاجزی اور زاری سے اس نے خدائے پاک کے حضور دعائیں مانگیں۔ جو بالآخر قبول ہو گئیں

اور خواجہ خضر نے ظاہر ہو کر اسے ایک بانسری دی کہ تم یہیں بیٹھے بیٹھے اس بانسری کو بجانا تمام دنیا کی ہرنیاں اپنے بچوں سمیت تمہارے پاس اکٹھی ہو جائیں گی۔ اور تمہیں جتنا دودھ درکار ہوگا وہ حاصل ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر خواجہ خضر غائب ہو گئے۔

فرہاد بانسری لے کر بڑا خوش ہوا۔ اس نے تھوڑی سی مشق کے بعد بانسری بجانی سیکھ لی۔ اور چند لمحوں کے اندر اندر اس کے اردگرد ہرنیوں اور ہرنوٹوں کی قطاریں جمع ہو گئیں۔ اس نے بادشاہ کو پیغام بھیجا۔ کہ میں نے ہرنیاں اکٹھی کر رکھی ہیں۔ شاہی کارندے بھیجے جائیں۔ تاکہ وہ مطلوبہ دودھ دوہ لیں۔

بادشاہ کو جب یہ خبر ملی تو وہ بڑا حیران ہوا۔ اور ساتھ ہی اس کا دل بیٹھنے لگا۔ کہ اگر یہ بات سچ ہوئی۔ تو پھر مجھے شہزادی کا رشتہ دینے کی بدنامی سے تو کوئی بھی نہیں بچا سکے گا۔ اس نے واقعہ کی تصدیق کے لئے آدمی بھیجے اور وہ واپس خبر لائے کہ واقعی فرہاد نے ہزاروں کی تعداد میں ہرنیاں ایک جگہ اکٹھی کر رکھی ہیں۔ (یہ مقام آج کل موضع ہرنیاں والا کہلاتا ہے) بادشاہ بہت زیادہ متفکر ہو گیا اور الٹی کھٹوائی پر لیٹ گیا۔ اس کی حالت روز بروز دگرگوں ہونے لگی ریاست میں خبر اڑ گئی، کہ بادشاہ اب مرا کہ کل، امیروں، وزیروں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ طرح طرح کی تدبیریں سوچنے لگے۔ کہ کسی طرح سے بادشاہ اس ذلت سے بچ سکے۔

اسی اثنا میں فرہاد کو پیغام بھیجا گیا کہ یہ مہم تو تم نے سر کر لی ہے۔ اب تمہاری محبوبہ کا فرمان ہے کہ شادی تب ہوگی۔ جب تم پہاڑ کاٹ کے ایک نہر میرے محل کے نیچے سے گزار دو گے۔ فرہاد نے بخوشی اس شرط کو بھی قبول کر لیا۔ اور وہ کشمیر کے ان پہاڑوں کی طرف چل دیا۔ جن سے دریائے جہلم گزرتا ہے۔ وہاں پہنچ کر اس نے تیشہ سے پہاڑ کاٹنا شروع کر دیا۔ بڑے انہماک سے وہ رات دن اس کام میں جتا رہا۔ لیکن تیشے کدال اور ایک فرد واحد کی محنت سے پہاڑ میں کب سرنگ لگ سکتی تھی۔ چونکہ اس کا جذبہ صادق تھا۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ کو اس پر رحم آ گیا۔ اور خواجہ خضر کو ایک بار پھر اس کی امداد کا حکم آیا۔ خواجہ خضر آئے اور اسے ایک لکڑی تھمائی کہ تم اس لکڑی سے زمین پہ لکیر لگاتے جاؤ اور چلتے جاؤ۔ دریا کا پانی خود بخود تمہارے پیچھے آتا جائے گا۔ فرہاد بڑا خوش ہوا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا

اور بڑی تیزی سے اپنی محبوبہ کے محل واقعہ موضع نیلہ کی طرف چل پڑا چلتے چلتے تھک گیا تو تھوڑی دیر ستانے کے لئے نیلہ سے کچھ فاصلے پر آکر بیٹھ گیا۔ دریا کا پانی بھی وہیں رک کر چکر کھانے لگا۔ بادشاہ نے محل کی چھت پر سے نگاہ دوڑائی تو اسے کچھ فاصلے پر پانی چمکتا ہوا نظر آیا۔ تحقیق حال کے لئے آدمی دوڑائے گئے۔ انہوں نے واپس آکر بتایا کہ فرہاد پانی لے کر آرہا ہے۔ جہاں پانی رکا کھڑا ہے۔ وہاں وہ سو رہا ہے۔ بادشاہ بڑا گھبرایا اس نے امیروں وزیروں کو خوب ڈانٹ ڈپٹ کی کہ تم لوگ بھی بے ایمان ہو۔ تم مجھے ذلیل و خوار ہوتا دیکھ کر خوش ہونا چاہتے ہو۔ وزیروں کو بڑی شرم محسوس ہوئی۔ آخر انہوں نے ایک تجربہ کار پھپھے کٹنی کی خدمات مستعار لیں۔ اور فرہاد سے پیچھا چھڑانے کا منصوبہ بنایا اس کٹنی کی تجویز پر ملک میں عام منادی کرادی گئی۔ کہ بادشاہ کی لڑکی فوت ہو گئی ہے۔ اور اس کی رسم سوئم پر بے پناہ خیرات دی جا رہی ہے۔ لوگ باگ شاہی خیرات سے حصہ لینے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ حلوا گوشت اور روٹی بہت بڑی مقدار میں پکا کر تقسیم کیا گیا۔ کٹنی بھی حلوا گوشت اور روٹی برتن میں بھروا کر ایک بڑے سے ٹوکرے میں رکھ کر سر پر اٹھائے اس سمت کو چل دی۔ جہاں پر کہ فرہاد تھکاوٹ سے چکنا چور اور بھوکا سویا پڑا تھا۔ جب کٹنی فرہاد کے قریب سے گذری تو فرہاد جو کئی دنوں سے بھوکا پیاسا تھا۔ اسے حلوے مانڈے کی خوشبو آئی۔ تو اس کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے کٹنی سے کہا کہ بڑی بی تم سر پر کیا اٹھائے ہو۔ کٹنی نے بتایا کہ بیٹا راجہ نیل کی لڑکی فوت ہو گئی ہے آج اس کا سوئم تھا۔ راجہ نے بڑی خیرات کی ہے۔ یہ حلوا مانڈہ اسی خیرات کا حصہ ہے۔ جو میں اپنے گھرلے جا رہی ہوں۔ فرہاد نے جب شہزادی کی موت کی خبر سنی۔ تو اس کے دل پر ایسی چوٹ لگی۔ کہ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

کٹنی نے یوں جب اپنی کامیابی دیکھی۔ تو خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ شاہی انعام و اکرام سے مستفید ہونے کے لئے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر نیلہ کے شاہی دربار میں حاضر ہو کر اپنا کارنامہ پیش کیا۔ بادشاہ بڑا خوش ہوا۔ اور اسے انعام و اکرام سے خوب نوازا۔ انعام وغیرہ لے کر کٹنی شاہی دربار سے باہر نکلی ہی تھی کہ راجدھانی میں غل مچ گیا۔ کہ پانی آیا۔ پانی آیا۔ اس شور و غل کی بھنک شاہی محلات میں بھی پہنچ گئی۔ بیگمات اور شہزادیاں پانی کا نظارہ دیکھنے کے لئے محل کی چھتوں پر چڑھ گئیں۔ اتنے میں پانی محل

کے سامنے نیچے گرداب کی شکل میں چکر کاٹنے لگا۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس گرداب میں ایک مرد کی لاش بھی تیر رہی ہے، اس کشتی نے خوش ہو کر بتایا کہ یہی لاش اس ذلیل ترکھان (فرہاد) کی ہے۔ یہ سننا تھا کہ شہزادی نے بھی محل کے اوپر سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اور کہتے ہیں کہ دونوں لاشیں ایک دوسرے کو اپنے بازوؤں میں لے کر آگے بہنے لگیں۔ محل میں کہرام مچ گیا۔ شہزادی کی لاش نکالنے کے لئے ماچھی جالوں سمیت پانی میں کود گئے۔ اور لاشوں کو باہر نکال لیا۔ لیکن وہ لاشیں آپس میں ایسی جڑی ہوئی تھیں۔ کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا انسانی طاقت سے باہر دکھائی دینے لگا۔ آخر تھک ہار کر انہیں اسی حالت ہی میں نالہ پلھارن اور دریائے سواں کے سنگم پر ایک بلند ٹیلے پر دفن کر دیا گیا۔ یہ قبریں اب تک وہاں موجود ہیں۔ اور ہر سال وہاں میلہ لگتا ہے۔ دھنی کے ایک بزرگ شاعر چوہدری ذکاء اللہ بسملؔ نے اسے ادب کا حصہ بناتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے ؎

جانبِ مشرق پلھارن کے کنارے جلوہ گر!!
مدرسہ جس کی عمارت کم ز قصرِ جم نہیں!
اس کے دکھن کی طرف فرہاد و شیریں مست خواب!
کون سی ہے آنکھ ان کے غم میں جو پرنم نہیں

باب (۶)

دھنی کے لوک گیت

کسی علاقہ کے لوگ گیت وہاں کے باشندوں کے جذبات و احساسات کے مظہر ہوتے ہیں یہ گیت شعراء کی شعوری کوششوں کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ اق پر شعور کی نسبت وجدانی کیفیات کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی مقبولیت کا راز علمِ عروض کی پابندیوں کی بجائے عوامی ذوق میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ گیت جغرافیائی۔ معاشی اور معاشرتی حالات سے بے حد متاثر ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دھنی جیسے سطح مرتفع کے علاقے کے گیت اعلاقہ کی زرخیزی، یہاں کے لوگوں کی خوش پوشی، اور رومانوی دلکشی وغیرہ کے ترانے ہوتے ہیں۔ لوگوں کا ذریعہ معاش عموماً ملازمت ہے۔ اور انہیں لمبا اوقات الکئی کئی سالوں تک اپنے خویش و اقارب سے دور رہنا پڑتا ہے۔ یہ جدائی خصوصاً ان کی بیویوں اور منگیتروں پر بڑی شاق گذرتی ہے۔ مرد تو پردیس میں بھی اپنے دوستوں یاروں کے ساتھ ہنسی خوشی وقت گزار لیتا ہے لیکن بیوی بے چاری یاس و حرماں کا شکار رہتی ہے۔ اور ہجر و فراق کی گھڑیوں کی کربناکی گیتوں کی شکل میں اس کے منہ سے بے اختیار طور پر نکل نکل کر اس کی خلوتوں کو گرماتی اور اس کی بے چین روح کو تسکین پہنچاتی رہتی ہے۔

ہندی شاعری کی مسلمہ روایت کے موجب اظہار بیشتر صورتوں میں عورت کی طرف ہی سے ہوتا ہے۔ اور اس کا محبوب اس کا اپنا خاوند یا منگیتر ہوتا ہے نہ کہ کوئی دل پھینک قسم کا اوباش عاشق۔ کیونکہ اس علاقہ کی روایات ہی کچھ اس قسم کی ہیں۔ کہ اس قسم کی محبت کے مواقع بہت کم میسر آتے ہیں۔ اور دلوں کو معاشرہ کی پابندیوں کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ میرے ایک شاگرد جناب صدیق ساجد علوی نے بڑی محنت اور تحقیق سے دھنی کے لوک گیتوں کو کتابی شکل میں اکٹھا کر کے

تمن دی موج کے نام سے شائع کیا ہے۔ ان کی یہ کاوش قابلِ قدر ہے۔

لوک گیتوں کو موضوعات کے لحاظ سے درج ذیل اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :۔

۱۔ ماہیا۔ ۲:۔ ماہیا کی ترقی یافتہ صورتیں ۔ مرنا ۔ چھلا ۔ ڈنگاں ، ویٹا وغیرہ

۳۔ رسوماتی گیت (رسمی ۔ سہرا ۔ برات وغیرہ کے گانے)

۴۔ ہمیڑی یا چوبلہ ۔

اب چند ایسے مشہور و معروف گیت درج کئے جاتے ہیں ۔ جن سے علاقہ زیرِ بحث کی جغرافیائی ، معاشی اور معاشرتی حالات کی وضاحت ہو کر اس کی انفرادیت اجاگر ہو رہی ہے۔ سب سے پہلے دھنی کی زرخیزی کے گن گانے والا گیت ملاحظہ ہو۔

(۱) دھنی دا باجرہ وے — دھنی دا باجرہ
ہتھ ہتھ اوہدا سٹا — دھنی دا باجرہ
شہر وکاوندا ڈِٹھا ! — دھنی دا باجرہ
چاولاں نالوں مِٹھا — دھنی دا باجرہ

(۲) قربان دھنی دا وسنا ! ! ! — ہو اِک بانکا جوڑا رکھنا ! !
دتے مزدوری راتیں چوری ! — کم کوئی نہیں سوہنوں سکھنا !

قربان دھنی دا وسنا !

ہتھاں تے مہندی لشکن زلفاں — الکیں کھیلے دیاں دھاراں
جوبن چڑھیاں حسن بہاراں — پھل پیا کیہرے ہسنا ! !

قربان دھنی دا وسنا !

جیون اینہاں دا وگدی راوی — دُدھ ماجھا تے لونی گادی
شوق دی ناہنی چھبدی ساوی — ڈِکھ کنکاں تے لکھناں !

قربان دھنی دا وسنا !

اب ایک ایسا گیت درج کیا جاتا ہے ۔ جس سے دھنی کے چند خاص شہروں اور مقامات کی خاص خصوصیات سامنے آ رہی ہیں ۔

۲۔ دونیں سجن دے بانکے ہیں ٹکٹ کے بھی آں!

ماہی فرانہ پایا انصاف ہیں ڈاہڈی رُلی آں!

اسیں اِتھے تے ڈھول بکھاریاں — ساڈے سجناں بدھیاں تاریاں

دونیں سجن دے .... — ماہی فرانہ پایا انصاف ....

اسیں اتھے تے ڈھول ویرو!! — سٹ کھادی اپنے پیرو!!

اسیں اتھے تے ڈھولا بھٹیاں! — پٹ سٹیا دھنی دیاں جٹیاں!

اسیں اتھے تے ڈھولا بھون! — لک پتلا تے چھاتی سوہنی!

اسیں اتھے تے ڈھولا کھائی دے — تو ہی بگلا تے ہیں مرغائی وے

اسیں اتھے تے ڈھولا تھوہا وے — ساہنا کور ویرا گا ہووے!

اس گیت میں درج ذیل مقامات کا ذکر آیا ہے:۔

۱۔ بکھاریاں :۔ علاقہ دھنی کا ایک گاؤں بلکسر کے قریب

۲۔ ویرو :۔ ویرو بکھوال دھنی کا ایک گاؤں!

۳۔ بھٹیاں :۔ بھٹی گوجرہ علاقہ دھنی کے ایک گاؤں کا نام

۴۔ بھون :۔ دھنی کا مشہور و معروف گاؤں جسے تقسیم ملک سے پہلے ضلع جہلم کا پیرس کہا جاتا تھا!

۵۔ کھائی :۔ کھائی اعوان، بھون کے قریب کا ایک گاؤں۔

۶۔ تھوہا :۔ تھوہا ہمایوں، بھون کے مشرق ہیں دو میل کے فاصلے پر ایک گاؤں!

اب بیاہ شادی اور دوسرے خوشی کے موقعوں پر بکثرت گائے جانے والے چند گیت درج کئے جاتے ہیں۔

۴۔ ۱۔ اللہ جانے تے یار نہ جانے! — میںڈا ڈھول جوانیاں مانے

پانی بھرنی آں چھک دا! — میںڈا ڈھول مسافر ہٹ دا!

پانی بھرنی آں بہہ کے! — میںڈا ڈھول ٹُرگیا رہ کے!

پانی بھرنی آں ڈولیاں — میںڈے شریک مریندے بولیاں

پانی بھریندی آں تینوں ! ! !　　پانی لیے نین نہ رہندے تھموں !
پانی بھریندی آں سوہا ! ! !　　نہ ہٹکیں بھیڑیا روحا ! !
پانی بھریندی آں چھاں نوں !　　میں مرگئی تیندڑے ناں نوں !

(۵)

وگدی راوی ماہی وے وچ کنک دا بوٹا ڈھولا　　حسن جوانی ماہی وے اک پل دا چھوٹا ڈھولا
وگدی راوی ماہی وے وچ دو پھل کالے ڈھولا　　اک پھل منگیا ماہی وے سارے باغ حوالے ڈھولا
وگدی راوی ماہی وے وچ رڑیاں چھپیاں ڈھولا　　آپے نہ لائیاں ماہی وے تقدیراں بھیڑیاں ڈھولا !
وگدی راوی ماہی وے وچ رڑیاں ستھناں ڈھولا　　چار دہاڑے ماہی وے وت کسے نہیں بھچناں ڈھولا
وگدی راوی ماہی وے وچ رڑے پتاسے ڈھولا　　اجڑ گئیو ماہی وے کدیں وسدے آسے ڈھولا

(۶)

واہ واہ چھلا راہجو چن دا مینڈا ماہی ویکھن آیا　　واہ واہ نی حسن جوانی دا ٹر گیا تے وت نہیں آیا !
ماہیے دے بھلا دے بیلی آں نغمہ گلا دے پایا !　　واہ واہ چھلارا . . . .
ماہی مینڈا یار کھلوتا شادیاں نال بلایا !!　　واہ وا چھلارا . . . .
ماہیے دا اج آون سنیا راہ تے ڈیرہ لایا　　واہ وا چھلارا . . . .

(۷)

میں روگ جدائی دا لایا ماہی نہیں آیا　　نہیں آیا نی کملے جھلے وچھوڑا پایا ! !
خنگاہیں منتاں تاراں ! ! !　　پیاں ڈھلیاں حسن بہاراں ! !
کدی نہ قسمت جاگی ! ! !　　ہوئی جندڑی سدا وراگی ! !
پے نیرڑے تیرڑے وسیے ! ! !　　ماہی ملے تے کھڑ کھڑ ہسیے ! !
مینڈڑے لوں لوں دے وچ وس گئے　　گیا چار دیہاڑے وس گئے !
کوئی خبر نہ دیندی ہواواں ! ! .　　پئی چن چان گل لاواں ! ! !

باب

دھنی کے لوک ناچ

لوک ناچ بھی لوک گیتوں کی ایک قسم ہے جس میں فرق صرف اتنا ہے کہ لوک ناچ میں کچھ عملی اقدام ہوتے ہیں اور جسم کو حرکات دی جاتی ہیں۔ جب انسان نے اول اول اپنے آپ کو پہچانا تو کائنات میں سب سے پہلے اسے زندگی اور موت، محبت اور نفرت، بہار اور خزاں کے نشیب و فراز نے متاثر کیا اور جب اس کا تفکر زبان کی حدوں میں نہ سما سکا تو اس نے رقص کی صورت اختیار کر لی۔ رقص انسان کا اولین ذریعہ اظہار ہے اور ہر دھرتی کے لوک ناچ انسان کے اولین رقص کی شاخیں ہیں جنہوں نے ابتدائے زمانہ کی ہزاروں گردشوں میں پسنے کے باوجود اپنا وہ بے ساختہ پن وہ سادگی، وہ سچائی اور وہ نکھار نہیں کھویا جو فن کے فطری رجحانات کا آئینہ ہیں۔

لوک ناچ سے دنیا کا کوئی ملک محروم نہیں۔ جاوا، سماٹرا اور بالی کے لوک ناچ تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ سابقہ پنجاب کو بھی یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں کے لوک ناچ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی مشترک میراث ہیں۔ پانچ دریاؤں کی حسین سرزمین میں جتنے مشترکہ لوک ناچ مروجہ و مقبول ہیں وہ سب مغربی پنجاب میں ہی پیدا ہوئے اور یہیں پروان چڑھے۔ قومی تعمیر نو کے لئے ان سے بڑی مدد لی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ ہمارے ادیب اور شاعر نیز حکومت اس طرف بھی کچھ توجہ دیں۔ اس علاقے میں صرف دو ہی لوک ناچ مقبول ہیں۔ ایک

۱۔ بھنگڑا

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اس ناچ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ناچ ان پچھلے دنوں کی یادگار ہے جب مشینوں کا رواج نہ تھا جب بٹلے نے جنم نہ لیا تھا۔ جب ساہوکار پیدا نہ ہوا تھا اور وہ نظام بھی نہ آیا تھا جس نے اناج کا تخت و تاج چھینا اور اسے تانبے کے سر رکھ دیا ان دنوں گندم ہی رانی تھی اور زندگی کی ساری خوشیاں اسی سے وابستہ تھیں جب بھی فصل پکنے کا وقت آتا کسان پھولے ہوئے کھیتوں کی آزاد فضا اور گندم کی لہلہاتی ہوئی اور پکی ہوئی پیلی ڈالیاں انہیں مجبور کرتیں کہ ناچیں اور خوب ناچیں دھرتی سونا اگل رہی ہے یہ خوشی کے دن ہیں۔ جانے کب بیت جائیں دیتا تو ہے سچا " جھٹ دا میلہ "۔

فصل کاٹنے کے موسم میں جب جوانوں میں فصل کاٹنے کا مقابلہ ہوتا ہے تو کامیابی پر خوشی منانے کے لئے یہ ناچ ناچا جاتا ہے چند نوجوان ڈھول بجانے والے کے ارد گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک آدمی کوئی سُر یا ڈھولا گاتا ہے سر ختم ہونے پر آخری لفظ کو لمبا کر کے کوک لگاتا ہے اور ڈھولی کے سامنے ایک ٹانگ اٹھا کر اور دونوں بازو اوپر پھیلا کر ایک ٹانگ پر ناچتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ یہ گیت گاتے ہیں

تُوں صدقے، میں صدقے   جیہڑی چگے دے وچ سوہا پھل لٹکے۔

بار بار اسی کو دوہراتے جاتے ہیں اور ڈھول کی گت پر دائرے میں تالیاں پیٹ پیٹ کر جھک کر کاٹتے جاتے ہیں آخر پر ڈھول کی گت تیز ہو جاتی ہے اور ناچنے والوں کی حرکات و سکنات میں بھی تیزی آجاتی ہے۔ بالآخر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور پھر نعرہ مار کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یوں بھنگڑا مکمل ہو جاتا ہے

اگر کسی پہلوان یا مدمقابل کی تضحیک مطلوب ہو تو پھر منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹیاں بجائی جاتی ہیں اور ان سیٹیوں کی ڈھول کے سر تال کا عین ساتھ دیتی ہے۔ اس وقت اسے بھنگڑہ کی بجائے چوٹا مارنا کہا جاتا ہے۔

۲۔ لُڈی

لڈی ایک نشیلا لوک ناچ ہے۔ اس کے رسیلے گیت نہیں گاتے وہ صرف ناچتے ہیں وہ گھٹنوں، بازوؤں کو لہرتے اور جسم کے انگ انگ کو لچکاتے مستی اور بے خودی کی حد تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں لڈی خوشی اور کامرانی کا گیت ہے۔ ڈھول کے ارد گرد نوجوان مرد اور عورتیں حلقہ باندھ کر ناچتے ہیں۔ چکر کاٹتے جاتے ہیں۔ اس میں پاؤں کی حرکت زیادہ ہوتی ہے اور لہک لہک کر ایسے اشارے کرتے ہیں۔ کہ گویا ڈھول کو چھونا چاہتے ہیں۔ یہ منظر بڑا دلکش جوش انگیز اور جاذب نظر ہوتا ہے۔ ناچنے والے تو ایک طرف رہے دیکھنے والے بھی ناچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

علاقہ دھنی میں عموماً یہ ناچ بیاہ شادیوں کے موقعہ پر پیش کیا جاتا ہے۔

باب ۸

دھنی کے موسیقار

موسیقی ایک ایسا فن ہے جس میں آوازوں کی ترتیب اور آہنگ سے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یونانی صنمیات میں "موسائک" کا لفظ ان تمام فنون لطیفہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جو میوسیز دیوتا کے زیر اثر ہیں۔ یہی لفظ بگڑ کر موسیقی بنا البتہ معنی کے اعتبار سے موسیقی ان تمام چیزوں کا احاطہ نہیں کرتا جو موسائک کے لفظ سے وابستہ ہیں۔ قدیم یونانی موسیقی کے متعلق اس زمانے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس کے صرف بعض ٹکڑے ہی اس زمانے تک پہنچے ہیں۔ تفصیلات کے متعلق کچھ علم نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ علم موسیقی کے محققین قدیم یونانی موسیقی کے ان ٹکڑوں کی نوعیت اور ان کی بنیاد پر یونانی موسیقی کی تفاصیل کے بارے میں متفق نہیں ہوسکے۔ بہر حال یہ چیز طے ہے کہ دنیا کی تمام قدیم تہذیبوں نے خود اپنی موسیقی کو جنم دیا قدیم یونانی موسیقی کے بارے میں شاید کچھ نہ کہا جاسکے لیکن چین برصغیر پاک و ہند اور عرب ممالک کی۔

موسیقی کی اپنی روایات ہیں اور ان سب کا اپنا نظام ہے۔

آج مغربی موسیقی کے اس ترقی یافتہ دور میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ کہ مشرقی تہذیبوں کی موسیقی جن اوزان پر ترتیب دی گئی تھی۔ اور اس کے لئے جو پیمانے مقرر تھے موجودہ مغربی موسیقی ان سے، بالکل الگ چیز ہے خود مغربی موسیقی بھی موجودہ دور ہی میں اس باقاعدہ شکل تک پہنچی ہے۔ اس کی تاریخ ازمنہ وسطیٰ کے عیسائی مذہب کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اس وقت یہ مسیحی موسیقی یونانی اور یہودی موسیقی کے کچھ حصوں پر مشتمل تھی مغربی موسیقی کے چار اوزان پہلے پہل ۳۸۴ء میں ترتیب دیئے گئے پھر ۵۹۰ء سے ۶۰۰ء تک اس میں چار ارکان کا اضافہ کر دیا گیا۔ مختلف آوازوں کی ترتیب اور پیچیدگی ازمنہ وسطیٰ کی پیداوار ہے اس سلسلے میں ایک انگریز جان ڈی سٹیبل کا نام لیا جاتا ہے۔ اس نے ۱۴۳۷ء میں موسیقی کو باقاعدہ شکل دینے کی کوشش کی اس کے بعد پندرھویں اور سولھویں صدی کا زمانہ آتا ہے۔ جسے یورپ میں مغربی موسیقی کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔

مشرقی موسیقی میں پاک و ہند کی روایات بہت قدیم ہیں۔ ہندو دیومالا میں ہندوستانی موسیقی کا سلسلہ دیوتاؤں سے ملتا ہے۔ زمانہ قدیم ہی سے برصغیر میں موسیقی کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے بعد کے زمانے میں جب یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو موسیقی نے زبردست ترقی کی مسلمانوں کو موسیقی سے جو لگاؤ رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں۔ مثلاً ہارون الرشید موسیقی کا بہت بڑا نقاد تھا اس کے خاندان کے دو اور افراد یعنی ہارون کی بہن عالیہ بنت المہدی اور اس کا بڑا بھائی ابراہیم دونوں موسیقی میں بڑی مہارت رکھتے تھے خصوصاً ابراہیم کو تو اس عہد کے مشہور گوئیے یعنی اسحاق موصلی اور ابراہیم موصلی کا حریف اور مد مقابل ہونے کا دعوےٰ تھا۔ ابراہیم نے مامون الرشید کے عہد میں بغاوت بھی کی تھی اور بغداد میں اپنی خلافت کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ لیکن اسے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی اور جب وہ پکڑا گیا تو مامون نے محض اس کے فن کی وجہ سے معاف کر دیا۔ برصغیر کے مسلمان سلاطین میں سلطان حسین مشرقی موسیقی کا بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ سلاطین شرقی کا پایہ تخت جونپور تھا چنانچہ ایک راگنی جو سلطان حسین کی یادگار ہے۔ اسی مناسبت سے جونپوری کہلاتی ہے۔ کشمیر کے حکمران سلطان زین العابدین جنہیں عام طور پر بڈشاہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے موسیقی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے کئی ساز بھی ایجاد کئے جو آگے چل کر ناپید ہو گئے۔

مالوہ کے پٹھان بادشاہوں میں باز بہادر اس فن میں کمال رکھتا تھا یہ وہی باز بہادر ہے۔ جسے روپ متی کے عشق نے تاریخی شخصیتوں کی صف سے نکال کر شعر و افسانہ کے کرداروں میں لا کھڑا کیا ہے۔ عادل شاہ عرف عدلی بھی جو سلیم شاہ سوری کا جانشین تھا۔ موسیقی میں استادی کا درجہ رکھتا تھا دکن کے ایک حاکم ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی سے غیر معمولی شغف تھا آخری دور کے لوگوں میں واجد علی شاہ کو موسیقی کا خاص ذوق تھا۔ وہ خود ٹھمریاں تصنیف کرتے تھے اور پھر ان کی دھنیں باندھتے تھے۔ رہس نے بھی انہی کی توجہ سے رونق پائی۔

بادشاہوں اور حکمرانوں کے علاوہ برصغیر میں امیر خسرو اور میاں تان سین بھی اس فن کے نائیک تھے

علاقہ دھنی میں خصوصاً تقسیم ملکی سے پہلے ہندوؤں میں اس فن کا کافی چرچا تھا اس علاقے نے اچھے اچھے موسیقار پیدا کئے ہیں۔ ان میں سے رام لبھایا عرف لبھو تو بھون کا رہنے والا تھا وہ تھیٹر کمپنیوں میں بھی کام کرتا رہا اور جب پہلے پہل ریکارڈنگ کی مشینیں برصغیر میں آئیں تو جن لوگوں کے ابتداً گراموفون ریکارڈ بھرے گئے ان میں لبھو بھی تھا کہتے ہیں کلکتہ میں گوہر جان نے حسد کے مارے دھتورہ کھلا دیا جس سے اس کا نہ صرف گلا بیٹھ گیا بلکہ وہ پاگل بھی ہو گیا۔ راقم نے اسے پاگل پن کی حالت میں ہی دیکھا تھا۔ لبھو کا بھائی ڈاکٹر بیلی رام بھون کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھی۔

مدن موہن جو کہ ان دنوں بھارت میں بحیثیت میوزک ڈائریکٹر ایک مشہور و معروف شخصیت ہے وہ چکوال کا باشندہ تھا جو تقسیم ملکی کے بعد بھارت چلا گیا اس نے اپنی خود نوشت سوانحعمری شائع شدہ رسالہ فلم فیئر بابت ۹ اکتوبر ۱۹۵۹ء اس فن میں اپنی فتوحات و کامیابیوں کا بڑے موثر انداز میں ذکر کیا ہے،

آج کل ملک مشتاق احمد سکنہ بھون شاگرد مہدی حسن کراچی میں اس فن میں تکمیل کے مراحل طے کرنے میں مصروف ہے۔ ریڈیو پاکستان سے اس کی ہلکی پھلکی موسیقی اکثر سننے میں آتی رہتی ہے۔ چکوال کی خواجہ برادری سے بھی ایک نوجوان ریڈیو پاکستان ڈھاکہ میں بطور فنکار کام کر رہا ہے۔

فلمی دنیا میں عالیہ موضع جبیر پور تحصیل چکوال ایک ابھرتی ہوئی اداکارہ ہے۔

باب ۹

دکنی کی صحافت اور صحافی

کوئی ادبی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں کہی جا سکتی جب تک صحافت اور اہل صحافت کا اس میں ذکر نہ ہو اور اس میں کوئی شک نہیں کہ صحافی حضرات نے قومی و علاقائی زبانوں کو فروغ دینے میں بڑی خدمات انجام دی ہیں اردو اخبارات اور ان کے مہتمموں اور مدیروں نے اردو کو فروغ دینے میں بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا ہے اور آج جن ترقی کے مدارج پر اردو پہنچی ہوئی ہے۔ اس میں اخبارات و رسائل کا بھرپور حصہ ہے اردو اخبارات و رسائل نے اردو کو بام عروج پر ہی نہیں پہنچایا بلکہ انہوں نے قوم و ملک کی خدمات کی صحیح ترجمانی کر کے ان کے دلوں میں ایک تڑپ پیدا کی ان کو متحرک زندگی بخشی اور بعض اہم موقعوں پر انقلاب رونما کرنے میں بڑا اہم پارٹ ادا کیا۔

اردو کی مختلف فنون کی کتابیں اپنے موضوعوں اور اپنے مقررکردہ مخصوص واقعات و حالات تک محدود ہیں۔ لیکن اخبارات و رسائل کی حیثیت ان سے بالکل جدا ہے۔ اخبارات ملک و قوم کے روزانہ حرکات و سکنات اور ہر قسم کے واقعات و حالات سے لبریز رہتے ہیں اور ایک مستند تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اخبارات میں صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ ادبی، علمی، تعلیمی، سماجی، معاشی اور مجلسی واقعات و حالات ایسے انوکھے اور نادر ہوتے ہیں۔ جو تاریخی کتابوں میں نظر نہیں آتے بلکہ ناپید ہیں۔ ایسے اہم تاریخی اور معلوماتی خزانوں کو نظرانداز کرنا ان کی قدر و قیمت اور اہمیت سے ناواقف ہونا اور صحافی حضرات جنہوں نے اس ضروری اور اہم کام کے لئے زندگیاں تجیں ان کو فراموش کر کے ان کا تاریخ ادب میں ذکر نہ کرنا صریحاً ناانصافی ہے۔

اگرچہ علاقہ زیر بحث میں کسی اخبار کا سراغ تو نہیں لگ سکا۔ البتہ چند ایک رسالوں کا پتہ چلتا ہے جو ضلع بیجاپور سے شائع ہوتے رہے ہیں ان میں سے ایک دو تو خاص معیاری قسم کے تھے۔ اور باقی محض نام

بھی کچھ رسالے تھے لیکن چکوال جیسی علمی و ادبی مراکز سے دور اور مختصر سی جگہ پر اتنا بھی غنیمت تھا ان میں سے سب سے پہلا رسالہ اصلاح دیہات نامی تھا جس کے ایڈیٹر جناب محمد دین ادیب تھے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ رسالہ ۱۹۳۰ء میں مسٹر ایف ایل برین آئی سی ایس المعروف دیہاتی سقراط "کی تحریک دیہات سدھار کا نقیب تھا اس رسالہ کو مقامی اور ضلعی افسران کی سرپرستی حاصل تھی سر سکندر حیات کے عہد وزارت عظمیٰ میں سر چھوٹو رام وزیر مال و زراعت کے شہرے بل کا یہ پرجوش حامی تھا لیکن سکندر وزارت کے خاتمے کے ساتھ یہ رسالہ بھی ختم ہو گیا ہے۔

دوسرا قابل ذکر رسالہ ادبیات چکوالی تھا جس کی ادارت ریاض چشتی کے سپرد تھی یہ خالص ادبی ماہنامہ تھا جس میں اکثر مقامی شعراء و ادبا کی منتخب تخلیقات شائع ہوتی تھیں اس کے اجراء پر مشاہیر ادب نے اس سے بڑی توقعات وابستہ کی تھیں۔ ان میں سے دو پیغام درج کئے جاتے ہیں

۱- اپنی قومی زبان کی خدمت خواہ وہ کسی صورت سے ہو۔ ملک و قوم کی خدمت ہے۔ امید ہے کہ آپ کا ماہنامہ "ادبیات" اردو زبان و ادب کی اس خدمت کو بوجہ احسن انجام دیگا۔

(بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم)

۲- یقیناً چکوال جیسے مقام سے "ادبیات" کا اجراء ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ لیکن یہ اتنا حیران کن نہیں جتنا آپ قرار دیتے ہیں کیونکہ جہاں آپ جیسے بزرگوں کی صورت میں علم و عرفان کی موسلادھار بارش ہو وہاں سے ادبی رسالہ نہ نکلے گا تو اور کیا ہوگا۔ (ڈاکٹر عبدالسلام خورشید شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی)۔

لیکن مالی مشکلات کے باعث چار پانچ شماروں کے باعث یہ رسالہ دم توڑ گیا۔

غلام رسول عاجز نے ۱۹۵۷ء میں بچوں کے لئے ایک رسالہ "معصوم دنیا" کے نام سے نکالا یہ دو ورقی رسالہ تھا۔ جسے ہاتھوں سے لکھ کر بڑی محدود تعداد میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ چند نوجوانوں کی مشترکہ کوشش تھی لیکن تجربہ مہنگا پڑا اور دو چار شماروں کے بعد اپنی موت آپ مر گیا۔

عبدالعزیز خاکی نے پہلے "نظامیہ" اور پھر "مصیغر" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا اس میں صرف معمے شائع ہوتے تھے۔

چکوال میں گورنمنٹ کالج کے اجراء سے (۱۹۶۹ء) علمی و ادبی سرگرمیوں میں کافی گہما گہمی پیدا ہو چکی ہے۔ جناب خواجہ [illegible] علمی و ادبی نگارشات کو منصہ شہود پر لانے [illegible] کالج میگزین "شمشیر

کے نام سے سال میں دو تین دفعہ شائع ہو رہا ہے۔ جس میں گاہ گاہے۔ قدیم طلبائے کالج کے رشحات قلم بھی اشاعت پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں اردو اور انگریزی کے لئے اوراق مخصوص ہیں

سہگل ماڈل ہائی سکول سہگل آباد نے بھی اپنے طلبا میں لکھنے پڑھنے کا ذوق اجاگر کرنے اور سنوارنے کے لئے ایک سکول میگزین الامین جاری کر رکھا ہے۔

اس علاقے نے راجہ غلام حسین مرحوم آف بھون نائب مدیر کامریڈ و ہمدرد (مولانا محمد علی جوہر کے اخبار) افتخار احمد صفدر مخدومی مرحوم ایڈیٹر آزاد لاہور، شورش ملک ریذیڈنٹ ایڈیٹر جنگ راولپنڈی، اصغر بخاری نائب مدیر جنگ راولپنڈی، اوم پرکاش ناآمی نائب مدیر تیج دہلی، خواجہ شفیع جاوید مدیر گلفروش کراچی، صوفی غلام مصطفےٰ ایڈیٹر چکوال گزٹ کراچی اور مولانا نعیم صدیقی جیسے نامور صحافی پیدا کر رکھے ہیں۔

جمیل ہاشمی باغ حسین کمال، طارق قاضی، محمد دین ادیب، منیر نوابی اور الطاف پیرزادہ وغیرہ اس علاقے میں مختلف اخباروں کے مقامی نامہ نگار ہیں۔

باب ۱۰

دھنی کے خطاط و فن خطاطی

خط و خطاطی کا تعلق علم و ادب کے ساتھ چولی دامن کا سا ہے یہ ناممکن ہے کہ علم و ادب کا سیکھنا سکھانا خط و خطاطی کے بغیر تصور میں لایا جا سکے۔ علاقہ زیر بحث بھی وادی سندھ کے دوسرے علاقوں کی طرح قدیم زمانے سے انسانوں کی بود و ماند کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ لیکن قدیم انسانوں کے متعلق حتمی طور پر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ وہ کس نسل کے لوگوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی زبان و اس کا رسم الخط کیا تھا۔ ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے آثار قدیمہ سے جو مہریں یا دوسری تحریریں کھدائی میں برآمد ہوئی ہیں وہ آج تک پڑھی نہیں جا سکیں۔ بہر حال اتنا ضرور ثابت ہو چکا ہے کہ ان قدیم شہروں کے لوگ دراوڑی نسل کے افراد تھے اور ان کا رسم الخط تصویری تھا۔ ۱۵۰۰ ق م میں جب وسط ایشیا کے آریا نسل کے لوگوں نے شمال مغربی سرحدی دروں کو عبور کر کے وادی سندھ میں تاخت و تاراج شروع کی تو وہ اپنے ساتھ زبان، نو نظم اور لائے تھے لیکن اس کا رسم الخط نہیں تھا۔

زمانہ قبل مسیح میں وادی سندھ میں سرہند تک ایران کے ہخامنشی خاندان کا طوطی بول چکا ہے ان کے پاس اپنا رسم الخط موجود تھا جسے خروشتری رسم الخط کہا جاتا ہے۔ اشوک کے چٹانی کتبے جو برصغیر کے شمالی حصوں میں مانسہرہ، شہباز گڑھی اور کٹاس کے مقام پر پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب خروشتری رسم الخط میں لکھے ہوئے ہیں۔

علاقہ دھنی میں بحوالہ ڈسٹرکٹ گزیٹیر جہلم موضع میرا تھرچک کے ایک کنوئیں میں سے جو کتبے دستیاب ہوئے تھے وہ بھی خروشتری ہی میں تھے۔ چنانچہ اسی خروشتری رسم الخط کے زیر اثر برصغیر میں سنسکرت رسم الخط معرض وجود میں آیا پھر بدھ مت کے زیر اثر اس خط میں مزید قطع برید کر کے لنڈا رسم الخط ایجاد کیا گیا جو تقسیم ملکی (۱۹۴۷ء) سے قبل ہندو جینوں اور منیموں میں کاروباری

عہدوں کے لئے عام استعمال کیا جاتا تھا

دین محمد بن قاسم کے حملہ سندھ (۷۱۲ ء) کے بعد خصوصاً اور غزنوی سلاطین کے حملوں کے بعد عموماً اس برصغیر میں قرآن مجید اور دیگر مذہبی، تاریخی وغیرہ کتابوں کی تحریر کے لئے عربی رسم الخط آیا جو کہ یہاں آنے سے پہلے عرب، عراق اور ایران کے اسلامی مراکز میں ارتقائی مراحل طے کر کے خط کوفی سے خط نستعلیق کی شکل میں تبدیل ہو چکا تھا۔

تاریخ اسلام کے اوراق شاہد ہیں کہ خلفائے دولت اسلامیہ کی فیض گستریوں اور مربیانہ سرپرستی نے فن خطاطی کو بام عروج پر پہنچایا نہ صرف خوش نویسی اور کتابت کی رفیع الشان جدتوں کو اجاگر کرتے ہوئے قلمی معجزہ نمائی دکھانے والے خطاط و کتاب پیدا کئے بلکہ اپنی بے پایاں سرفرازیوں سے ان میں شارح، فیصلہ نویس، مشتہر، نکتہ رس مورخ، معلم، شاعر، خطیب، ادیب اور ناظم، پیدا کئے ؛

مسلمانوں کے دور حکومت میں تعلیم عام تھی، اشاعت تعلیم حکومت کا فرض تھا اور اس مقصد کے لئے علمائے دین کی سرپرستی کی جاتی اور انہیں ہر قسم کی معاشی اور اقتصادی پریشانیوں سے نہ صرف آزاد رکھتی بلکہ معاشی خوشحالی اور سربلندی کا ذریعہ بھی بنتی۔ کاتب اور خطاط اس قدر معزز خیال کئے جاتے تھے کہ انہیں عرف عام میں "قبلہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ خوشنویس اکثر کتاب ساز بھی تھے چھاپہ خانہ موجود نہ ہونے کے باوجود کتابیں بڑی آسانی سے میسر آ جاتی تھیں، کتابوں کی جلد بندی، طلاکاری اور شیرازہ بندی، کتابوں کی تذہیب و تہذیب اور ان کی خرید و فروخت ایک خاص فن بن گیا تھا جسے ایک عام آدمی سے لے کر وزراء اور امراء سے واسطہ پڑتا اور انہیں بڑی عزت و احترام سے دیکھتے تھے ان پیشوں کے اختیار کرنے والے معاشرہ میں بڑے معزز سمجھے جاتے تھے۔ کتابوں کے ذریعے تبلیغ و اشاعت کا کام ایک مذہبی فریضہ تھا،

اس فن کی عزت و تکریم کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سلاطین دہلی میں سے، بادشاہوں، شہزادوں اور امراء و وزراء نے اس فن شریف کو سیکھنے اور برتنے میں لازوال شہرت حاصل کی۔

بادشاہوں میں سے سلطان ناصر الدین محمود (۱۲۴۶ء - ۱۲۶۶ء) پہلا بادشاہ تھا جس

نے خطاطی کو اپنا دلپسند مشغلہ بنایا اس معارف پرور بادشاہ نے ۹ برس تک چترشاہی کے سائے میں بیٹھ کر قرآن پاک نقل کیا اور اس کی اجرت سے بسر اوقات کی، شاہی خزانہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا دوسرا بادشاہ سلطان محمد تغلق (۱۳۲۵ - ۱۳۵۱ء) تھا۔ ہسٹری آف مسلم لرننگ ان انڈیا کا مصنف لکھتا ہے کہ خطاطی میں سلطان اچھے اچھے کاتبوں اور خوشنویسوں سے بازی جیت لیتا تھا۔ مغلیہ بادشاہوں میں بابر، ہمایوں، جہانگیر اور عالمگیر کا ذکر اکثر تذکروں میں آتا ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن شریف برصغیر پاکستان وہند کے اکثر کتب خانوں کے علاوہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں بھی ملتے ہیں جہاں وہ نذر کے طور پر پیش کئے گئے۔ عالمگیر نے پورے ۵۱ سال قرآن پاک نقل کیا اور اس سے اپنا پیٹ پالا کتابت کی اس سے اعلیٰ قدر کیا ہو سکتی ہے۔

تیموری شہزادوں میں کامران، پرویز اور دارا شکوہ بھی فن خطاطی میں مہارت تامہ کے مالک تھے شاہ جہاں نے دارا شکوہ کو خط نستعلیق کے بے بدل استاد آقائے عبدالرشید کے سپرد کر رکھا تھا۔ شہزادے نے خوب محنت کی اور نسخ اور نستعلیق میں اچھا خاصا کمال پیدا کیا، سکینۃ الاولیاء (جو حضرت میاں میر رح کے ملفوظات پر مشتمل ہے) کا ایک نسخہ دارا کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ابھی تک ہندو یونیورسٹی بنارس کی زینت ہے۔ عزیز باغ حیدر آباد دکن کے کتب خانہ میں دارا شکوہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف کا وہ نسخہ ہے جو اس نے شاہ جہاں آباد میں ہرن کی کھال پر سنہری حروف سے لکھا تھا۔ شاہ جہان کا تو اعلان تھا کہ جو شخص خطاط اعظم میر عماد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک لفظ بھی لائے گا اسے یکصدی منصب دیا جائے گا۔

شہزادوں کے علاوہ بعض شہزادیوں نے بھی اس فن میں کمال حاصل کیا، عالمگیر نے اپنی بیٹی، زیب النساء کو فن خطاطی کی تعلیم دی جو نسخ اور نستعلیق لکھنے میں ماہر تھی نور جہاں اور زیب النساء کی وصلیاں بھوپال کی لائبریری میں موجود ہیں اور جہاں آراء کا لکھا ہوا مونس الارواح کا نسخہ لکھنؤ میں موجود ہے۔ کتابت اور کتاب سازی کے سلسلے میں ہمارے جلیل القدر علما نے اپنے مذہبی جوش و خروش کا مظاہرہ جس خوبصورت انداز میں کیا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ گجرات کے مشہور محدث شیخ علی متقی نے سارا قرآن پاک ایک بڑے سائز کے کاغذ کے دونوں طرف لکھ کر اسلا

عبدالصمد شیریں قلم نے خشخاش کے ایک دانہ پر سورۂ اخلاص بسم اللہ سمیت لکھی۔

علاقہ زیرِ بحث میں بھی یہ فن شریف عرصہ قدیم سے رائج ہے اور اس سلسلے میں شیخ محمد اسلم زریں رقم اور حافظ محمد یوسف بھونوی قابل ذکر ہیں۔ شیخ محمد اسلم زریں قلم کا مفصل تذکرہ اسی کتاب کے باب میں شیخ گڈھوک کے حالات کے ضمن میں ہو چکا ہے، حافظ صاحب آج کل روزنامہ امروز لاہور کے ہیڈ کاتب ہیں۔ آپ خطاطی کے کئی مقابلوں میں انعامات حاصل کر چکے ہیں آپ استاد عبدالمجید پروین رقم کے خاص شاگردوں میں سے ہیں،

باب ۱۱
دھنی کی کہاوتیں!

کہاوتیں، محاورے اور ضرب الامثال ہر زبان کی روح رواں ہوتی ہیں۔ کسی زبان میں ان کا استعمال یا ان کی موجودگی سے اس زبان کے چہرے مہرے مزاج اور انفرادیت کا بخوبی پتہ لگ سکتا ہے۔ کہاوتیں زندگی کی بنیادی سچائیوں سے جنم لیتی ہیں اور یہ اس بنیادی صداقت کا دوسرا نام ہوتی ہیں جو کہ عام لوگوں کے مدِ پیش آچکی ہوتی ہیں پتہ نہیں کتنے عرصے تک ایک عمل کا ایک ہی نتیجہ نکلتا رہتا ہے، تب کہیں جا کر کوئی عارف اس نتیجے کو الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے اور الفاظ کا یہی جامہ کہاوت کے نام سے پکارا جانے لگتا ہے۔

ارسطو کہتا ہے کہ کہاوتیں معانی کے وہ ٹکڑے ہوتے ہیں جو کہ مطالب کی نفاست اور ایجاز الفاظ کے طفیل فلسفہ قدیم سے باقی بچ جاتے ہیں۔ ہاؤل کے قول کے موجب زبان خلق کہاوت ہے اور فلر کا کہنا ہے کہ بہت زیادہ مضمون کا کم سے کم الفاظ میں نچوڑ کا دوسرا نام کہاوت ہے مطلب اور مضمون کا جتنا مشترک احساس کہاوت میں ہوتا ہے۔ اتنا زبان کے اور کسی حصے میں نہیں ہوتا۔ مطالب اور مضامین تو کہنے سننے والے کے ذہن میں پہلے ہی سے موجود

ہوتے ہیں۔ بس انہیں غوطہ مار کر باہر نکالنے ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہاوتیں اس بارے میں پورا پورا حق ادا کر دیتی ہیں۔ کہاوت ایک ایسی قدر مشترک ہے جو مقرر کے صحیح احساسات کو سامعین کے دل و دماغ تک پہنچا سکتی ہے۔ محققین علم و ادب کا کہنا ہے کہ مغربی زبانوں کی نسبت مشرقی زبانوں میں کہاوتوں کی بہتات ہے دنیا میں عربی زبان اس ضمن میں اولیت کی مالک ہے۔ اور دوسرے نمبر پر ہسپانوی زبان قرار دی جاتی ہے۔ لیکن یہ ایک ایسی مغربی زبان ہے جس پر عربی ثقافت کا بہت زیادہ اثر ہے۔ تیسرے درجے پر برصغیر ہند و پاکستان کا نمبر آتا ہے اور چوتھے درجے پر ایران

پھر برصغیر ہند و پاکستان کی تمام زبانوں اور بولیوں میں سے پنجابی زبان کا دامن بہت وسیع ہے اگر ہم یہ کہیں کہ پنجابی زبان میں اتنی کہاوتیں ہیں کہ وہ پنجابی کی تمام زندگی کو محیط ہو سکتی ہیں تو یہ کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ چونکہ کہاوتوں کی اقسام اور ان کے مضامین بے شمار ہیں اس لئے ان تمام کا استقصا تو ناممکن ہے۔ بہرحال ڈھنی والی کا مزاج اور چہرے مہرے کی انفرادیت اجاگر کرنے کے لئے میں ان ہزاروں کہاوتوں میں سے صرف مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر تقریباً سو ایک کے قریب کہاوتیں عام مقولے، پند و نصیحت اور طنز کے عنوانات کے تحت درج کر رہا ہوں۔ اگر موقعہ ملا تو اس موضوع پر مزید تحقیق کر کے حاصل تحقیق پیش کروں گا۔

۱۔ دانشمندانہ مقولے

(۱) بھیڑے بھیڑے یار بھیڑی کا پچھوڑے
(۲) پیر پتر نہ دیمی، رن تے نائیں کھس لیسی
(۳) پہلے دن عزماں، دوجے دن بے ایمان
(۴) جیتھے رناں چار، اُتھے گلاں دی گھمکار
(۵) حساب جو جو تے بخشش سو سو
(۶) ڈاہڈے دے حق نہ ہارنے لیسے دی گل پل
(۷) فاقے دی کنگوڑی تے شہتیراں نال بجھے

۸۔ سائیاں کدائیں تے دودھیاں کر لئیے
۹۔ کتا کتے دا ویری
۱۰۔ ککڑ ککڑ ہوندے تے انڈے سو ہوردے
۱۱۔ گھاہ گھاڑیں تے منڈی لنگریں
۱۲۔ گلاں نال گل کراں تے وے نال ہمسائیاں
۱۳۔ یار آون تے منڈ دراں دی کھاون

(ب) پندوموعظت

(۱۴) اصیلاں نوں شارت
تے گدھے نوں سوٹا

۱۶- اُڈے چلیں بھلیا
جدے پیو تے دادا چلیا

۱۸- اوہا موئی ملنگنی
جیہڑا مو تیا ملنگ

۲۰- بھجیاں دھرکاں بھراں کلاوے
جیہڑا لکھیا اوہا ہتھ آوے

۲۲- بھیڑیاں دی لگی بدھیاں
رو رو ہوئیاں اودھیاں

۲۴- تلی دی رواں، ہنجاں دی سنبھال

۲۶- جنیاں لگیاں بنیوں
بک لگی تے جانے

۲۸- جیہدا لون کھائیے
اہدے گن گائیے

۳۰- چنگیاں کھول بیٹھا اوس جھولی بھل پیئے
بریاں کھول بیٹھا اوہ بھی ڈھل گئے

۳۲- کال بدھی نہیں مرگی، بال بدھی موئی،

۳۶- کھائیے دال جیہڑی نبھے نال

۳۸- کٹڑیاں چڑیاں بکریاں تنے داتیں اتھریاں

۴۰- گھیو سنوارے کھچڑی، وڈی نوں واناں

۴۲- کھنڈائے داناں نئیں روائے داناں لے

۱۵- پرایا کا ہٹنا پایا
الٹا حال وِنجایا

۱۷- پرائی پیڑتے گدھ وچ نیر

۱۹- پرایا گھر تے تھکے داوی ڈر
اپنا گھر تے ہگ ہگ بھر

۲۱- پیٹ نہ پیاں روٹیاں
سبھو گلاں کھوٹیاں

۲۳- پہلوں پیٹ پوچا
وت کم دوجا

۲۵- بھیچھر گوشت نہیں
گھوچہ دوست نہیں

۲۷- جتناسب لما اتنی گو چیڑی

۲۹- جیہڑا دیسی جیلو وال
کالی کنی نالو نال

۳۱- چھڑو وچ سرزتیاں، موہے کو لوں کھیوڑ نا

۳۳- سیانے وچ میں ننگی ننگی گری پٹ سنہدائی

۳۴- رستم جیسے بہادر وڈے، موت آئی تے وندا وے

۳۵- سجھیں ہتھ نہیں آوندی، دانشمنداں دی ست

۳۷- سانیاں جا بھجھ سوہن تہ ہانیاں

۳۹- مومناں نوں ہکو بند کافی اے

۴۱- کوٹھا ڈھاتے باہن بہوں
گھر اجاڑتے یاد بہوں

۴۳- کال تے لنگھ جاندا اے
پر کولیکھاں نئیں لنگھدیاں

۴۴- موئی بائی تے چِٹکی اشنائی

۴۵- منگ پرائی چیز
متاں اپنی وی ہووے

۴۶- ہمسائے ماں پیو جائے

۴۷- نِکا نِکا کم ترٹ موئی رن

۴۸- نوہاں پتر سمھالے تے دھیاں لے گئے ہور
بڈھا بڈھی رہ گئے جیوں سنھی تے چور

۴۹- یاراں نال بہاراں -

ج- طنز و ہجو

۵۲- آپ نہ جوگی تے گواہنڈھ ولائیں

۵۳- آلہ دے نوالے تے جیوے کھٹن والا ۵۴- اکھوں انھی تے ناں نور بھری ۵۵- اتوں لاالہ وچوں ہور صلاح - ۵۶- اتوں آئے ہور جنھاں اگلے دتے توڑ ۵۷- اوہ دیہاڑا اسڑیا جدوں کُبّا گھوڑی چڑھیا ۵۸- بلی نوں کھڑکایا مینہہ جا تا حلوا آیا - ۵۹- بھجے جٹ کٹورا لدھا پانی پی پی ڈھڈ اپھرا ۔ ۶۰- بڈھی گھوڑی لگی توتیاں دی جوڑی ۶۱- پاڑ نہ پڑھیا تے بیوی دا منتھا سڑیا ۶۲- پلے نہیں دھیلا تے کردی میلہ میلہ ۶۳- توں نہ گوری تیندڑیاں گا بیٹی گوریاں ۶۴- جیہے توں تے پتے تیراں واہ نی ماسی جہراں ۶۵- جٹے نوں بھل بھوائیا ٹبر لے کے بوہے آیا ۶۶- جٹ سونے دا تے تھلا پتل دا ۶۷- چوراں دے کپڑے تے ڈانگاں دے گج ۶۸- چٹا سر تے یہداں دینہہ اپھر ۶۹- چٹا دا اپڑا تے آٹا جھوے چ ۷۰- دوآنی دی کھوتی تے باراں آنیاں دا ڈھنگا - ۷۱- دوں رناں دیا سائیاں تینڈڑے نال کہیہ بنی آ ۔

۷۲- دو کوہ دریا تے سخن موہڈے تے ۷۳- رنڈا متا کڑما ڈی اپنی کرے کرپرائی- ۷۴- رن پرائی تے نوں بھوانٹری آئی ۷۵- رب ملائی جوڑی اک انھی تے اک کوڑھی ۷۶- سکدیاں چن چڑھیا، اوہ بھی ڈنگ پھڑ نگا ۷۷- سر گنجا تے کنگھیاں دے دو جوڑے ۷۸- سر سوہنی چنی تے ہتھ کالی گنی- ۷۹- سوئے کھوتی تے کھبے کھمہار ۸۰- سلام علیک تے ڈبالی آلے ویکھ ۸۱- سڑ گئی، بھاگو چھلیاں کھنڈیں ۸۲- شوقاں مرن دیاں تے خفن بھورے دا ۸۳- کیہڑی گلی جتھے بھاگو نہیں کھلی ۸۴- کچھاں ہیٹھ قرآن تے نظر ڈھگے تے ۸۵- کھوتی کھیریوں پھرکے آئی تے کھوتیاں، وچ رلدی نہیں ۸۶- کھاپی کے منہ کدھاں نال ۸۷- کوہ نہ ٹری تے بابیں ترہائی ۸۸- لوہ لوہ لدھیاں، لدواں تے سکدیاں پڑھی دعا ۸۹- ماسے دے ڈڈھلے بہوناہ تے بھتیواں آگر آگر پھرے ۹۰- مر گئے مردود نہ فاتحہ نہ درود ۹۱- ماں مولی تے پیو پیاز دھی کیسرے دی تری ۹۲- مرد ابولے نہیں جے بولے تے خفن پھاڑے ۹۳- منہ چوہی تے ڈھڈ کھوہی- ۹۴- نالے ماکہ تے چوہنڈیاں ۹۵- نہ آٹا نہ لوٹا تے ناں غلام شاہ، نہ دیوا نہ وٹی تے ناں چراغ شاہ

۹۶- نالے مور وکھا گیا نالے مچھاں نوں دے تاہ

باب ۱۲

دھنی قومی ادب میں

دھنی کی حسن خیز اور رومان پرور سرزمین جس کا مرکز چکوال کا معمورۂ رنگین اور ناظورۂ خود بین ہے کے ارد گرد پندرہ بیس میل کے قطر میں بعض ایسے خوبصورت مقامات و مناظر ہیں کہ جن کی رعنائی و دلکشی بعض بیرونی علاقوں کے فنکاروں اور شاعروں سے بھی خراج تحسین وصول کئے بنا نہیں رہ سکے چنانچہ اردو کے چند مایہ ناز اور قادر الکلام شعراء کے حسین و جمیل نظم پاروں کے چند ایسے اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں جن میں دھنی کے بعض پُر فضا تاریخی مقامات کے بارے میں ان کے تاثرات کی بھرپور

عکاسی موجود ہے اس سلسلے میں مولانا ظفر علیخان، چودھری ذکا، اللہ بسمل، پروفیسر احسان اکبر اور ڈاکٹر سید صفدر حسین کے رشحاتِ فکر زینتِ اوراق کئے جا رہے ہیں۔

۱

نام اس تحصیل کا چکوال ہے۔

خاکِ پاکستان کی یہ ڈھال ہے

(مولانا ظفر علیخان مرحوم)

(۲)

نیلہ

(نیلہ دھنی کا ایک رومان پرور اور پر فضا مقام ہے جو چکوال سے ۱۹ میل بجانب شمال، مغرب دریائے سواں اور للچھارن ندی کے سنگھم پر واقع ہے۔ دھنی کی لوک کہانی شیریں فرہاد اسی مقام سے تعلق رکھتی ہے)

قریۂ نیلہ کہ جس میں تھا مقامِ شاہ نیل
خوبیوں میں جو آسیدن شاہ سے کچھ کم نہیں
کثرتِ باغات اور آبِ رواں کی نغمگی!!
چاہ وہ جن کا کہ ہمسر چشمۂ زمزم نہیں!
جانبِ مغرب ہے دریائے سواں سے ہمکنار
کاکل پر پیچ سے کم جس کا اِک اِک خم نہیں
ساحلِ آبِ سواں پر ایک ٹیلہ مثلِ کوہ
جس کے پہلو میں اسے بربادیوں کا غم نہیں،
جانبِ مشرقِ للچھارن کے کنارے جلوہ گر
مدرسہ جس کی عمارت کم ز قصرِ جم نہیں
اس کے دکن کی طرف فرہاد و شیریں مست خواب

کونسی سی ہے آنکھ ان کے غم میں جو پُر نم نہیں؛

بٹ ہر اک پُر کیف اور کھیت ہر اک پر بہار
ایک بھی ذرہ نہیں، ہے جو سیما دم نہیں،

رات اور ابر پہ ہلکا ابر ہے چھایا ہوا
سو رہا ہے سازِ فطرت اس میں زیر و بم نہیں

(" بزمِ انجم " سے اقتباس از چوہدری نذر کا، اللہ بسمل)

(۳)

کلر کہار

[کلر کہار کا تاریخی و پُر فضا مقام چکوال سے بجانب جنوب مغرب، ۱۶ میل کے فاصلے پر چکوال سرگودھا شاہراہ پر واقع ہے یہ جگہ اپنی جھیل، اس کے کنارے سرسبز و پھلدار باغات، تختِ بابری اور روضہ سخی ہو ہوکی وجہ سے علاقہ دھنی میں ایک خاص تاریخی، مذہبی اور تفریحی اہمیت کی حامل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پر شہنشاہ ظہیر الدین بابر نے ۹۱۵ھ میں برصغیر کا سب سے پہلا مغل باغ لگایا تھا۔ جس کا نام "باغ صفا" ہے اس باغ کا ذکر تزکِ بابری میں موجود ہے شمس رانی اور ڈھول بادشاہ کا رومان بھی اسی جگہ پروان چڑھ کر لوک کہانی کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔

تھا موسمِ بہار کہ میں بخت ور ہوا
کلر کہار سے مرا یعنی گذر ہوا

وہ وادیٔ حسین وہ پہاڑوں کے سلسلے
پست و بلند کی وہ اکائی وہ رابطے

سرخی سے آگ سی لگی سب آس پاس میں
خونِ نظر تھا ہر گلِ مینا اساس میں

اس شام کی سیاہی میں مہکا ہوا وہ باغ
نالے فراق پہ بلبلوں کے پھولوں کے داغ

وہ شوقِ آرزو سے مرتبِ سوادِ شام،
ہر طائرِ نظر کے لبوں پر گلوں کے نام

مہکی ہوئی فضا میں وہ بھیگے ہوئے سے گیت
لہروں پہ آرزو کا وہ الجھا ہوا سے گیت

یوں منزلِ نگاہ میں تھا اس شام رہ گیا

[illegible]

یوں جوئے نغمہ ریز سے گرتی تھی آبشار
کٹ جائے جس طرح کوئی لمحہ ابد قرار

چھوٹا سا اک پہاڑ تھا پتھر کا اک صنم،
جس حسن کو پسند نہ تھا گردنوں کا خم

دیدار آنکھ سر کو اٹھا کر ہی پا سکے
مشکل سے اک نگاہ میں تجلی سما سکے

پگڈنڈیوں کی طرح وہ بل کھاتے راستے
خود ہی سمٹتے آپ سے شرماتے راستے

رستہ کا اک سرا تو میرے زیر پا رہا
تھا چادر سحاب میں مستور دوسرا

اترا ہوا ترنگ میں اس ابر و باد کی،
طے کر گیا چڑھائی سبھی کوہ زاد کی؛

ڈھلتی ہوئی نشیب میں بھرپور وادیاں
صفحے کی طرح پھیلی ہوئی صاف بستیاں

چھوٹے سے ان گھروں میں قناعت کا ایک رنگ
اک فرد کے لئے بھی گھروندے تھے در تنگ

اپنے وطن کی طرح ہر سادگی وہاں،
دیہات کی خموش صدا تک سے تھی عیاں

پن چکیاں تھیں اور مشینی خراس تھی
کوکو کی اک صدا تھی سو وہ بھی اداس تھی

بادل کو برسے دیر کچھ ایسی ہوئی نہ تھی
کشتِ خیال پھر بھی کسی کی ہری نہ تھی

اس شورش خیال کو روکا تو سامنے
بڑھ آیا سیل غم میرے دامن کو روکنے

چاروں طرف مرے وہی دنیا حسین تھی۔
نیلم کا آسمان تھا زمرد زمین تھی۔

لادیب سانپ بھی تھے اسی سبزہ زار میں
لیکن زمرد و افعی بہت خار میں

برسات کی بہار پپیہوں کا زور شور،
اور پاؤں دیکھ دیکھ کے روتے ہوئے وہ مور

ان کی تھی غرض اور کسی بارگاہ سے
ہم کانپ اٹھے تھے یونہی غم بے پناہ سے

فیضان تھا دعا تھی کہ بخشش کا زور تھا
ھل من مزید کا جو ہر اک سمت شور تھا

لگتا تھا جیسے فیض پیار دمین سے
پیروں کے بھی نشان اگیں گے زمین سے

پس منظر نگاہ کا دیکھا جو اہتمام
جانا بغیر گل بھی ہیں پھولوں کے چند نام

تصویر شوخ رنگ غم خوب و زشت کی
[illegible] بہشت کی

امریکی طرز کی وہ فرانی فرودگاہ، تھا نقش نقش جس کا حریم دل و نگاہ،
احساس دفعتہً ہوا اک انفعال کا۔ بنگلے میں عکس ہوتا میرے ماہ وسال کا

احسان تیرے دیس کی مٹی وہاں نہ تھی
مشرق کی ایک حور بھی زیب جناں نہ تھی

(پروفیسر احسان اکبر احسان)

(۴)

خوشاب سے چکوال تک

از

ڈاکٹر سید صفدر حسین،

کیا خوشاب سے چکوال کا سفر میں نے:
تو حسنِ ارض کو بھی پایا معتبر میں نے!

وہ دن تھے جن میں بہاروں کے جشن ہوتے ہیں۔
ہجوم گل میں نگاروں کے جشن ہوتے ہیں،

یہ مارچ کہتا تھا اپریل کی حدیں چھو کر!
کہ میں تو ختم ہوں، اب میری پیروی تو کر!

مزاجِ آب و ہوا کروٹیں بدلتا تھا!! !
صبا سے اپنا ہی آنچل نہیں سنبھلتا تھا!!!

شجر شجر میں اک اندازِ قامت خوباں!!
فضا میں سایۂ بہار رقص کناں!!

زمین کی گود بھرے کھیتیوں کی سرسبزی!
نشاطِ ذوقِ نظر۔ خُنکی جگر کی سبزی!

شہر شہر کے وہ تاینس سیاہ تیتر کی!
کہ جاگ جاتی تھی تصویر حسن سے منظر کی!

سفر تھا بس کا مسافر تھے ہر طریقے کے!
وہ آگے بیٹھے تھے جو لوگ تھے سلیقے کے!

انہیں کے وسط میں تھی ایک موہنی صورت:
خراج اپنا طلب کر رہی تھی وہ مورت!

میرا خیال تھا مصروف بُت تراشی میں:
نگاہ محو تھی۔ رخسار کے حواشی میں!

نظر اُچٹ کے جو ہر بار رُخ پہ جاتی تھی۔
تو اس کی آنکھ میں معصومیت سی پاتی تھی!

حیا و تمکنت اِک حسنِ اختلاط کے ساتھ
تھیں شوخیاں بھی نگاہوں میں احتیاط کیساتھ

غرض کہ ناز کا انداز بے ارادہ تھا!!
نظر اٹھائی تو چہرے کا صفحہ سادہ تھا!!

مری نگاہ نے چغلی جو شوق کی کھائی۔
غرورِ حسن نے لی بے نیاز انگڑائی!

اشارہ یہ تھا کہ فطرت کے ناز اٹھائے جا
فضا میں جذب ہو اور شعر گنگنائے جا!

کنایہ ضبط کا پا کر نگاہ جھینپ گئی!!
جو وقفِ عام تھے جلوے انہیں پہ جا پہنچی!

کرشمے محفلِ قدرت کے دشت و در میں تھے!
وہی سفر کے خم و پیچ پھر نظر میں تھے:

گزر کے کھیت جہاں سطحِ مرتفع آئی:
اسی کے بیچ سے اِک شاہراہ بل کھائی!

کہیں پہاڑ افقی تھے۔ کہیں عمودی تھے!
کچھ اخضری تھے مناظر تو کچھ کبودی تھے!
گماں ہوا۔ ہمیں "کلر کہار" کے نزدیک۔
ہم آ گئے ہیں۔ دیارِ بہار کے نزدیک!
کہ اس نگارِ سفر کا شعور جاگ اٹھا:
رخِ صبیح میں اندازِ تمکنت جھلکا!!
نظر میں کوند گئیں بجلیاں تبسم کی!
لبوں نے بانٹ دیں کیفیتیں ترنم کی!
کہ جیسے طائرِ آوارہ جب چمن میں آئے!
تو جوشِ حبِ وطن میں لطیف نغمے گائے!
پکارتا تھا تفاخر وطن ہمارا ہے!
جسے پسند ہو ٹھہرے چمن ہمارا ہے!
شعورِ حسن تھا۔ اس بت کے خد و خال میں محو!
میرا وجود تھا۔ کیفیتِ جمال میں محو!
کہ ناگہاں میرے کانوں میں اک سلام آیا!
سکوتِ منظرِ صحرا کا یہ پیام آیا!
کہ اے مبصرِ امروز۔ شاعرِ فردا!!
اٹھا کے دیکھ ادھر اپنی آنکھ کا پردا!
تلاشِ حسن میں چہروں پہ تو بھٹکتا ہے۔
ہر اک منظرِ فطرت ادھر سسکتا ہے۔
جو تجھ میں دیدۂ ہمدرد اس کو مل جائے!
بہار اپنے کلیجے کے زخم دکھلائے!

یہ جھومتے ہوئے پودے۔ یہ ناچتے ہوئے مور!
فضا میں نغمۂ یاھو کا گونجتا ہوا شور!
یہ پتھروں کے کلیجے سے پھوٹتے ہوئے چشمے!
ہیں اک ترنم سیّال ولولے جن کے!
یہ نوحہ خواں ہیں مناظر کی کس مپرسی کے!
یہ شکوہ سنج ہیں انساں کی کم نگاہی کے
یہ کہہ رہے ہیں کہ محروم التفات ہیں ہم!
بچھڑ کے پھر نہ ملیں گے وہ کائنات ہیں ہم!
ٹھہر سکے تو ٹھہر جا تیرا کرم ہوگا!
تیرے سلام کو ہر نخل اپنا خم ہوگا!
نہ رک سکے تو یہ اک حرفِ دوستی سن لے!
ہمارے سینۂ سوزاں سے زخم کچھ چن لے!
جو آگیا ہے تو کچھ یادگار لیتا جا!
اتر کے تحفۂ فصلِ بہار لیتا جا!

ضروری نوٹ

(انگریزی ادب)

انگریزی اگرچہ کہ دورِ غلامی کی یادگار اور ایک غیر ملکی زبان ہے۔ لیکن یہ مسلمہ بات ہے کہ فی الحال اسے ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے اور کسی غیر انگریز شخص کا اس میں مہارت حاصل کر لینا اور ایسے اشخاص سے بازی لے جانا جنکی یہ مادری زبان ہو بہت بڑا کمال ہے۔ چنانچہ دھنی کے باکمال لوگوں میں ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جنہوں نے انگریزی تحریر میں عالمگیر شہرت حاصل کر رکھی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر ضمیر احمد صدیقی اور قاضی غلام معبود قابل ذکر ہیں۔

۱۔ نام ضمیر احمد صدیقی پروفیسر۔ تعلیم ایم اے (علیگ) بی ٹی۔
مولد۔ لشکر ریاست گوالیار، مسکن۔ چکوال۔ سال پیدائش ۱۹۱۶ء

پروفیسر صاحب آج کل گورنمنٹ کالج چکوال میں شعبہ انگریزی کے صدر اور کالج میگزین، شمشیر کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ آپ نے میٹرک لارڈ ریڈنگ ہائی سکول دیتیہ (بھارت) سے کیا۔ بی اے کا امتحان، وکٹوریہ کالج لکھنؤ سے پاس کیا، ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے (انگریزی) کیا۔ آپ شروع سے ہی تعلیم و تدریس کے سلسلے میں منسلک رہے۔ تقسیم ملکی سے پہلے متحدہ ہندوستان میں آپ کئی ایک مدارس میں بطور ہیڈ ماسٹر کام کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۴۳ء - ۱۹۴۶ء کے دوران آپ ریاست دیتیہ کے وزیر اعظم

عین الدین کے پرنسپل اسسٹنٹ کے عہدے پر بھی فائز رہے ۔ پاکستان میں آنے کے بعد آپ زمیندارہ کالج گجرات ملٹری کالج جہلم میں بھی انگریزی علم و ادب کے استاد رہے ۱۹۵۴ء میں گورنمنٹ کی ملازمت اختیار کر لی اور آپ کی پہلی تقرری گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازیخان میں ہوئی ۱۹۵۵ء سے گورنمنٹ کالج چکوال میں تعینات ہیں ۔ نظم و ضبط میں آپ ماہر خصوصی تصور ہوتے ہیں ۔ آپ دو دفعہ ٹمپل کالج ریسرچ، اوکسفورڈ کی طرف سے منعقدہ مقابلہ مضمون نویسی میں تمام دنیا میں اول آ چکے ہیں ۔ پہلا انعام انہیں ۱۹۶۰ء میں ملا تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کا انگریزی مضمون مطبوعہ شمشیر بابت اپریل ۱۹۶۴ء زیر عنوان "اوکسومین فرسٹ پرائز ونر"

۲- نام - قاضی غلام معبود
تعلیم - بی اے ، بی ٹی -
مولد و مسکن - چکوال -
سال پیدائش - ۱۹۲۲ء

آپ کھوکھر قریش خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ آپ نے ۱۹۳۸ء میں گورنمنٹ ہائی سکول چکوال سے میٹرک کیا ، پھر فوجی ملازمت اختیار کر لی اور افواج پاکستان کے موجودہ ڈپٹی کمانڈر ان چیف لیفٹیننٹ جنرل عبدالحمید کی بلوچ رجمنٹ کی ایک کمپنی میں تعینات رہے دوسری جنگ عظیم کے دوران مصر ، لیبیا ، سسلی ، اٹلی ، اور یونان کے ممالک میں بھی جانے کا موقعہ مل گیا ، ۱۹۴۵ء میں فوجی ملازمت ترک کر کے گجرات میں راشننگ کنٹرولر کے دفتر میں بطور کلرک کام کرتے رہے ۔ آپ نے پرائیویٹ طور پر ادیب عالم کا امتحان یونیورسٹی میں دوم رہ کر پاس کیا ۔ ایف اے انگلش کا امتحان ۱۹۴۸ء میں صرف انگریزی امیدواروں میں یونیورسٹی بھر میں سوم رہ کر پاس کیا ۔ بعد ازاں محکمہ خوراک کی نوکری ترک کر کے ان ٹرینڈ انگلش ٹیچر کی حیثیت سے ڈسٹرکٹ بورڈ جہلم میں ملازمت اختیار کر لی اور ایک سال کے اندر منشی فاضل اور بی اے کے امتحانات پاس کر لئے ۱۹۵۱ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی ٹی کا ڈپلومہ حاصل کر کے گورنمنٹ ہائی سکول بوچھال کلاں سے ملازمت شروع کی آج کل آپ گورنمنٹ ہائی سکول چکوال میں سینئر انگلش ٹیچر ہیں ۔ شیخ حامد محمود مینیجنگ ایڈیٹر سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کی دعوت پر آپ نے انگریزی اخبارات کے بہرہ مراسلات میں بھی بھرپور حصہ لیا ہے آپ کے فکر انگیز مباحثات علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ۔ آپ پاکستان ٹائمز اور دوسرے انگریزی اخبارات میں شائع شدہ مراسلات کو کتابی شکل میں مرتب کر کے چھپوانے کی تیاریوں میں مصروف ہیں ۔

ضمیمه

پوٹھوہار کی حدود اور وجہ تسمیہ پر تحقیقی نظر

راولپنڈی ڈویژن کا وہ حصہ سوہادہ کی پہاڑیوں سے مغرب کی جانب تحصیل جہلم کے علاقے پوری تحصیل گوجرخان، پہاڑی علاقے کو چھوڑ کر پوری تحصیل کہوٹہ اور مارگلہ سے مغرب کا علاقہ چھوڑ کر، پوری تحصیل راولپنڈی پر مشتمل ہے۔ علاقائی طور پر پوٹھوہار کہلاتا ہے اور جب (۱۹۵۹ء) سے اسلام آباد، کو مملکت خداداد پاکستان کا صدر مقام چن لیا گیا ہے۔ تب سے ساری دنیا کو بالعموم اور اہل پاکستان کو بالخصوص اس علاقے سے دلچسپی سے پیدا ہو گئی ہے۔ اور اسی کے پیش نظر آج ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا ہے جو تاریخی حقائق و شواہد سے آنکھیں موندھ کر اس مخصوص اور محدود خطے کی حدود کو شمال، میں کوہالہ پل (آزاد کشمیر) سے جنوب میں سون سیکسر کی پہاڑیوں تک اور مشرق میں دریائے جہلم سے مغرب میں دریائے اٹک (سندھ) تک وسیع قرار دے کر اس تمام سرزمین کو پوٹھوہار مشہور کر کے چھچھ، تحصیل، اعوان قاری، دھنی اور دنہار کے مخصوص اور متعین علاقوں کی تخصیص سے انکار کر کے انہیں وسیع تر پوٹھوہار کے محدود حصے اسی طرح قرار دے رہے ہیں۔ جس طرح کسی بڑے شہر کے محلے ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ آب و ہوا، طبعی حالات، رسم و رواج اور لسانی ہم آہنگی کے اعتبار سے یہ تمام علاقہ ایک ہی ہے اور تاریخی طور پر پوٹھوہار عام طور پر اسی علاقے کا نام رہا ہے جو دریائے جہلم اور دریائے سندھ کے درمیان واقع ہے۔ ہندوستان میں مغلوں کی آمد سے پہلے بھی اسی علاقے کو پٹھوار کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور مغلوں کے عہد میں بھی اسے پوٹھوہار ہی کے نام سے پکارا جاتا رہا۔ عظیم تر پوٹھوہار کے جوشیلے علمبرداروں کے غیر تاریخی دعادی کی قلعی کھولنے سے پہلے بطور جملہ معترضہ کے گزارش ہے کہ مادر وطن کے وسیع تر مفادات کے پیش نظر محدود علاقائی نقطۂ نظر سے سوچنا میرے نزدیک کوئی خوبی کی بات نہیں۔ لیکن تاریخ کے مسلمہ حقائق کو مسخ ہوتے دیکھ کر چپ رہنا

اور بروقت احتجاج نہ کرنا علمی لحاظ سے ہمالیہ جتنی غلطی ہوگی اور دنیا ئے علم و خبر میں کئی دفعہ ایسی غلطیاں سرزد ہو چکی ہیں جب ایک دفعہ یہ غلطی کتب تاریخ میں داخل ہو گئی اور اس کی اصلاح کا مطالبہ بھی کسی جانب سے نہ کیا گیا تو پھر غلطی، غلطی نہیں رہتی بلکہ حقیقت بن جاتی ہے۔ کولمبس نے امریکہ کے قریب جزائر کا نام شرق الہند رکھ دیا تو وہ آج تک جزائر شرق الہند ہی کہلاتے ہیں اسی طرح امریکہ کی اصلی اور قدیم آبادی کو ایک بار سرخ ہندی کہہ دیا گیا تو وہ آج تک امریکہ کے اصلی باشندے ہونے کے باوجود سرخ ہندی ہی کہلاتے ہیں اسی قسم کی غلطی کے مرتکب عظیم تر پوٹھوہار کے علمبردار بھی ہو رہے ہیں۔ ضرورت تھی کہ تاریخ کے ناقابل تغیر و تبدل اور ٹھوس واقعات و دلائل کی روشنی میں ان خود ساختہ دعاوی کی تردید کر کے صحیح صورت حال کو علمی دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

علاقائی تاریخ کے واقف کار بخوبی جانتے ہیں کہ صدہا سال سے لوگ صرف اس علاقہ کو پوٹھوہار سمجھ رہے ہیں جس کی نشاندہی ابتدائی فقرے میں کر دی گئی ہے۔ یعنی ضلع جہلم کے مقامات سوہاوہ اور بکڑالہ کی درمیانی پہاڑی سے لے کر مشرق میں دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ اور اس سے آگے شمال میں پھیلے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں دریائے ہرو گولڑہ تک کا علاقہ، مغرب کی طرف اس کی حدود تحصیل راولپنڈی اور تحصیل گوجر خان کی حدود تک ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر نے اپنی تزک میں پوٹھوہار کے علاقہ کو رہتاس سے مارگلہ تک ہی قرار دیا ہے لسانی اعتبار سے بھی یہی علاقہ پوٹھوہاری کا گہوارہ ہے۔ پوٹھوہار کی حدود کو دریائے جہلم سے دریائے اٹک تک اور کالا پل سے سون سیکسر کی پہاڑیوں تک وسیع سمجھنا بالکل غلط اور خلاف حقیقت ہے۔

عظیم تر پوٹھوہار کے شیدائیوں کے اس علمی مغالطے کا شکار ہو جانے کا وجہ یہ ہے کہ انہیں تاریخ اور جغرافیہ کا باہمی باریک سا فرق سمجھ نہیں آرہا۔ حقیقت یہ ہے کہ جغرافیہ یا تو قدرتی اسباب کی بنا پر یا انسانی عمل کے تحت یا دونوں کے زیر اثر تغیر پذیر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ عمل تاریخ پر حاوی نہیں ہوتا۔ تاریخ تو ناقابل تغیر و تبدل اور پہاڑوں کی طرح محکم ہوتی ہے۔ یہ مختلف ادوار میں قوموں اور لوگوں کا پیچھا سائے کی طرح کرتی رہتی ہے۔ تاریخی واقعہ اتنا مضبوط اور

ٹھوس ہوتا ہے کہ وہ اپنا وجود تسلیم کروائے۔ بغیر چھین ہی نہیں لیتا۔ جیالوجی آف انڈیا کا مصنف مسٹر ڈی۔ این۔ واڈیا پہلا شخص ہے جس نے دریائے جہلم اور دریائے سندھ کے درمیان اس علاقے کو جو سلسلہ کوہستان نمک کے شمال میں واقع ہے ۱۹۵۷ء میں سطح مرتفع پوٹھوہار کا نام دیا ورنہ اس سے پہلے جغرافیائی طور پر بھی اس علاقے کا نام سطح مرتفع کوہستان نمک ہی تھا ثبوت کے لئے ملاحظہ ہو۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا زیر کلمہ پنجاب کی جیالوجی وایڈیشن ۱۹۵۰ء)

مسلمانوں کی آمد برصغیر ہند وپاک (۳۹۱ھ/۱۰۰۱ء) پر اس خطے کو نیلاب کا نام دیا گیا۔ ان کی آمد سے پہلے اس تمام علاقے کو جو دریائے جہلم سے پشاور تک پھیلا ہوا ہے۔ گندھارا کہا جاتا تھا جہانگیر جیسا کہ پہلے مذکور ہوا۔ پہلا مورخ ہے جس نے ہتھیہ سے مارگلا تک کے علاقے کا نام پوٹھوہار بتایا ہے ورنہ اس سے پہلے کسی تاریخ میں پوٹھوہار کا نام تک نہیں ملتا۔ علاوہ ازیں جہانگیر سے منسوب ایک ہندی دوہے سے بھی وسیع تر پوٹھوہار کے علمبرداروں کے دعوے کی تردید ہوجاتی ہے یہ دوہا حافظ محمود شیرانی مرحوم نے اپنے مقالات میں درج کر رکھا ہے ۔

چھچھ ہزارہ گذکاں چنگیاں   دھنی کھوب گاہیں
سور سیکرتی گھوڑ بھلے   ہشتنگر کے دھاہیں

یہ دوہا اس بات کا قطعی ثبوت مہیا کر دیتا ہے کہ جہانگیر کے عہد میں چھچھ دھنی اور پوٹھوہار الگ الگ اور مشخص علاقے تھے۔ جہانگیر کی تحریر مندرجہ تزک سے علاقہ پوٹھوہار کی شرقاً غرباً لمبائی کا تعین بخوبی ہوجاتا ہے کہ وہ ہتھیہ سے مارگلا تک ہے لیکن شمالاً۔ جنوباً چوڑائی غیر فیصل رہ جاتی ہے، البتہ یہ دوہا پوٹھوہار کے مغرب میں علاقہ دھنی کی نشاندہی کو کے بطور قول فیصل کے کہہ رہا ہے کہ تحصیل گوجر خان کی مغربی حدود سے آگے پوٹھوہار کا علاقہ ختم ہو جاتا ہے۔ سون سیکسر کی پہاڑیاں تو بہت دور ہیں۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے اعوان قاری دھنی اور ونہسار کے علاقے عبور کرنے پڑتے ہیں۔

ان تاریخی اور علمی شواہد کے پیش نظر یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ عظیم تر پوٹھوہار کے علمی اداروں کے قول کے مطابق پوٹھوہار ایک وسیع علاقے کا نام نہیں اور نہ دھنی گھیبی ونہار اعوان قاری اور چھچھ اس وسیع تر علاقے کے محدود حصے ہیں۔ بلکہ پوٹھوہار خود مع مذکورہ بالا علاقوں کے نیلاب یا گندھارہ کا ایک محدود اور مشخص حصہ ہے البتہ اسے یہ شرف ضرور حاصل ہے کہ مملکت خداداد پاکستان

کے دارالحکومت اسلام آباد کی تعمیر کے لئے نظر انتخاب اس پر ضرور پڑی۔ پوٹھوہار کی وجہ تسمیہ کے متعلق حتمی طور پر آج تک کچھ نہیں کہا گیا۔ علاقہ پوٹھوہار میں گوجر خان کے قریب ایک قدیم قصبہ گلیانہ کا مسمی دنی چند مصنف کیگوہر نامہ رقم طراز ہے کہ اس علاقہ کی سرسبزی اور پھولوں کی کثرت سے متاثر ہو کر سلطان شہاب الدین غوری (۱۲۹۲-۵ ۔ ۱۳۰ء) نے اس علاقے کو "پوپ ہار" کہا اور پوٹھوہار اسی پوپ ہار کی بگڑی شکل ہے۔ دنی چند کا ایک شعر ہے ؎

زمینش خوش ہوائے وخوش بہار است زرعنائی گلستان "پوپ ہا" است

یاد رہے کہ کیگوہر نامہ گکھڑ قبیلہ کی فارسی زبان میں تاریخ ہے۔ لیکن وسیع تر پوٹھوہار کے علمبرداروں کے ہاں بھی اس کتاب میں دیئے گئے واقعات تاریخی اعتبار سے مستند نہیں ہیں اور نہ اس تاریخ کا ہیرو شہزادہ کیگوہر سلطان محمود غزنوی کا کوئی معروف یا غیر معروف جرنیل ہی تاریخی وجود ثابت کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں لغوی طور پر پوپ کا معنی پھول یا کلی بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ سنسکرت، فارسی، کشمیری، اور پنجابی زبان میں اس لفظ کا یہ مفروضہ معنی کہیں نہیں پایا جاتا بفرض محال اگر یہ ترکیب مسمی دنی چند کی ایجاد بندہ قسم کی نہ بھی ہو تو بھی پوٹھوہار کا اطلاق صرف اسی خطہ پر ہو سکتا ہے، جہاں سلطان محمد غوری کی شہادت گاہ دھمیاک آباد ہے اور یہ گاؤں آج تک سوہاوہ سے چند میل، کے فاصلے پر شمالی سمت میں واقع ہے۔ یعنے وہی علاقہ جسے جہانگیر ہتھیہ سے مارگلا تک بتاتا ہے اور وجہ تسمیہ کے بارے میں یہ بھی ہمیں کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچاتی لیکن ایک بات تو یقینی ہے کہ اس علاقے کا یہ نام جہانگیر کے عہد سے کہیں پہلے پڑ چکا تھا جو کہ اس کے زمانے میں زبان زد عام تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ تعیین زمانی کے سلسلے میں تاحال ہمارے پاس کوئی مستند حوالہ نہیں

لیکن اس ضمن میں مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں علم اثریات وصنمیات کی رو سے معلوم ہوتا ہوتا ہے کہ ازمنۂ قدیم سے علاقوں یا مقاموں کا نام اسم الٰہ کے اشتقاق کی۔ رعایت یا کسی مشہور شخصیت یا کسی جغرافیائی نشان یا غالب اکثریت کے حامل قبیلہ کی آبادی کی بدولت ہی رکھا جاتا رہا ہے۔ مثلاً بابل کا نام باب ایل (بیت اللہ) اربیل کا نام اربعہ ایلو (چار دیوتاؤں کی پرستش کا شہر) تھا ضلع ہزارہ میں ایک جگہ تربیلا نامی ہے۔ جہاں دریائے سندھ پر ایک عظیم الشان بند باندھنے کے منصوبہ کا آج کل بڑا چرچا ہے اس جگہ کا اصلی نام تریا ایلو (تین دیوتاؤں کے پوجنے کی جگہ)

ہے۔ ایران کا نام آریوں کے وطن کی رعایت سے آریانہ اور پھر ایران پڑ گیا۔ گندھارا وادی کا نام گندھار یہ آریہ قبیلے کے ایک سربراہ کے نام سے مشہور ہوا اسی طریقہ سے جب پوٹھوہار کے اشتقاق لفظی پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ پوٹا + وار سے مرکب ہے جامع اللغات میں، پوٹھا کے متعدد معنے دیئے گئے ہیں منجملہ خاندانی دیوتا، داڑھی دار عورت، ایسا جانور یا شخص جس میں زنانہ مردانہ نشانیاں موجود ہوں بھی ہیں۔ وار بقول پروفیسر ہوڈی والد کے قدیم اوستا کا لفظ ہے جس کے معنے احاطہ، قطعہ اراضی کی احاطہ بندی (ENCLOSURE) ہیں اس لحاظ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس علاقے میں کسی وقت ایسے دیوتا کی پرستش کی جاتی ہوگی، جو غالباً گکھڑ قوم کا خاندانی دیوتا تھا۔ اور اس میں زنانہ و مردانہ نشانیاں پائی جاتی تھیں۔ اسی دیوتا کی رعایت سے اس علاقے کو پٹوار یا پوٹھوہار کہا جانے لگا۔ اس نتیجہ کی تائید ایک اور ذریعہ سے بھی ہو سکتی ہے کہ جنرل کننگھم نے بقول مسٹر ٹالبٹ ایک مشکوک روایت کی بنا پر دریائے جہلم کا قدیم نام پوٹا بتایا ہے اور پوٹا کی رعائت سے اس کے مغرب میں واقع علاقے کا نام پوٹھوہار پڑ گیا۔ دریائے جہلم کے متعلق یہ روایت کہ اس کا قدیم نام پوٹا تھا ممکن ہے مشکوک ہو لیکن پوٹا کی رعایت سے اس علاقے کا نام پٹوار یا پوٹھوہار پڑ جانا یقینی ہے یہ نام کس عہد میں پڑا اس کے تعین کے لئے سطور ذیل کو بغور ملاحظہ فرمایا جائے۔

برصغیر کی قدیم تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۳۰۰ سے ۷۰۰ء کا زمانہ (گپتا خاندان کا عہد) تاریخ ہند و پاکستان میں پرانوں کا دور کہلاتا ہے کیونکہ اس عہد میں ۱۸ پران تصنیف ہوئے یہی وہ زمانہ تھا جب جدید ہندو مذہب کی بنیاد پڑی۔ بدھ اور جین مذہب والوں کو نیچا دکھانے کے لئے برہمنوں نے اپنے مذہب اور سنسکرت زبان کی پرزور تبلیغ کی اور بت پرستی کو رواج دیا اس دور میں اپنشدوں کی تعلیمات اور ویدوں کے معبود پس پشت جا پڑے۔ جو معبود ویدی دور میں ثانوی اہمیت کے حامل تھے وہ اول درجہ کے معبود بن گئے۔ مثلاً وشنو کی شان میں رگوید میں صرف پانچ بھجن ہیں اور وہ محض سورج دیوتا ہے۔ لیکن اب خدا تعالےٰ بن گیا۔ اسی اپنشدوں کے برہمن (بے جنس دیوتا) کی جگہ برہما (مذکر دیوتا) نے لے لی۔ وہ اپنے پیشتر و کی مسخ صورت ہے الغرض برہما وشنو اور شو (یا مہیش) ہندوؤں کے سب سے بڑے معبود بن گئے یہ تینوں الگ الگ دیوتا،

نہیں بلکہ ایک ہیں۔ کبھی کبھی ان کا مجسمہ یوں بنایا جاتا ہے کہ ایک ہی انسان کے جسم پر تین سر لگا دیئے جاتے ہیں ایسے بت کو تریمورتی کہتے ہیں اور غالباً تربیلہ کے مقام پر اسی تریمورتی کی پوجا کی جاتی تھی

۶۳۰ء میں جب مشہور چینی سیاح ہیون سانگ اس علاقے سے گزرا تو اس وقت یہ سب علاقہ ہنوں کی تاخت و تاراج کے باعث اجاڑ و بے آباد تھا۔ اس لئے اس کے سیاحت نامہ میں اس علاقے کے حالات کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ البتہ قدیم تاریخوں سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ نویں صدی عیسوی تک اس علاقہ پر کشمیر کے ہندو راجگان کا قبضہ رہ چکا ہے جن کا مذہب کبھی بدھ، کبھی شومت کبھی الحادانہ رہا جس مذہب کا راجہ ہوا ویسی ہی پرجا ہو گئی (الناس علیٰ دین ملوکھم)

پوٹھوہار کی وجہ تسمیہ کے متعلق میری تحقیق یہ ہے کہ جب اس علاقے پر کشمیر کے قدیم ہندو راجگان کی حکومت تھی اس وقت اس علاقے میں شکتی پوجا کا عام رواج تھا اس مذہب کے ماننے والے شکتی کے بھگت تھے جو خدا کو بحیثیت ماں کے مانتے ہیں آج کل اس فرقہ کا بنگال میں سب سے زیادہ زور ہے۔ عوام کے مذہب میں شکتی کو شو کی بیوی مانا جاتا ہے۔ جس کے بہت سے نام ہیں۔ مثلاً اما۔ پاربتی، درگا اور کالی۔ شکتی کے ماننے والے فلاسفر روح کو مذکر اور مادے کو مؤنث مانتے ہیں جنہیں پرش اور پراکرتی کہتے ہیں۔ انہی کے ملنے سے سارے عالم کی تخلیق ہوئی۔ ہندوؤں کا مشہور بت "اردھاناری ایشوری" بھی اسی چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے اس کا داہنا حصہ مردانہ اور بایاں حصہ زنانہ دکھایا جاتا ہے۔ اور اعضاء جنسی کو صلیب کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ جو زنانہ اور مردانہ اعضاء کے اتصال باہمی کی نشانی ہے۔

ہندو مذہب میں دیوی دیوتاؤں کی کل تعداد ۳۳ کروڑ ہے ان میں ہر ذات ہر خاندان اور ہر گاؤں کے الگ الگ دیوتا ہوتے ہیں۔ سنسکرت کے "اردھاناری ایشوری" (ایسی دیوی جو آدھی عورت اور آدھی مرد ہے) کا مترادف لفظ کشمیری سنسکرت کا پوٹھا ہے۔ جیسا کہ لغوی تحقیق سے اوپر ثابت کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا پوٹھا دیوتا کی پرستش کا علاقہ پوٹھوہار کہلایا۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کی شمال مغربی ہندوستان میں آمد (۱۰۰۱ء) سے پہلے "اردھاناری ایشوری" کا نام پوٹھا میں تبدیل ہو چکا تھا اور بعد از کی پوٹھا کو منگلا کے نام سے پکارا جانے لگا۔

اس لسانی تبدیلی کا ثبوت یوں مہیا کیا جا سکتا ہے کہ آریوں کے ہاں جنگجو طبقہ کا نام قدیم سنسکرتی

زبان میں کھشتری ہے لیکن مسلمانوں کی آمد ہند سے پہلے انہیں ٹھاکر کا مجموعی نام دیا جا چکا تھا اور پھر یہ رائے، رانا اور راوٹ کی تین شاخوں میں منقسم ہو کر راجپوت کہلانے لگے اس طرح گویا موجودہ زمانے کے راجپوت عہد وسطیٰ کے ٹھاکر اور عہد قدیم کے کھشتری ہیں بعینہٖ کشمیری زبان، کا پوٹا سنسکرت کا اردھاناری ایشوری تھا اس دیوی کا مندر آج کل بھی منگلا (آزاد کشمیر) کے مقام پر موجود ہے اور مقامی طور پر اس جگہ کو "مائی منگلاں" کہا جاتا ہے

(بشکریہ ہفت روزہ لیل و نہار لاہور بابت ۹ جون ۱۹۶۳ء)

ضمیمہ

شاہ حسین کے دیس اور زبان پر تحقیقی نظر

اب کے شاہ حسین کے میلہ پر گورنمنٹ کالج لاہور کے بخاری آڈیٹوریم میں شاہ حسین کی زندگی اور انکی صوفیانہ شاعری کے بارے میں مضمون پڑھنے کے لئے مجھے بھی موقعہ ملا۔ اپنا مقالہ پڑھنے کے دوران ان کی کافیوں کی زبان کی شہادت کی بنا پر میں نے گذارش کی تھی کہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ شاہ حسین نے اپنی زندگی کا ایک حصہ تو ضرور لاہور میں بسر کیا تھا اور مادھو کے عشق نے انہیں اپنی محبت میں ایسا رنگ لیا تھا کہ آخر کار آپ اسی خاک میں سما گئے، لیکن میں یہ کہنے سے نہیں رہ سکتا کہ ان کی زبان کی شہادت یہ ہے کہ وہ نہ صرف لاہور بلکہ سارے علاقہ ماجھا سے کہیں باہر کے باشندہ نظر آرہے ہیں:۔

میری کا یہ بات سن کر چند علم دوست حضرات کے مابین کھسر پھسر شروع ہو گئی، بعض دوستوں نے میری تائید بھی کی لیکن بعض دوست ایسے بھی تھے جنہوں نے اس بات کو پوری اہمیت نہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے کہ ان کی زبان ٹکسالی اور ماجھی زبان سے الگ تو ضرور ہے۔ لیکن اکبر بادشاہ کے عہد میں لاہور کی زبان آج کی زبان سے مختلف تھی ایک دوست نے ہاشم شاہ کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ ہاشم شاہ ضلع ہوشیار پور لے کے رہنے والے تھے لیکن ان کی زبان دوابی نہیں بلکہ لہندی ہے

لے ہاشم شاہ ضلع امرتسر کے تھے ہوشیار پور کے نہیں (ایڈیٹر)

اس وقت تو میں خاموش رہا کیونکہ اس وقت میرے پاس ہاشم شاہ کے بارے میں کوئی، ثبوت نہیں تھا۔ لیکن اب جبکہ تحقیق کی تو پتہ چلا کہ ہاشم شاہ نام کے دو شاعر ہو گذرے ہیں۔ دونوں ضلع، امرتسر میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ ہوشیار پور میں ہاشم شاہ نام کا کوئی شاعر نہیں ہوا اگر ہوا بھی ہو تو اس کا ذکر تذکروں اور ادبی تاریخوں میں نہیں ملتا۔

یہ بات تو بالکل درست ہے کہ تحقیق کے میدان میں حرف آخر کوئی بات نہیں ہوتی پر علماء کی رائے میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے دلائل ایسے ہونے چاہئیں جو ٹھوس اور اٹوٹ ہوں۔ آج کی صحبت میں میں اپنی تحقیق اس امید کے ساتھ "پنجدریائی احباب" کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ وہ حضرات ازراہ کرم میری رائے یا دعوے کے حسن و قبح سے مجھے مطلع فرمائیں گے

تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ شاہ حسین کے والد کا نام شیخ عثمان اور دادا کا نام جو کہ ہندو تھا، کلجس رائے یا کلس رائے تھا وہ شہر لاہور کے کھتری اور قوم کے ڈھڈی تھے۔ فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱-۸۸ء) کے زمانے میں مسلمان ہو گئے۔ وہ ہندو ہونے کے زمانے میں اور مسلمان ہونے کے بعد کیا کام کرتے رہے اس ضمن میں سب خاموش ہیں البتہ شاہ حسین کے والد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا پیشہ بافندگی تھا اس وجہ سے شیخ عثمان کے فرزند کو حسین جولاہا بھی کہا جاتا تھا ہر کوئی کہتا ہے کہ شاہ حسین ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء میں ۶۳ برس کی عمر میں فوت ہو گئے "محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں۔ کہ شاہ حسین کی پیدائش کے وقت ان کے باپ شیخ عثمان تل بگھہ نام کے ایک محلے میں رہتے تھے جو کہ ٹکسالی دروازہ سے باہر دریائے راوی کے قریب تھا تل بگھا تل ٹیلے کا بگڑا نام ہے۔ تل بگھہ کی مسجد میں ایک بزرگ امامت کے فرائض سرانجام دیتے تھے جن کا نام حافظ ابوبکر تھا اور وہ بچوں کو بھی پڑھاتے تھے

حافظ صاحب ضلع جہلم کی تحصیل پنڈدادنخان کے ایک مشہور گاؤں بگہ کے رہنے والے تھے۔ قدیم زمانے ہی سے یہ گاؤں علماء و فضلاء کا مسکن چلا آرہا ہے۔ شاید ان بزرگوں کے نام ہی سے اس محلے کا نام تل بگھ پڑ گیا ہو حسین نے ابتدائی تعلیم اسی محلے کی مسجد میں حافظ ابوبکر سے ہی حاصل کی اور عالم طفلی میں ہی چھ سیپارے حفظ کر لیے"

(بحوالہ رسالہ نقوش کا لاہور نمبر ۲۳۹)

جہاں تک آپ کی قومیت کا تعلق ہے ہر کوئی آپ کو ڈھڈی کھتری ہی کہتا ہے۔ لیکن مولوی محمد دین شاہ پوری مصنف "باغ اولیائے ہند" کہتے ہیں کہ شاہ حسین کے ننھیال ڈھڈی راجپوت تھے ددھیال کس ذات کے تھے؟ کوئی جواب نہیں ملتا۔ ڈاکٹر لاجونتی راما کرشنا نے اپنے انگریزی مضمون SHAH-HUSSAIN HIS-LIIFE & WORK میں آپ کو راجپوتوں کے دت قبیلے کا فرد لکھا ہے اور غلام یعقوب انور لکھتے ہیں کہ شاہ حسین ڈہڈی قوم کے تھے۔

(بحوالہ رسالہ شاہ حسین دی باد وچ)

اس بحث سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ حسین کی قومیت کے بارے میں کوئی پختہ اور یقینی بات نہیں کی گئی۔ مسٹر ابٹسن رپورٹ مردم شماری میں لکھتے ہیں کہ ڈھڈی جاٹ ریاست کپور تھلہ میں پائے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شاہ حسین کی قومیت کے متعلق جو رائے غلام یعقوب انور کی ہے وہ صحیح ہے تحصیل پنڈدادنخان میں ڈہڈی نام کا ایک گاؤں بھی ہے اور ایک علاقے کا مقامی نام "ڈہڈی بھچھرا" بھی ہے۔ ڈہڈی قوم میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ تحصیل جہلم میں بقول چوہدری ذکاء اللہ بسمل وکیل ڈہڈی قوم کے لوگ موجود ہیں۔ شہر گجرات میں بھی ڈہڈیوں کا ایک خاندان موجود ہے۔ اس خاندان کی مشہور شخصیت میجر محمد زمان ہیں۔

اب دو باتیں ہو سکتی ہیں یا تو شاہ حسین ڈہڈا خاندان کا فرد تھا جس کو صاحب باغ اولیائے ہند نہیں مانتا جس خاندان کے کچھ لوگ بقول ابٹسن ریاست کپورتھلہ میں موجود ہیں یا وہ ضلع جہلم کی تحصیل پنڈدادنخان کے علاقے میں واقع موضع ڈہڈی کے تھے۔ اگر انہیں ریاست کپورتھلہ یا لاہور کا باشندہ قرار دیں تب زبان ساتھ نہیں دیتی اور اگر ضلع جہلم کا تسلیم کریں تو تب زبان بھی گواہی دیتی ہے نیز ایک دوسری شہادت بھی موجود ہے جو کہتی ہے کہ شاہ حسین کی پیدائش لاہور سے باہر کسی جگہ

کی تھی لیکن پڑھنے کے لئے وہ لاہور آ گئے تھے یہ گواہ بخشی رام سنگھ درویش مصنف "سات ستارے" ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن درویش جی کی دوسری باتوں سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ شاہ حسین سید گھرانے کے تھے کیونکہ حسین کو شاہ ان کی فقیری کی وجہ سے کہا جاتا ہے نہ کہ سید ہونے کی بنا پر۔ ہاں یہ بات ضرور دل لگتی ہے کہ وہ پڑھنے کے لئے لاہور آئے تھے ان کا جنم لاہور کا نہیں تھا۔

مادھو لال حسین کے حالات اور کافیوں کی جو کتاب ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے ایڈٹ کی ہے اس کے دیباچے میں شاہ حسین کی زبان کی خصوصیات گنواتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں ادبی پوٹھوہاری کی جھلک موجود ہے۔ (ص ۱۵)

اس کے علاوہ پنجابی زبان کی مقامی بولیوں کی تقسیم کرتے ہوئے "پنجابی زبان وا ادب تے تاریخ" کا مولف عبدالغفور قریشی اپنی کتاب کے ص ۹۱-۵۹۰ پہ لکھتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کی قدیم بولیوں کے نمونے ہمیں عہد قدیم کی سندوں، مذہبی کتابوں، کتبوں اور سکوں سے ملتے ہیں۔ ان میں کئی لفظ ایسے ملتے ہیں جو آج بھی دیہاتیوں کی زبانوں پہ عام چڑھے ہوئے ہیں ....

آگے چل کر لکھا ہے کہ پنجابی زبان کی بڑی بڑی بولیاں یا لہجے درج ذیل ہیں۔ جنہیں مقامی زبان کہا جاتا ہے!

۱۔ ملوئی۔ مالوے کی بولی ہے۔ لدھیانہ، فیروزپور، پٹیالہ، فرید کوٹ، جیند اور نابھ میں بولی جاتی ہے اس کی پہچان یہ ہے کہ کئی دفعہ ٹکسالی یا ماجھی بولی کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً کٹھ، چر اصل میں اکٹھ اور وچ یا وچہ کا روپ ہے۔ دوسرے اس میں "و" کی جگہ "ب" اور "م" زیادہ بولا جاتا ہے۔ جیسے لیاماں موہرے وغیرہ اس علاقہ میں مکھے (میں آکھیا) تھوتوں، تیں، کتھ جی بولا جاتا ہے۔

۲۔ دوآبی۔ جالندھر ہوشیارپور کپورتھلہ کی بولی ہے دراصل یہ ماجھی اور ملوئی کا میل ہے

۳۔ پوادھی (ہمارے موضوع کے ساتھ متعلق نہیں ہے)

۴۔ ماجھی یا ٹکسالی۔ یہ بولی لاہور، امرتسر گورداسپور کے لوگوں کی بولی ہے اس کا اپنا رنگ ہے کتابوں کی پنجابی زبان دراصل یہی مقبول ہے۔

۵۔ ڈوگری (غیر متعلق ہے)

۶ - پوٹھوہاری - یہ جہلم سے پار پوٹھوہار کے علاقے میں بولی جاتی ہے - اس علاقے میں راولپنڈی، کیمبل پور، گجرات وغیرہ شامل ہیں - پوٹھوہار میں مُکھّی تکھّی، اچھنا گچھنا کتھے تہاڈے وغیرہ الفاظ زیادہ استعمال کئے جاتے ہیں -

۷ - لہندی - ملتانی - یہ جھنگ ملتان منٹگمری اور بار کے جانگلی قبائل کی بولی ہے ..... اس پر عربی کا اثر زیادہ ہے - کئی الفاظ کے شروع میں د، د، کی جگہ، ڈ، ی، کی جگہ ہ، بولا جاتا ہے - مثلاً ڈھاگن - ڈیر - ڈی، ہک، ہینھا - ڈو - بھیوم، بھیو - ہینڈے، تینڈے وغیرہ -

یہاں پر اس بات کا فرق واضح کر دینا ضروری ہے کہ پوٹھوہار کی حدود میں گجرات اور کیمبل پور نہیں آتے - پوٹھوہار بموجب تزک جہانگیری ہتھیہ (نزد سوہاوہ) سے مارگلہ تک ہے اور بس اسی طرح لہندی اور ملتانی میں بھی باریک سا فرق ہے - جسے قریشی صاحب نے نظر انداز کر دیا ہے اس فرق و اختلاف کی مفصل بحث میں اپنے ایک مضمون "دھنی کا لسانی اور ثقافتی جائزہ" میں کر چکا ہوں - جو کہ رسالہ پنج دریا لاہور بابت اگست ۱۹۶۵ء میں شائع ہو چکا ہے اور ثابت کیا ہے کہ پوٹھوہاری کوئی تحریری زبان نہیں صرف بولنے میں استعمال ہوتی ہے - دوابہ سندھ ساگر کی ادبی اور معیاری زبان صرف لہندی دھنی کا روپ ہے اور علاقہ دھنی اعوان قاری دہنار اور ضلع شاہ پور کے پہاڑی اور بکھر کے علاقے پر مشتمل تمام خطہ کی مجموعی زبان کا نام لہندی ہے

آگے بڑھنے سے پہلے ایک لطیفہ سنتے چلیئے دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میرا ایک عزیز ہانگ کانگ میں ملازم تھا وہاں پر گجرات، سیالکوٹ، جہلم، جالندھر اور ہوشیار پور کے بھی بہت سے لوگ ملازم تھے - پنجابی میں گفتگو کرتے ہوئے میرا جہلمی عزیز دت، وت کا زیادہ استعمال کر رہا تھا ایک دن کسی غیر جہلمی نے ٹوکتے ہوئے کہا کہ بابو صاحب آپ جو وت وت کہتے ہیں یہ آپ کی کیا لگتی ہے؟ میرے عزیز نے جواب دیا کہ یہ آپ کی "سگوں" کی چھوٹی بہن ہے (مطلب یہ ہے کہ ہر علاقے کے دیہاتیوں کی زبان پر ایک آدھ ایسا لفظ چڑھا ہوتا ہے کہ اس کے استعمال سے بخوبی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ آدمی کس علاقے کا باشندہ ہے اس سلسلے میں میں نے جو معیار تمیز مقرر کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ امرتسر لاہور اور گورداسپور کے لوگ "مٹر" اور "سگوں" کا استعمال زیادہ کرتے ہیں - اسی طرح سیالکوٹ، گجرات، گوجرانوالہ، اور شیخوپورہ کے لوگ "مٹر" اور جہلم، سرگودھا

۶ - پوٹھوہاری - یہ جہلم سے پار پوٹھوہار کے علاقے میں بولی جاتی ہے۔ اس علاقے میں راولپنڈی، کیمبل پور، گجرات وغیرہ شامل ہیں پوٹھوہار میں مگھی گھی، اچھنا گچھنا، کتھے، تہاڈے وغیرہ الفاظ زیادہ استعمال کئے جاتے ہیں۔

۷- لہندی - ملتانی - یہ جھنگ ملتان - منٹگمری اور بار کے جانگلی قبائل کی بولی ہے ..... اس پر عربی کا اثر زیادہ ہے۔ کئی الفاظ کے شروع میں ، د ، کی جگہ ، ڈ ، ی ، کی جگہ ، ہ بولا جاتا ہے ، مثلاً ڈھاگون ڈھیر - ڈی - ہک ، ہینجا ، ڈو ، بھیوکم ، بھیں ، میڈے ، تیڈے وغیرہ۔

یہاں پر اس بات کا فرق واضح کر دینا ضروری ہے کہ پوٹھوہار کی حدود میں گجرات اور کیمبل پور نہیں آتے ، پوٹھوہار بموجب تزک جہانگیری بقیہ دنیز دسو ہاوہ)

اسی طرح سیالکوٹ ، گجرات ، گوجرانوالا اور شیخوپورہ کے لوگ ، مڑ اور جہلم ، سرگودھا ، میانوالی اور کیمبل پور کے لوگ ، وت ، کا استعمال چو کھا کرتے ہیں ، اب آپ مثالیں ملاحظہ فرمایئے

۱- مڑ کا لفظ ہاشم شاہ ولد حاجی محمد شریف قوم قریشی موضع جگدیوں کلاں ضلع امرتسر (پیدائش ۱۱۶۶ھ) میں پیدا ہوئے اور موضع تھرپال متصل دھیہ ضلع سیالکوٹ میں ۱۲۲۹ھ میں فوت ہوئے قبر بھی یہیں پر ہے ، سسی پنوں ، سوہنی مہینوال وغیرہ کئی قصوں کے مصنف تھے - نمونہ کلام ہے

اوڑک وقت قہر دیاں کوکاں سن پتھر ڈھل جاوے
جس ڈاچی میرا پنوں کھڑیا مڑ دوزخ دے ول جاوے
پھر مڑ سمجھ کرے لکھ تو یہ منتھوں بہت بے ادبی ہوئی
جس پر یاد کرے اسواری تس دے جیڈ نہ کوئی

۲- ہاشم شاہ مخلص ولد شاہ محمد تاریخ پیدائش ۱۸۳۰ء بمقام وڈالہ ویرم ضلع امرتسر اور وفات ۱۸۹۵ء میں ہوئی - آپ کا سسی پنوں کا قصہ مشہور ہے ، سگوں ، کا استعمال ملاحظہ ہو

ز ز دو گھریں سگوں شور پا دیں وچ شہر بھنبور دے کدی رہ ساں نہیں اگ جدائی دی ٹکھ دیندی بانجھوں یار کس نوں دل دا بھیت کہہ ساں

۳- شاہ شرف بٹالوی (۱۶۵۹-۱۷۲۵ء) آپ کا مزار لاہور میں ہے - مڑ کا استعمال دیکھئے

(۱) جے کو نہتر قبول نہ کرے دا مڑ روز ازل

واقف رمز نہ ہوندا مڑ کے عشق جمیل نہ پاندا گل

(ب) ایہ جا نجھی مانی مڑ گھر آوے محلیں وڑیا شور وے اڑیا

۴ - مولوی غلام رسول صاحب سکنہ قلعہ میہاں سنگھ ضلع گوجرانوالہ کے ہاں بھی مڑ کا استعمال موجود ہے

لتھی مستی چڑھی غم دی خماری چلا مڑ ساڈنی دی کر اسواری

۵ - محمد فضل جہلمی کے کلام میں 'وت' کا استعمال کیا گیا ہے ۔

کت تانی جوڑ بن اکڑے کت چرخ چھوپے گھت کڑے

نہیں آونا جوبن وت کڑے

۶ - میاں الٰہی بخش کنڈل ضلع جہلم ۔ سسی پنوں کے قصے سے 'وت' کے استعمال کے چند نمونے ملاحظہ ہوں ۔

جہاں وت الیہ گل سنی شہزادے نکلی لنب جگر بھئیں !

قہر قلوب تنور غماں وا تتا روز حشر بھئیں ،

کھولیا قفل زکالے اندروں لاٹاں قطب ستارا

یا وت خاص سہیل یمن وا مار رہیا چمکارا ،،

یا وت پری پرستان والی تاتاری جھلکارا ،،

الٰہی بخش الہیہ حور العینی کیتا حسن پسارا ،،

اس تفصیل کی غرض یہ بات ثابت کرنا تھی کہ دوآبی ، ماجھی وغیرہ بولیوں کا خاص لفظ جو ہر کسی کی زبان پر چڑھا ہوا ہے ۔ مڑ اور سگوں ہے اور لہندی کے دھنی روپ کا مخصوص لفظ وت ہے ۔ اس فرق امتیاز کو سامنے رکھتے ہوئے اب آپ شاہ حسین کے کلام کی کچھ جھلکیاں دیکھیں تاکہ آپ کی تسلی ہو جائے کہ جو دعوے میں نے کیا ہے اس کی بنیاد کتنی پکی ہے ۔ وت کے استعمال کی مثالیں ملاحظہ ہوں :-

(و) ایہ دنیا توں مرجانا وت نہ آونا

ب ، وت نہ ہوسی اہل جوانی

ج ۔ ،، میرا وت کھیڈن کون آوسی

د ۔ ، وت نہ آونا ہو لمڑی راؤ

ﮦ ۔ ،، کہے حسین سنائے کے اتھے پھیر نہ آؤناں وت نہیں

و ۔ ،، وت نہ کھیڈن دیسن ماؤنہیں

ز ۔ ،، وت نہ دہب آؤناں

ح ۔ ،، وت نہ میلا ہوسیا بن ایہو وارے

ط ۔ ،، کہے حسین فقیر سائیں دا اتھے وت نہیں آونا پھیر فی شاہ حسین کے سارے کلام میں مٹڑیا سگوں کا لفظ یہیں برتا گیا یہ شہادت میرے دعوے کو پوری طرح ثابت کر رہی ہے کہ شاہ حسین دراصل ضلع جہلم کی تحصیل پنڈدادنخان کا باشندہ تھا اور پڑھنے کے لئے اپنے علاقے کے استاد کے پاس لاہور گیا مادھو کی محبت اسی طرح اس کے روم روم میں سما گئی کہ اسے اپنا آپ بالکل بھول گیا یہاں تک کہ اپنا نام بھی تبدیل کر کے مادھو لال حسین مشہور ہو گیا اور لاہور کی خاک میں سما کر امر ہو گیا۔

(پنجابی سے ترجمہ شدہ بشکریہ رسالہ پنج دریا لاہور بابت اپریل ۱۹۶۵ء)

کتابیات

۱۔ توزک تیموری

۲۔ توزک بابری

۳۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر جہلم از مسٹر ٹالبٹ،

۴۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا،

۵۔ تاریخ کشمیر جلد اول از منشی محمد الدین فوق،

۶۔ ککھڑ نامہ فارسی از رائے زادہ نیچند،

۷۔ تاریخ ککھڑاں از راجہ محمد یعقوب خان،

۸۔ پنجابی مسلمانز از کرنل ڈانگلی۔

۹۔ گلوسری آف ٹرائبز اینڈ کاسٹس

۱۰۔ ایکٹ انتقال اراضی مجریہ ۱۹۰۱ء

۱۱۔ تاریخ اقوام پونچھ و کشمیر از فوق

۱۲۔ تاریخ ضلع جہلم

۱۳۔ شاہان گوجر از مولوی محمد مالک

۱۴۔ تاریخ خاندان کپورتان سرڈال از ہر کور چداس۔

۱۵۔ تذکرہ رؤسائے پنجاب

۱۶۔ زاد الاعوان از مولوی نورالدین،

۱۷ باب الاعوان از مولوی نورالدین

۱۸۔ تاریخ فرشتہ،

۱۹- ارلی ٹرکش ایمپائر آف دہلی از ڈاکٹر محمد عزیز احمد

۲۰- ہسٹری آف لودھیز از اے حلیم۔

۲۱- تاریخ سلطنت خداداد میسور از محمود بنگلوری

۲۲- پنجاب انڈر دی مغلز از پروفیسر محمد اکبر

۲۳- تاریخ سندھ از ابوظفر ندوی

۲۴- ہسٹری آف افغانز ان انڈیا از ایم اے حلیم

۲۵- کتاب العلم

۲۶- گلدستہ تاریخ قوم گڈھوک قلمی از شیخ نورالدین

۲۷- تاریخ زبان اردو از ڈاکٹر مسعود حسین

۲۸- جامع اللغات اردو

۲۹- سندھ انگریزی، از مسٹر ہیمبرک

۳۰- پنجاب میں اردو از حافظ شیرانی

۳۱- رپورٹ بندوبست بابت موضع بھون از مسٹر ٹالبٹ

۳۲- وادی سندھ کی تہذیب از محمد ادریس صدیقی،

۳۳- سرزمین پوٹھوار از کرم حیدری،

۳۴- پنجابی ادب کی مختصر تاریخ از احمد حسین قریشی،

۳۵- ادبیات سرحد حصہ سوم از فارغ بخاری۔

۳۶- پنجابی زبان و ادب تے تاریخ از عبدالغفور قریشی

۳۷- دی پراونشل گورنمنٹ آف دی مغلز از ڈاکٹر پی سرن

۳۸- سفرنامہ ابن بطوطہ

۳۹- وادی سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات

۴۰- مرزا صاحباں از پیلو

از عین الحق فرید کوٹی

۴۱- شمس رانی ڈھول بادشاہ از غلام حسین کیلیانوالہ

۴۲- من دی موج از صدیقی ساجد علوی

۴۳- پوٹھواری گیت، از مرزا اقبال،

۴۴- پنجابی زبان کی ہیئت ترکیبی از محمد آصف خان

۴۵- ہفت روزہ بیل وبہار - لاہور

۴۶- ماہنامہ پنج دریا - لاہور

۴۷- پندراں روزہ فلم فیئر۔

۴۸- ہسٹری آف انڈیا از ایشوری پرشاد

۴۹- وحدت مغربی پاکستان، ایک جائزہ از فائق کامران

۵۰- روزنامہ تعمیر راولپنڈی

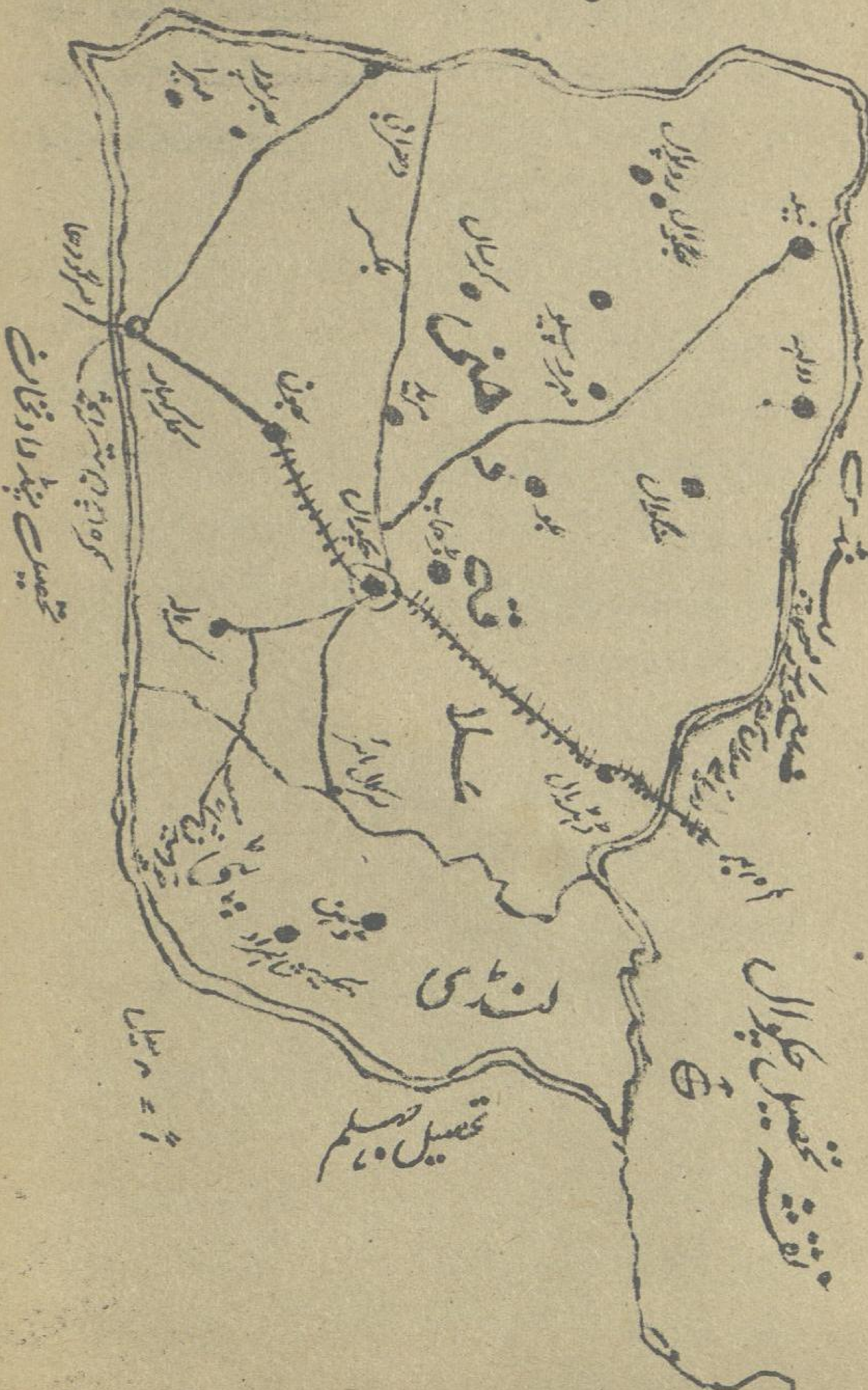
۵۱- روزنامہ جنگ راولپنڈی۔

۵۲- روزنامہ کوہستان راولپنڈی

۵۳- روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی

۵۴- روزنامہ امروز لاہور

ضلع کیمبل پور





نام مع ولدیت : انور بیگ اعوان ابن جمعدار رحمت خان مرحوم

تاریخ و مقام ولادت : ۶ جون ۱۹۲۰ء بمقام بھون تحصیل چکوال ضلع جہلم

تعلیم : ایم اے (فارسی) - ایم اے (اردو) - بی - ایڈ

تالیفات و تصنیفات : ۱- سبزۂ بیگانہ (دھنی کے ادیبوں اور شاعروں کی منتخب نگارشات)

۲- کلام شاہ مراد خانپوریؒ

۳- تمنائے اقبالؒ (اسلامی سوشلزم، علامہ اقبالؒ کے افکار کی روشنی میں)

۴- جان پہچان (مشاہیر علاقہ چکوال کے سوانحی خاکے)

۵- سدا سہاگ (دھنی کے پنجابی شعرا کا تنقیدی مطالعہ)

۶- دھنی کی اسلامی درسگاہیں

۷- اوراقِ پریشان (متفرق ادبی، سیاسی، اسلامی اور اخلاقی مضامین کا مجموعہ)